خوشبو کی تلاش

اے حمید



خوشبو کی تلاش

اے حمید

مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

محمد نورالحسن نُور کے نام

اہتمام ملک مقبول احمد
سرورق ایس یعقوب
ناشر مقبول اکیڈمی
مطبع خورشید مقبول پریس
قیمت 250 روپے

MAQBOOL ACADEMY
Chowk Urdu Bazar, Circular Road, Lahore.
Ph: 042-7324164, 7233165 Fax: 042-7238241

10-Dayal Singh Mansion, The Mall, Lahore.
Ph: 042-7357058 Fax: 042-7238241
Email: mqbool@brain.net.pk

یہ بات تو میں آپ کو اپنی آپ بیتی سناتے ہوئے پہلے بھی کہیں بتا چکا ہوں کہ برما پر جاپانی قبضے کے دوران ففتھ کالم نے بڑا کام کیا تھا۔ برما اس زمانے میں انگریزوں کی عمل داری میں تھا اور برمی لوگ انگریزی حکومت کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے واسطے مسلسل جدوجہد کر رہے تھے۔ چنانچہ جب جاپان نے اعلان جنگ کیا اور اس کی فوجیں ایک سیلاب کی طرح برما کے دارالحکومت کی طرف بڑھنے لگیں تو برمیوں کی اکثریت نے جاپانیوں کو خوش آمدید کہا۔ گویا انہیں انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ برما میں یہ بھی مشہور تھا کہ بمباری کے دوران برمی مدافعتی تحریک کے لوگوں نے ٹارچوں سے جاپانی طیاروں کی راہ نمائی کی اور انہیں اہم ٹھکانوں تک راہ دکھائی۔

چنانچہ جب جاپانیوں نے مجھے کمپیٹ والی کوٹھی میں بند کر دیا اور مجھ پر تشدد بھی کیا اور پھر بشیر صاحب کی برمی نوکرانی اوساں نے مجھے قیدی حالت میں دیکھ کر آنکھوں کے اشارے سے خاموش رہنے کے لئے کہا تو جہاں اندھیرے میں امید کی ایک کرن چمکی وہاں مجھے یہ خیال بھی پریشان کرنے لگا کہ کہیں یہ برمی عورت جاپانیوں کے ساتھ ملی نہ گئی ہو اور میرے لئے مزید مصیبت کا باعث نہ بن جائے۔ بہرحال میں ہر حالت میں جاپانیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ جاپانی فوج کے

رجمنٹل سینٹر سے فرار ہونا ناممکن تھا۔ گویا میں فوج کی پوری چھاؤنی میں گھرا ہوا تھا۔

ایک دن اسی کشمکش کی حالت میں گزر گیا۔ نہ اوساں نے پھر شکل دکھائی اور نہ کوئی جاپانی سپاہی یا افسر میری کوٹھڑی یعنی اس سٹور میں آیا جہاں مجھے باندھ کر ڈال دیا گیا تھا۔ جب شام ہوئی تو ایک جاپانی کیپٹن دو سپاہیوں کے ساتھ آیا۔ اس نے پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھ سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ اس دوران انہیں پتہ چل چکا تھا کہ میں رنگون ریڈیو سے اردو پنجابی میں ان کے خلاف تقریریں نشر کیا کرتا تھا۔ اس وقت مجھ سے صرف بشیر صاحب کا اتا پتہ پوچھا جا رہا تھا کہ وہ کمانیٹ سے نکل کر رنگون یا اس کے مضافات میں کہاں روپوش ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ جب میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو مجھ پر تشدد شروع ہو گیا۔ اس تشدد کی تفصیل بتانا مناسب نہیں ہے۔ جب جاپانی کیپٹن اور سپاہی چلے گئے تو میں ساری رات اور اگلا سارا دن درد سے کراہتا رہا۔ یہ تیسری رات کا ذکر ہے کہ میں سٹور روم میں بے بسی کے عالم میں پڑا تھا کہ مجھے تالا کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں یہی سمجھا کہ کوئی جاپانی افسر مجھے نئی اذیت دینے آیا ہے۔ تشدد برداشت کرتے کرتے میرا جسم نیم مردہ سا ہو چکا تھا۔ میں اسی حالت میں فرش پر پڑا رہا۔ سٹور روم میں اندھیرا تھا۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک انسانی سایہ اندر داخل ہوا۔ میں نیم وا آنکھوں سے تک رہا تھا۔ سایہ میرے قریب آ کر جھکا اور مجھے برمی نوکرانی اوساں کی آواز سنائی دی۔

جلدی اٹھو۔ یہی موقع ہے۔

اس آواز نے میرے تن مردہ میں جان سی ڈال دی۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اوساں مجھے لے کر کوٹھی کی راہ داری میں آ گئی۔ یہاں اندھیرا چھایا تھا۔ گیلری کی طرف باہر جلتی ہوئی بتی کی روشنی آ رہی تھی۔ اوساں تیز تیز چل رہی تھی۔ یہ ساری کوٹھی میری دیکھی بھالی تھی۔ راہ داری کے پیچھے ایک راستہ عقبی باغیچے میں کھلتا تھا۔ باغیچے کے پیچھے ایک کچی سڑک تھی جو آگے جا کر کمانیٹ سے رنگون جانے والی پکی سڑک کے ساتھ مل جاتی تھی۔ اس جگہ ایک طرف کچی سڑک کے

کنارے اندھیرے میں مجھے ایک بیل گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اس پر ناریل لدے ہوئے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر برمی گدی پر بیٹھا بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ جونہی ہم اس کے قریب آئے اس نے برمی زبان میں اوساں کو گھبرائی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ ظاہر ہے یہی کہا ہوگا کہ دیر نہ کرو۔ جاپانیوں نے دیکھ لیا تو شوٹ کر دیں گے۔ مجھے گاڑی میں ناریلوں کے نیچے چھپا دیا گیا۔ اوساں نے سرگوشی کی۔ بس بولنا مت۔ یہیں چھپے رہنا اور بیل گاڑی چل پڑی۔ کچی سڑک سے نکل کر وہ پکی سڑک پر آ گئی اور اس کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ میرے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ ناریلوں کو رسیوں سے اچھی طرح سے جکڑ دیا گیا تھا۔ میں ان کے بالکل نیچے چھپا تھا۔ مجھ پر ان کا بوجھ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ مجھ سے برداشت نہ ہوتا۔ ایک سوراخ میں سے مجھے سڑک کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ سڑک پر اندھیرا تھا۔ جہاں بجلی کا کھمبا آتا تو سڑک تھوڑی دیر کے لئے روشن ہو جاتی اور اس کے بعد پھر اندھیرا چھا جاتا۔

فوجی ٹرک اور جیپیں بڑی تیزی سے سڑک پر سے گزر رہی تھیں۔ بیل گاڑی سڑک سے اتر کر کچے میں چلنے لگی۔ کچھ دور چلنے کے بعد پھر پکی سڑک پر آ گئی۔ ایک جانب سے مشین گن کی فائرنگ کی آواز فضا میں گونج گئی۔ میں ناریلوں کے ڈھیر میں چھپا بیٹھا تھا۔

آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ بیل گاڑی کی رفتار دھیمی ہو گئی۔ یہ فوجی چیک پوسٹ تھی۔ جاپانی فوجی اونچی آواز میں برمی گاڑی بان سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ وہ برمی زبان میں خدا جانے کیا جواب دے رہا تھا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا تھا۔ کسی نے ناریلوں میں زور سے دو چار بید مارے۔ کچھ ناریل سڑک پر گر پڑے۔ جاپانی سپاہیوں نے اونچی آواز میں کچھ کہا اور بیل گاڑی سڑک پر چل پڑی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بلا ٹل گئی تھی۔ لیکن ابھی نہ جانے کتنی بلائیں تھیں جن کا مجھے سامنا کرنا تھا۔ میرے فرار کی خبر خدا کا شکر تھا کہ ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ کوئی نہ کوئی فوجی جیپ برق رفتاری سے آ کر مجھے بیل گاڑی سمیت پکڑ سکتی تھی۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اوساں نے کسی کو اپنے اعتماد میں لے کر میرے فرار کا بندوبست کیا تھا۔ میں آج بھی

اس برمی نوکرانی کا احسان نہیں بھول سکا۔ خدا جانے وہ زندہ بھی ہوگی یا نہیں!

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ برمی گاڑی بان مجھے کہاں لیے جا رہا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق رنگون شہر ابھی کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ بیل گاڑی ایک طرف کو مڑ گئی۔ راستہ غیر ہموار تھا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ گاڑی کھیتوں کے درمیان کسی پگ ڈنڈی پر سے گزر رہی ہے۔ اب بجلی کے کھمبوں کی روشنی بھی نظر آنا بند ہو گئی تھی۔ کافی دیر تک بیل گاڑی کھیتوں میں چلتی رہی۔ کبھی کبھی ہلکی سی چڑھائی آجاتی۔ رات کی مرطوب فضا میں دھان کی ہلکی ہلکی مہک محسوس ہو رہی تھی۔

بیل گاڑی دو تین جگہوں سے مڑنے کے بعد ایک جگہ ٹھہر گئی۔ برمی گاڑی بان نے جلدی سے ناریلوں کی رسی کھولی۔ ناریل ایک طرف زمین پر گر پڑے۔ میں گاڑی سے اتر پڑا۔ میں نے کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ مجھے آسمان پر ٹمٹماتے تاروں اور اردگرد اندھیرے میں درختوں کے سایوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ گاڑی بان نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ آگے ایک چھوٹا سا تالاب تھا جو ستاروں کی دھیمی روشنی میں دھندلے سبز شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ تالاب کے دوسرے کنارے پر ایک چھوٹا سا شکستہ کوارٹر تھا۔ اسکی کھپریل کی چھت ایک طرف سے نیچے جھکی ہوئی تھی۔ اسکا ایک ہی کمرہ تھا جس میں بانس کی چارپائی بچھی تھی۔ گاڑی بان نے جیب سے موم بتی نکال کر جلائی۔ اسے فرش پر لگایا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھے کہنے لگا کہ مجھے دو تین دن تک اسی جگہ چھپے رہنا ہوگا۔ ادھر جاپانیوں کے آنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ میں نے پوچھا۔ کیا ایسا کوئی راستہ نہیں ہے کہ میں یہاں سے بنگال کی طرف نکل جاؤں۔ برمی گاڑی بان کا چہرہ مزید سنجیدہ ہو گیا۔ بولا۔ "یہاں سے ایسا کوئی راستہ نہیں جاتا۔ میں صبح آؤں گا۔ باہر سے تالا لگا رہا ہوں"۔ اس نے پھونک مار کر موم بتی بجھائی اور باہر چلا گیا۔ باہر سے اس نے دروازے پر تالا لگا دیا۔ باقی کی ساری رات میری اور برما کے خونخوار مچھروں کی جنگ ہوتی رہی۔ دوسرے دن صبح بوڑھا برمی میرے لئے تھوڑے سے ابلے ہوئے موٹے چاول اور مچھلی

کا اچار لے کر آیا۔ کہنے لگا شام کو اوساں آ رہی ہے۔ شاید وہ تمہیں اپنے ساتھ کسی دوسری جگہ لے جائے۔ کیونکہ تمہارے فرار کا علم ہوتے ہی جاپانی سپاہی تمہاری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہے ہیں۔ میں تو پریشان ہو گیا۔ اس سے پوچھا جاپانی سپاہی تو یہاں بھی آجائیں گے۔ یہ سن کر برمی بوڑھا اٹھا اور لکڑی کے فرش کا ایک جگہ سے تختہ کھسکایا اور بولا۔ اگر ایسی بات ہوئی تو نیچے تہہ خانے میں اتر جانا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ وہ دروازے کو تالا لگا کر چل دیا۔ ابھی اسے گئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ مجھے جیپ کی آواز سنائی دی۔ کمرے کی کھڑکی بھی باہر سے بند تھی۔ جیپ کی آواز اس کوارٹر والے تالاب ہی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں پریشان ہو گیا۔ بے اختیار اٹھ کر دروازے کی درز سے باہر دیکھنے لگا۔ جیپ نظر نہ آئی مگر اسکی آواز برابر قریب آ رہی تھی۔

☆......☆......☆

میں جھونپڑی کے تہہ خانے میں چھپا فوجی جیپ کی آواز سن رہا تھا۔ آواز قریب آ کر رک گئی۔ اس میں سے جاپانی فوجیوں کے اترنے اور ان کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں سمجھ گیا کہ کسی برمی دیہاتی نے مخبری کر دی ہے۔ بھاری فوجی بوٹوں کی دھمک جھونپڑی کے فرش پر گونجی۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ جاپانی فوجی سیدھے جھونپڑی میں آ گئے تھے۔ وہ کرخت لہجے میں ایک دوسرے کو کچھ کہہ رہے تھے۔ میں سانس روکے بیٹھا تھا۔

یہ بات ثابت ہو گئی کہ مخبری ہوئی ہے۔ کیونکہ جاپانیوں نے فرش پر سے تہہ خانے والا تختہ ایک طرف ہٹا دیا اور نیچے مشین گن کا ایک برسٹ مارا۔ میں دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ جاپانی تہہ خانے میں آ گئے۔ انہوں نے اسی وقت مجھے گرفتار کر لیا۔ ان کے ساتھ وہی جاپانی کیپٹن تھا جو اردو انگریزی بڑی اچھی بول لیتا تھا۔ میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھ کر اس نے مجھے گردن سے دبوچا اور گھسیٹتا ہوا اوپر لے آیا۔ باہر دو فوجی جیپیں کھڑی تھیں۔ مجھے وہ برمی گاڑی بان کہیں نظر نہ آیا جو مجھے یہاں چھپا گیا تھا۔ شاید وہ جاپانیوں کو آتا دیکھ کر جان بچا کر فرار ہو گیا تھا۔ یا شاید جاپانیوں نے اسے پہلے ہی شوٹ کر دیا تھا۔ بہرحال میرے ہاتھ جکڑ کر جیپ میں ڈال دیا گیا اور جیپ واپس کمامیٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔

جاپانی مجھے بھی بڑی آسانی سے شوٹ کر دیتے۔ مگر انہوں نے ایسا اس لئے نہیں کیا تھا کہ ان کا خیال تھا کہ مجھے کچھ ایسے لوگوں کا علم ہے جن کی جاپانیوں کو تلاش تھی۔ جبکہ میں کسی کے بارے میں بھی نہیں جانتا تھا کہ رنگون پر جاپانی قبضے کے بعد وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا نہیں ـــــ اسی دفعہ جاپانیوں نے کمامیٹ والی کوٹھی کی بجائے مجھے قریبی جنگل کی ایک فوجی بیرک میں بند کر دیا۔ مجھ سے ایک بار پھر بشیر آف کمامیٹ اور رنگون کے اردو اخباروں کے ایڈیٹر کے متعلق پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔

مجھ پر صرف اتنا تشدد کیا جاتا کہ میں بے ہوش نہ ہو جاؤں۔ مجھے رات رات بھر جگایا جاتا۔ جسم پر جلتا ہوا سگریٹ لگایا جاتا۔ جاپانی مجھ سے اپنی مطلوبہ معلومات اس لئے حاصل نہ کر سکے کہ واقعی مجھے کسی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ تشدد اور شب بیداریوں کی وجہ سے میں بے حد لاغر ہو گیا۔ جاپانیوں نے پوچھ گچھ سے ہاتھ اٹھا لیا وہ مجھے موقع دینا چاہتے تھے کہ میں اپنی کھوئی ہوئی صحت دوبارہ حاصل کروں اور مجھ پر تشدد کا سلسلہ ایک بار پھر شروع کر دیا جائے۔ ایک ہفتہ مجھے جنگل والی جھونپڑی نما فوجی بیرک میں گزر گیا۔ مجھے دن میں دو بار مچھلی کے ساتھ ابلے ہوئے چاول دیئے جاتے تاکہ میں جلدی جلدی صحت مند ہو کر دوبارہ تشدد برداشت کرنے کے قابل ہو جاؤں۔

جس چھوٹی سی بیرک میں مجھے بند کیا گیا تھا اسکی دیواریں بانس کی اور فرش لکڑی کا تھا۔ باہر ایک جاپانی سپاہی چل پھر کر پہرہ دیتا۔ چار گھنٹے کے بعد دوسرا جاپانی آ جاتا۔ لکڑی کا دروازہ ہر وقت بند رہتا۔ اس میں کوئی روشندان بھی نہیں تھا۔ دیوار کے بانسوں میں سے تازہ ہوا اندر آتی تھی۔ ان کی درزوں میں سے مجھے تھوڑا سا باہر کا منظر نظر آ جاتا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں کھول دیئے گئے تھے۔ بیرک کے اردگرد ناریل، املی اور دیار کے بہت درخت تھے۔ ان کے درمیان جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ سامنے جاپانی فوج کی بیرک تھی۔ یوں ہر وقت چھ سات فوجی گاڑیاں کھڑی رہتیں۔ فوجی کچن میں سے دھواں اٹھتا رہتا۔ جاپانی تیز آوازوں میں ایک دوسرے کو

پکارتے ادھر سے اُدھر گزرتے رہتے۔ بیرک کی دونوں جانب مشین گن کی پوسٹیں تھیں۔ درمیان میں جاپان کا جھنڈا لہراتا رہتا۔ میرا خیال تھا کہ شاید بری عورت اوساں مجھے کام کرتی کہیں دکھائی دے جائے۔ وہ یہاں بھی میری مدد کرسکتی تھی۔ مگر وہ دکھائی نہ دی۔ میں نے اپنے طور پر یہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کرلیا اور سب سے پہلے بانس کی دیواروں کا جائزہ لیا۔ بانس پکے تھے اور بڑے ساتھ ساتھ جوڑ کر ان کی دیواریں بنائی گئی تھیں۔ کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں بانس ذرا ڈھیلے ہوتے۔

ایک رات اچانک کسی کی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ بیرک میں اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں دو آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ ایک بلی تھی جو میرے اٹھنے سے بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر سپیدہ صبح نمودار ہوا تو اس کی ہلکی ہلکی روشنی بانس کی درزوں میں سے اندر آنے لگی۔ بلی اندر نہیں تھی۔ ایک خیال یک لخت جیسے بجلی کی طرح میرے ذہن میں چمک اٹھا۔ جہاں سے بلی گزر کر آئی تھی ضرور وہاں کوئی شگاف ہوگا۔ میں تیزی سے اٹھا اور دیواروں کا ازسرنو جائزہ لیا۔ مجھے ایک جگہ دیوار میں نیچے کی جانب تین بانس اپنی جگہ سے ہلے ہوئے نظر آئے۔ وہاں نیچے فرش کا تھوڑا سا حصہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ نیچے زمین کی گھاس دکھائی دے رہی تھی۔ اندھیرے میں امید کی کرن چمکی۔ اگر کوشش کروں تو یہاں سے فرار ممکن تھا۔ دن کے وقت اپنے دماغ میں منصوبہ بندی کرتا رہا۔ جب رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تو میں نے اپنا کام شروع کردیا۔ تین راتوں کی انتھک کوشش کے بعد میں بانس کی دیوار کے نیچے والے لکڑی کے ایک تختے کو اکھاڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ چوتھی رات میں اندھیرے میں دبے پاؤں اٹھ کر دیوار کے پاس گیا۔ تختے کو بڑی احتیاط سے اوپر اٹھا دیا۔ یہ بیرک اس طرح بنائی گئی تھی کہ زمین سے کوئی چار فٹ اوپر تھی اور نیچے جگہ خالی تھی۔ میں شگاف میں سے نیچے گھاس میں اتر کر وہیں بیٹھ گیا۔ مجھے دو جاپانی فوجیوں کی آپس میں فس فس کر باتیں کرنے کی آواز آئی۔ یہ آواز اس طرف سے آرہی تھی جدھر مشین گن پوسٹیں تھیں۔

میں گھاس میں رینگنے لگا۔ میرا رخ جنگل کے درختوں کی طرف تھا۔ گھاس اتنی اونچی تھی کہ اس نے مجھے چھپا لیا تھا۔ میں بیرک کے نیچے سے نکل کر کھلے آسمان تلے آگیا۔ سامنے اندھیرے میں درختوں کے جھنڈ تھے۔ جھاڑی میں سے ایک بلی نکل کر تیزی سے میرے قریب سے ہوکر بھاگ گئی۔ میں نے اس بلی کا شکریہ ادا کیا۔ کیونکہ اس نے مجھے فرار کی راہ دکھائی تھی۔ ________ مگر ابھی میں خطرے کے باہر نہیں تھا۔ کسی بھی وقت مجھ پر مشین گن کا فائر آسکتا تھا۔ میں بہت آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ یوں میں درختوں کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں بھی خطرہ میرے سر پر منڈلا رہا تھا۔ کوئی بھی جاپانی سپاہی مل سکتا تھا۔ میں رک رک کر رینگ رہا تھا۔ جب میں نے کافی فاصلہ طے کرلیا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اندھیرے میں چاروں طرف دیکھا۔ سامنے زمین اونچی تھی اور جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ میں جھک کر چلتا جھاڑیوں تک گیا تو دوسری طرف اندھیرے میں ایک کھائی دکھائی دی۔ کھائی میں پانی کی لکیر چمک رہی تھی۔ ڈھلان زیادہ نہیں تھی۔ میں کھائی میں اتر گیا۔ چھلانگ لگا کر پانی کی نالی کو پار کیا اور کھائی کے دوسرے کنارے پر آکر جھاڑی میں چھپ گیا۔ میں پتہ کرنا چاہتا تھا کہ دوسری طرف کوئی فوجی کیمپ تو نہیں ہے۔ مگر اوپر گھاس کا میدان تھا جس میں کہیں کہیں ناریلوں کے جھنڈ رات کی تاریکی اور خاموشی میں چپ چاپ کھڑے جیسے میری طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں جھاڑی میں سے اٹھا اور اندھا دھند بھاگنا شروع کردیا۔ کئی جگہ میں گرا بھی لیکن میں رکا نہیں۔ جب بھاگنے کی سکت نہ رہی تو بیٹھ کر سانس درست کی اور پھر بھاگنے لگا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ اس سارے علاقے میں جاپانی فوج پھیلی ہوئی تھی۔ میں کسی بھی وقت پکڑا جاسکتا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ رات کا اندھیرا میری مدد کررہا تھا۔ بھاگ بھاگ کر میں تھک گیا تھا۔ اب میں چلنے لگا۔ دور درختوں کی قطار کے پاس روشنی جھلملا رہی تھی۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ اس روشنی کی طرف بڑھا۔ میں درختوں کے پیچھے سے ہوکر وہاں پہنچا تو دیکھا کہ کچی سڑک کے کنارے ٹرک کھڑا ہے جس میں لکڑی کی بڑی بڑی گیلیاں اور شہتیر لدے ہوئے ہیں۔ قریب ہی ایک جھونپڑی کے باہر لالٹین روشن ہے اور دو آدمی بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ یہ دونوں برمی تھے اور برمی زبان

میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ کوئی چائے کی دکان تھی۔ ٹرک کا رخ رنگون شہر کی طرف تھا۔ مجھے رنگون شہر میں ہی کسی جگہ پناہ مل سکتی تھی۔ یہ سوچ کر میں ٹرک کے پیچھے آ گیا۔ برمی ڈرائیور اور کلینر چائے پینے اور باتیں کرنے میں لگے تھے۔ میں ٹرک پر چڑھ گیا اور اپنے آپ کو لکڑی کے شہتیروں میں اس طرح سے چھپا دیا کہ باہر سے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد برمی ڈرائیور اور کلینر اگلی سیٹوں پر بیٹھے اور ٹرک شہر کی طرف چل پڑا۔

شہر میں ایک اور مصیبت میرا انتظار کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

میں ٹرک میں لکڑی کے شہتیروں میں چھپا بیٹھا تھا اور ٹرک رنگون شہر کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں یہ رات کا وقت تھا۔ میں بڑا خوش تھا کہ مجھے جاپانیوں کی قید سے نجات مل گئی اور میں ایک بار پھر آزادی کی فضا میں سانس لے رہا ہوں۔ میں اس انتظار میں تھا کہ ٹرک شہر میں داخل ہو کر کسی جگہ رکے اور میں ٹرک سے نکل کر رنگون شہر کے گلی کوچوں میں کسی جگہ چھپ کر رات گذاروں اور دن نکلنے پر رنگون میں مقیم مسٹر لیوس کے گھر جا کر پناہ لوں۔

مسٹر لیوس کیپٹن ممتاز ملک کے دوست تھے اور سولی پیگوڑا کے عقب میں واقع ایک بلڈنگ کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ ادھیڑ عمر آدمی تھے۔ ان کی بیوی سکاٹ مارکیٹ میں ایک کافی ہاؤس چلاتی تھی۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ میں کیپٹن ملک کے ساتھ کئی بار ان کے فلیٹ پر جا چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ چونکہ برما کے نیشنل ہیں اس لئے رنگون چھوڑ کر نہیں گئے ہوں گے۔

ٹرک کی رفتار ہلکی ہو رہی تھی۔ میں ٹرک کے باہر تو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر شہر کی روشنیاں میرے اوپر سے گذر رہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ ٹرک رنگون میں داخل ہو چکا ہے۔ ٹرک نے دو ایک موڑ کاٹے۔ پھر جیسے کسی احاطے میں داخل ہونے کے بعد گھوم کر ایک جگہ رک گیا۔ برمی ڈرائیور اور

کلینر ٹرک سے نکل کر باتیں کرتے ایک طرف چلے گئے تھے۔ خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ ٹرک ضرور شہر کی ٹمبر مرچنٹ کے احاطے میں آ کر رکا ہے اس لئے اب مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں نے اپنے آپ کو شہتیروں کے نیچے سے نکالا اور سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں چھوٹے چھوٹے بارک نما کوارٹروں کے درمیان آ گیا ہوں۔ میں ٹرک سے چھلانگ لگانے ہی والا تھا کہ اچانک میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے بجلی کے کھمبے کے قریب سے دو جاپانی سپاہی رائفلیں کندھوں سے لٹکائے باتیں کرتے ٹرک کی طرف آ رہے تھے۔ میں تیزی سے شہتیروں میں نیچے ہو کر بیٹھ گیا۔

مجھے پسینہ آ گیا۔ یہ کوئی ٹمبر مارکیٹ نہیں تھی بلکہ جاپانی فوجی کیمپ تھا۔ جہاں یہ ٹرک لکڑی کی گیلیاں لے کر آیا تھا۔ گویا میں ایک قید خانے سے نکل کر دوسرے قید خانے میں آ گیا تھا۔ قدرت نے میرے ساتھ ایک بھیانک مذاق کیا تھا۔ جاپانی سپاہی ٹرک کے ساتھ ٹیک لگا کر باتیں کرنے لگے۔ وہ سگریٹ بھی پی رہے تھے۔ مجھ تک سگریٹ کے دھوئیں کی بو برابر آ رہی تھی۔ میں وہیں دبکا بیٹھا رہا۔ سانس بھی آہستہ لے رہا تھا کہ کہیں جاپانی سپاہیوں کو میری خبر نہ ہو جائے۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی وہاں سے چل دیئے۔ ایک ٹرک کے سٹارٹ ہونے اور ملٹری کیمپ کے باہر نکلنے کی آواز آئی۔ میں عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ مجھے یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ صبح ہوگئی تو ممکن ہے ٹرک پر سے گیلیاں اتاری جانے لگیں۔ میرے فرار کا علم بھی جاپانیوں کو ہو چکا ہوگا۔ اس بار پکڑا گیا تو یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مجھے ہر حالت میں صبح ہونے سے پہلے پہلے وہاں سے کسی طرح بھاگ نکلنا تھا۔

جب ذرا خاموشی ہوئی تو میں نے ایک بار پھر سر نکال کر دیکھا۔ یہ واقعی جاپانیوں کا کوئی ملٹری کیمپ تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک بارک میں روشنی ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں کچھ فوجی جیپیں وغیرہ بھی کھڑی نظر آئیں۔ جس ٹرک میں میں چھپا بیٹھا تھا وہ ملٹری کیمپ کی خاردار تاروں والی دیوار کے قریب آ کر رکا تھا۔ یہ دیوار کافی اونچی تھی۔ اس میں سے گذرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

رات گذرتی جا رہی تھی۔ دن کی روشنی میرے لئے موت کا پیغام لے کر آ سکتی تھی۔ وقت تھوڑا رہ گیا تھا۔ کیمپ کے گیٹ پر پہرہ لگا تھا۔ اس طرف کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ خدا کو میری حالت پر رحم آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ٹرک کیمپ کے گیٹ میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ رینگتا میرے والے ٹرک کی طرف آنے لگا۔ میں نے گردن شہتیروں میں کر لی۔ ٹرک آگے نکل گیا۔ میں نے گردن نکال کر دیکھا۔ یہ ٹرک دس بارہ قدموں پر جا کر ایک جگہ رک گیا تھا۔ اب جو میں نے اندھیرے میں غور سے دیکھا تو یہ کوڑے کرکٹ کا ٹرک تھا۔ ٹرک خالی تھا۔ وہاں ڈسٹ بن تھا جس میں سے ایک آدمی کوڑے کرکٹ کے بڑے بڑے لفافے اٹھا کر ٹرک میں رکھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ ترکیب خطرناک تھی مگر خطرہ مول لئے بغیر میں وہاں سے نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ ٹرک کوڑا کرکٹ لے کر کیمپ سے واپس چلا جائے گا۔ میں اسی انتظار میں تھا کہ کوڑا کرکٹ رکھنے والا ذرا ادھر ادھر ہو تو میں اپنے منصوبے پر عمل کروں۔ چند منٹ اسی طرح گذر گئے۔ یہ ڈرائیور بھی بری تھا۔ جب اس نے کوڑے کرکٹ کے سارے بڑے بڑے لفافے ڈسٹ بن میں سے نکال کر ٹرک پر لاد لئے تو وہ اگلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جونہی اس نے ٹرک کا انجن سٹارٹ کیا میں اپنی جگہ سے نکلا۔ بلی کی طرح اندھیرے میں اپنے ٹرک کے اوپر سے چھلانگ لگائی۔ جھکے جھکے دوسرے ٹرک پر چڑھا اور کوڑے کرکٹ کے بڑے بڑے تھیلوں کے پیچھے اپنے آپ کو چھپا کر بیٹھ گیا۔

میرا دل ابھی تک بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ٹرک گھوما اور آہستہ آہستہ چلتا ملٹری کیمپ کے گیٹ پر آ کر رک گیا۔ میرا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا۔ کیونکہ گیٹ پر موجود سپاہی ٹرک کی تلاشی لینے والا تھا۔ مگر خدا نے یہاں بھی میری مدد کی۔ سپاہی نے سرسری طور پر ٹرک کو دائیں بائیں سے دیکھا اور ٹرک گیٹ سے باہر نکل گیا۔ ملٹری کیمپ کے باہر آتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنستے پھنستے بچ گیا تھا۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ میری زندگی تھی اور خدا نے مجھے بچا لیا۔

ٹرک رنگون کی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ میں کوڑے کے لفافوں میں سے نکل کر ٹرک کے پیچھے آ گیا تھا۔ میں ان سڑکوں سے واقف تھا۔ ٹرک شہر کے باہر کوڑا کرکٹ پھینکنے جا رہا تھا۔ جونہی ٹرک کی رفتار ایک موڑ کاٹتے ہوئے ہلکی ہوئی میں نے چھلانگ لگا دی۔ میں سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں گرا۔ جب تک ٹرک میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا میں وہیں چھپا رہا۔

پھر اٹھا اور میں نے مسٹر لیوس کے فلیٹ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ نیک دل عیسائی میاں بیوی ضرور فلیٹ پر ہی ہوں گے۔ اور مجھے نہ صرف اپنے ہاں چھپا لیں گے بلکہ برما سے میرے نکلنے کی کوئی تدبیر بھی کریں گے۔

☆……☆……☆

منہ اندھیرے کا ہی وقت تھا۔ ابھی صبح کی روشنی پوری طرح سے نہیں پھیلی تھی۔ رنگون کی سڑکیں اور گلی کوچے خالی خالی تھے۔ میرے لئے یہ سڑکیں اور گلیاں اجنبی نہیں تھیں۔ میرے قدم رنگون کے پیشتنی اور کیپٹن ملک کے دوست مسٹر لیوس اور مسز لیوس کے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں جاپانیوں کے جنگی کیمپ سے بھاگا ہوا قیدی تھا۔ اگر میں پکڑا جاتا تو میرے ساتھ مجھے پناہ دینے والا بھی شوٹ کر دیا جاتا۔ اور رنگون میں جاپانیوں کے بہت جاسوس کام کر رہے تھے۔ انڈین لوگ تقریباً تمام کے تمام رنگون چھوڑ کے پیدل قافلوں کی شکل میں بنگال کی طرف کوچ کر گئے تھے۔ کیونکہ جاپانیوں کے رنگون پر قبضہ کرنے کے ساتھ ہی برمیوں نے انڈین لوگوں کے مکانوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ مسٹر لیوس اینگلو انڈین تھا۔ اس لئے انہیں کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔

میرے دل میں بار بار خیال آ رہا تھا کہ یہ لوگ مجھے اپنے ہاں پناہ دے دیں گے؟ جاپانیوں کی قید سے بھاگے ہوئے شخص کو اپنے ہاں پناہ دینا ایک طرح سے موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ زمانہ ایسا تھا کہ جاپانی بے دریغ مشکوک لوگوں کو گولیوں سے اڑا رہے تھے۔

مسٹر لیوس کے فلیٹ کے دروازے پر کھڑے ہو کر میں یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر خیال

آتا کہ یہ ایک نیک دل عیسائی شخص ہے۔ اکثر محفلوں میں میں نے اسے انسانوں سے محبت کرنے کی باتیں کرتے سنا تھا۔ اسی خیال سے مجھے حوصلہ ہو رہا تھا۔ میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر خاموشی چھائی رہی۔ تیسری بار دستک دینے پر اندر سے آواز آئی۔ "کون ہے؟" یہ مسٹر لیوس کی آواز تھی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری آواز ساتھ والے فلیٹوں میں کسی کے کانوں تک پہنچے۔ مسٹر لیوس نے دروازہ کھولا۔ آنکھیں ملتے ہوئے مجھے دیکھا۔ حیرت سے ان کا تھوڑا سا منہ کھلا اور پھر چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ارے تم؟ مسٹر ملک اور مسز ملک کہاں ہیں؟ میں نے ان کا بہت سے لوگوں سے پوچھا۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔ آؤ آؤ۔ اندر آ جاؤ"

ابھی انہیں یہ علم نہیں ہوا تھا کہ میں جاپانی جنگی کیمپ سے فرار ہو کر آ رہا ہوں۔ وہ مجھے کمرے میں لے آئے۔ مسز لیوس بھی وہاں آ گئیں۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور مسٹر ملک اور مسز ملک کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ لوگ شاہ جی وغیرہ کے ساتھ بنگال کی طرف چلے گئے تھے۔

"اور تم ___ تم کہاں تھے؟ اب صبح صبح کہاں سے آ رہے ہو؟"

پہلے تو مجھے خیال آیا کہ میں اصل حقیقت بیان نہ کروں پھر سوچا کہ نہیں یہ بڑے شریف اور نیک نیت لوگ ہیں۔ ان کو ساری بات صاف صاف بتا دینی چاہیے۔ چنانچہ میں نے شروع سے لے کر آخر تک اپنی ساری کہانی بیان کر ڈالی۔

بیگم لیوس نے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ مسٹر لیوس کسی گہری سوچ میں پڑ چکے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں مجھے پناہ نہیں ملے گی اور مجھے کسی دوسری جگہ کوئی ٹھکانہ تلاش کرنا پڑے گا۔ مسٹر لیوس نے پہلا کام یہ کیا کہ اٹھ کر وہ کھڑکی بند کر دی جو بازار کی طرف کھلی تھی۔ مجھے اپنے قریب صوفے پر بٹھایا۔ بیگم سے چائے لانے کو کہا۔ مجھے ابھی تک کچھ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ انہوں نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ میری عمر چھوٹی تھی۔ چہرہ شناسی کے فن سے ابھی ناواقف تھا۔

جب تک چائے نہ آئی مسٹر لیوس رنگون کی بربادی، جاپانیوں کے قبضے اور پرانے دوستوں سے بچھڑ جانے کی باتیں کرتے رہے۔ میں بے چین تھا ان کی بیگم چائے لے آ گئیں۔ مسٹر لیوس نے چائے بنائی اور پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مسٹر حامید ڈونٹ وری ___ ہم سے جو ہو سکا تمہارے لئے کریں گے۔"

میرے دل پر سے ایک بوجھ اٹھ گیا۔ میں نے جلدی سے کہا،

"ہمائے مہربانی مجھے کسی طرح رنگون سے بنگال کی طرف جاتے کسی پیدل قافلے کے ساتھ ملا دیں۔ میں اور کچھ نہیں چاہتا۔"

بیگم لیوس نے پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے کہا،

مگر مائی بوائے اب تو دیر ہو چکی ہے۔

مسٹر لیوس بیگم کا جملہ مکمل کرتے ہوئے بولے۔

"جتنے قافلے یہاں سے بنگال کی طرف جا سکتے تھے چلے گئے ہیں۔ اب تو چاروں طرف جاپانیوں کا قبضہ ہے۔ وہ کسی آدمی کو بھی رنگون سے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ اور تم دوبارہ ان کی قید سے بھاگے ہو۔ وہ تو تمہاری تلاش میں شہر میں جگہ جگہ چھاپے ماریں گے۔"

میں مایوس ہو گیا۔ میں نے کہا،

"میری وجہ سے اگر آپ پریشان ہوں تو میں چلا جاتا ہوں۔"

مسٹر لیوس نے پوچھا۔

"تم کہاں جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "جہاں اللہ لے جائے گا چلا جاؤں گا"

"مائی بوائے۔ اس بار جاپانیوں نے تمہیں پکڑ لیا تو وہ زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ میں نہیں جانتا" میں نے کہا،

"میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ پر کوئی مصیبت نازل ہو جائے۔"

مسٹر لیوس نے چائے کا ہلکا سا گھونٹ بھر کر پیالی میز پر رکھ دی میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اکثر برمی انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر جاپانیوں سے مل گئے تھے۔ اس محلے میں بھی ایسے برمی ضرور ہوں گے جنھوں نے مجھے آپ کے ہاں دیکھ لیا تو وہ مخبری کر دیں گے۔ اس طرح میرے ساتھ آپ کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہیں۔"

مسٹر لیوس ذرا سا مسکرائے۔ جیب سے ڈبی نکال کر سگریٹ سلگایا اور کہا۔

"میں تمہیں اپنے فلیٹ میں نہیں رکھوں گا۔"

میں ان کے منہ کو تکنے لگا۔ مسٹر لیوس میری طرف ذرا سا جھکے۔ وہ کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ مسٹر لیوس نے مجھے ساتھ والے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ دروازے پر کوئی بار بار دستک دے رہا تھا۔ بیگم لیوس نے میز پر رکھی ہوئی میری پیالی نہیں اٹھائی تھی۔ مسٹر لیوس نے دروازہ کھولا۔ میں دوسرے کمرے میں الماری کے پیچھے چھپا تھا۔ میرے کان باہر کی آواز سننے کو بے تاب تھے۔

☆......☆......☆

میں نے دروازے سے کان لگائے ہوئے تھے۔

صبح ہو رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دودھ یا اخبار والا ہوگا جس نے دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ میں نے دروازے کی درز میں سے دیکھ لیا تھا کہ مسز لیوس نے میز پر سے میری پیالی نہیں اٹھائی تھی۔ یعنی اس وقت میز پر چائے کی تین پیالیاں پڑی تھیں جبکہ کمرے میں چائے پینے والے صرف دو تھے۔ یہ سراغ رسانی کا ایک نقطہ تھا جس کی وجہ سے میں پریشان ہو رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور ایک چھوٹے قد کا برمی سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مسٹر لیوس نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے تھا یونگ۔ صبح صبح کیسے آئے؟"

تھا یونگ کمرے میں آ گیا۔ اس کی نظریں میز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کہنے لگا۔

"صاحب ! کوئی مہمان آیا ہے صبح سویرے؟"

تب لیوس کو بھی احساس ہوا کہ اسے کم از کم تیسری پیالی میز پر سے اٹھا لینی چاہیے تھی۔ پیالی میں ابھی تک چائے پڑی تھی۔ لیوس نے بات کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں تھا یونگ ! میں صبح کے وقت دو پیالیاں پیتا ہوں نا"

برمی نے مشکوک انداز میں کہا۔

"مگر صاحب! آپ ایک پیالی میں بھی دو کپ چائے پی سکتے ہیں۔"

اس پر مسز لیوس نے ترش لہجے میں پوچھا۔

"تم کس لئے آئے ہو؟ اخبار کا بل تو ہم نے ادا کر دیا ہوا ہے۔"

بری تھایونگ مسکرایا۔ "میڈم بات یہ ہے کہ ایجنٹ نے کہلوا بھیجا ہے کہ اب بل کی پے منٹ پہلی کے پہلی ہوا کرے گی۔"

ٹھیک ہے ہم پہلی کو پے منٹ کر دیا کریں گے۔

مسز لیوس نے بے رخی سے کہا کہ۔ تھایونگ سلام کر کے کمرے سے نکل گیا۔ دروازہ بند کر کے لیوس میرے کمرے میں آ گئے۔ میں نے پوچھا یہ مشکوک آدمی کون تھا، مجھے اس پر شک ہے یہ مجھے جاپانیوں کا ایجنٹ لگتا ہے۔" لیوس بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے میں تمہیں آج ہی پیلز بریکس کے فارم میں پہنچا دوں گا۔ وہاں میرا ایک چھوٹا سا گیراج ہے۔ اس کے ساتھ ایک کوارٹر بھی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر لیوس فلیٹ سے نکل گئے۔ کچھ دیر بعد وہ ٹیکسی لے آئے۔ اس وقت تک دن نکل آیا تھا۔ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ میں فلیٹ سے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ لیوس میرے ساتھ تھا۔ میں پچھلی سیٹ پر نیچے ہو کر بیٹھا تھا۔ ٹیکسی رنگون کے بازاروں میں گزرنے لگی۔ جاپانی سپاہیوں نے ہر چوک میں مورچے بنا رکھے تھے۔ مگر وہ چیکنگ نہیں کر رہے تھے۔ پیلز بریکس شہر کے شمال جنوب میں ایک چھوٹا سا جنگل تھا جس میں ایک کافی بڑا فارم تھا لیوس اس فارم کا منیجر رہ چکا تھا۔ یہ نیم پہاڑی علاقہ تھا ٹیکسی اونچی نیچی پہاڑی سڑکوں پر چلی جا رہی تھی۔

مجھے فارم کے عقبی دروازے سے اندر لے جایا گیا۔ گیراج اور کوارٹر اسی طرف چانس کے اونچے اور گھنے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے نشیب میں تھا۔ اس کے نیچے ایک پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ کوارٹر اور گیراج دونوں ویران پڑے تھے۔ گیراج پر تالا لگا تھا۔ لیوس نے

تالا کھولا۔ اندر بانس کی ایک کھاٹ دیوار سے لگی تھی۔

"تم یہاں کچھ وقت گزارو۔ میں جب تک تمہارے یہاں سے نکلوانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ باتھ روم پیچھے کوارٹر میں ہے۔ نیچے پہاڑی نالے کا پانی صاف ہے۔ میں تمہیں صبح شام کھانا پہنچا دیا کروں گا۔ مگر یہاں سے باہر غیر ضروری طور پر مت نکلنا یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس طرف جاپانی نہیں ہیں۔ میں جاتا ہوں۔ دوپہر کو تمہارے لئے کچھ کھانے کو لے کر آؤں گا۔"

لیوس چلا گیا۔ وہ گیراج کو باہر سے تالا لگا گیا تھا۔ مگر اس کی ایک کھڑکی پیچھے نشیب میں کوارٹر کی طرف کھلتی تھی۔ میں کچھ دیر بانس کی چارپائی پر بیٹھا اپنی حالت پر غور کرتا رہا کہ کبھی میں بھی واپس اپنے وطن پہنچ سکوں گا۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کا تھوڑا سا پٹ کھولا اور نیچے نشیب میں بہتے پہاڑی نالے کو دیکھنے لگا۔ میرا شک غلط نہیں تھا۔ بری اخبار والے نے مخبری کر دی تھی اور جاپانی سپاہی میری تلاش میں وہاں آ گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ دو فوجی گاڑیاں جس میں جاپانی سپاہی سوار تھے بڑی تیزی سے نالے کا پل پار کر کے گیراج کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا۔ وقت بہت کم تھا۔ جونہی فوجی گاڑیاں ایک جانب مڑیں میں نے کھڑکی میں سے نیچے چھلانگ لگا دی اور لڑھکتا ہوا نالے کی جھاڑیوں میں جا کر گرا۔ وہاں سے اٹھا۔ نالے کو پار کیا اور بھاگنے لگا۔ پیچھے سے فائر آیا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے نکل گئی۔ اس کے بعد سٹین گن کے برسٹ فائر ہونے لگے۔ میں جھک گیا اور اسی حالت میں درختوں کے پیچھے دوڑتا ٹیلے کی دوسری طرف اتر گیا۔ اس وقت مجھے کسی جگہ چھپ جانے کی ضرورت تھی۔ میں وہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ جاپانی فوج نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہو گا۔

مجھے ایک چھوٹی سی بودھ خانقاہ دکھائی دی۔ فائر میرے پیچھے آ رہا تھا۔ گولیاں میرے سر کے اوپر درختوں کی شاخوں کو توڑتی گزر رہی تھیں۔ میں خانقاہ میں گھس گیا۔ ایک بودھ بھکشو جو تھا بدھ کے مجسمے کے سامنے دو زانو بیٹھا عبادت کر رہا تھا۔ اس نے بڑی پر سکون آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں انگریزی میں کہا کہ جاپانی میرے پیچھے آ رہے

ہیں۔ مجھے کہیں چھپا لو۔ فائرنگ کی آواز اس نیک دل بودھ بھکشو نے بھی سن لی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ آگے دالان تھا۔ دالان کے آخر میں ایک تاریک زینہ نیچے باؤلی کو جاتا تھا۔ باؤلی کی دیوار میں پتھروں کی ایک گیلری سی بنی ہوئی تھی۔ بودھ بھکشو نے مجھے اس گیلری کے نیچے چھپا دیا۔

جاپانی خانقاہ میں آ گئے۔ بودھ بھکشو سے ان کی باتوں کی ہلکی ہلکی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ خدا نے میری مدد کی اور جاپانی چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد بودھ بھکشو مجھے باؤلی کی گیلری سے نکال کر ایک چھوٹی سی نیم روشن کوٹھڑی میں لے آیا۔ یہاں اس نے بڑی رواں انگریزی میں مجھے کہا۔

"میں نے بھکشو بننے کے بعد پہلی بار جھوٹ بولا ہے پر مجھے افسوس نہیں۔ کیوں کہ یہ جھوٹ میں نے ایک انسان کی جان بچانے کے لئے بولا ہے۔ مگر تم زیادہ دیر یہاں نہیں رہ سکو گے۔ جاپانیوں نے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ ہوسکتا ہے ان کا کوئی جاسوس خانقاہ کے آس پاس منڈلا رہا ہو"

میں نے کہا۔ "پھر میں کیا کروں۔ کچھ تم ہی مجھے مشورہ دو۔"

میں نے اپنی ساری مصیبت بھری کہانی اسے سنا دی تھی۔

بودھ بھکشو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

"تمہیں سر منڈوا کر بھکشوؤں جیسا حلیہ بنانا ہوگا۔ میں تمہیں زعفرانی چادر بھی دے دوں گا۔"

میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ دوسرے لمحے اس نے استرے سے میرا سر مونڈ ڈالا اور مجھے زعفرانی چادر پہنا دی۔ میں نے شیشہ دیکھا تو لگا جیسے کوئی بھکشو لڑکا شیشے ہی سے مجھے دیکھ رہا ہے۔

☆......☆......☆

رنگون کے سیلز بیرکس والے اس گمنام سے پیگوڈا بلکہ بودھ خانقاہ میں میں نے بھکشو لڑکے کے بھیس میں صرف دو دن ہی گذارے تھے کہ یہاں بھی میری مخبری ہو گئی اور میں پکڑا گیا۔ اس بار جاپانیوں نے مجھے کمپالی کے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں بھجوا دیا۔ یہ بہت بڑا جنگی کیمپ تھا جو جاپانیوں نے نیچے تھائی لینڈ کی سرحدوں کے قریب سمندر کنارے جنگل کے ایک ٹکڑے کو صاف کر کے بنایا تھا۔ تین دن تک میں قیدی ٹرین کے بند ڈبے میں سفر کرتا رہا۔ میرے ساتھ کچھ اور قیدی بھی تھے جن کا تعلق بری فوج سے تھا۔ یہ لوگ برما کے مختلف علاقوں سے لا کر کمپالی کیمپ کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔

اس جنگی کیمپ کے گرداگرد خاردار تاروں کی دو دیواریں چاروں طرف چلی گئی تھیں۔ کانٹے دار تاروالی دونوں دیواریں پندرہ پندرہ فٹ اونچی تھیں۔ ان کے درمیان تھوڑی جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی جہاں جاپانی سپاہی گشت لگاتے رہتے تھے۔ کیمپ کے چاروں کونوں پر اونچے مچان تھے جن میں جاپانی مشین گنیں لئے بیٹھے تھے۔ ان کے پاس سرچ لائٹس بھی تھیں۔ رات کو یہ سرچ لائٹس گول دائرے والی روشنی پھینکتیں جو آہستہ آہستہ گھوم کر چاروں طرف کیمپ کی دیواروں کا چکر لگاتیں۔ جنگی کیمپ کا صرف ایک گیٹ تھا جو بانس اور دوسری لکڑی کا بنا تھا۔ اس کے اوپر بھی ایک

بڑی مچان تھی۔ جس میں تین مشین گنوں کی نالیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ بڑے سخت چہروں والے جاپانی اس مشین گن پوسٹ میں ہر وقت موجود رہتے تھے۔

کیمپ کے اندر زمین سے تین چار فٹ اونچی لکڑی کی لمبی لمبی بارکیں بنائی گئی تھیں۔ بارکوں کے نیچے زمین خالی تھی اور آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ ہر بارک میں بیس قیدیوں کو بھر دیا گیا تھا۔ لکڑی کے فرش پر پرانے کمبل پھینک دیئے گئے تھے۔ بس یہی ہمارا اوڑھنا بچھونا تھا۔ شام کے بعد اندھیرا ہوتے ہی ساری بارکوں کی بتیاں بجھا دی جاتیں اور قیدیوں کو آرڈر دیا جاتا کہ سو جاؤ۔ کسی بارک سے کوئی آواز نہ آئے۔ بارکوں کے باہر جاپانی سپاہی رائفلیں کاندھوں پر ڈالے گشت لگاتے اور بارک کی لکڑی کی دیواروں سے کان لگا کر سننے کی کوشش کرتے کہ اندر قیدی باتیں تو نہیں کر رہے؟ کیمپ کی باقی تمام بتیاں روشن ہوتی تھیں۔ خاردار دیواروں کے کونوں پر بڑی بڑی لائٹس لگی تھیں جو ساری رات جلتی رہتیں۔ گن پوسٹوں میں سے روشنی کے گول دائرے بھی دیواروں کے چاروں طرف رات بھر گھومتے رہتے۔

دن نکلتے ہی قیدیوں کو بارکوں کے سامنے قطاروں میں اٹین شن کر دیا جاتا اور رول کال ہوتی۔ تمام قیدیوں کے نمبروں کے حساب سے گنتی کی جاتی۔ وہیں ہمیں کالی کافی کا ایک مگ اور باسی ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے ناشتے کے طور پر مل جاتے ہم وہیں بیٹھ کر اسے زہر مار کرتے۔ اس کے فوراً بعد قیدیوں کو مشقت کے لئے الگ الگ ٹولیوں میں سخت نگرانی میں جنگل کی طرف بھیج دیا جاتا۔ جنگل میں ان سے درختوں کی کٹائی کروائی جاتی۔ وہاں جاپانی ایک فوجی سڑک بھی بنوا رہے تھے۔ اس سڑک پر ان سے پتھر کٹائے جاتے۔ چونکہ میں دو تین مرتبہ فرار ہوا تھا اس لئے مجھے قیدی کیمپ سے باہر نہیں بھیجا گیا لیکن کیمپ کے اندر ہی مجھ سے مشقت لی جاتی تھی۔ پہلے دو چار دن میں بارکوں کے سامنے زمین کھود کر ہموار کرتا رہا۔ پھر جاپانی کوارٹر گارڈ کے آگے پڑے ملبے کو اٹھا کر ایک بہت بڑے گڑھے میں ڈالتا رہا۔ وہ میری نہ مری کا زمانہ تھا۔

بعد میں جب میں نے قیدی کیمپوں سے فرار کی انگریزی فلمیں دیکھیں تو مجھے بے اختیار اپنی قید کا

زمانہ یاد آ گیا۔ آج بھی ٹی وی پر دوسری جنگ عظیم کی کوئی ایسی فلم دیکھتا ہوں تو میری پرانی تلخ یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور یقین نہیں آتا کہ میں اس موت کے کیمپ میں سے زندہ نکلنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ دراصل اسکا سارا کریڈٹ اس لڑکی سامین کو جاتا ہے جو رنگون کے سب سے بڑے بودھ مندر رسولی پیگوڈا کی سیڑھیوں پر پھول بیچا کرتی تھی اور جو شہر پر جاپانیوں کی پہلی بمباری کے موقع پر ہی مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔

کمپائی کیمپ میں کوئی دو ہزار کے قریب قیدی بند تھے۔ ان میں برمی بھی تھے۔ کچھ ڈچ فوجی تھے انگریز تھے اور انڈین فوجی بھی تھے۔ رنگون کے کچھ شہری بھی یہاں لائے گئے تھے جن پر جاپانیوں کو شبہ تھا کہ وہ انگریزوں سے مل کر ان کی جاسوسی کرتے تھے۔ دن میں دو بار صبح و شام ہمیں بارکوں کے آگے نکال کر ایکسر سائز کرائی جاتی۔ جاپانی رائفلیں لئے چاروں طرف کھڑے رہتے۔ ایک بار نلکوں کے نیچے قیدیوں والے لباس سمیت کھڑے کر کے غسل دیا جاتا۔ اور ہم بھیگے کپڑوں میں ہی اپنی بارکوں میں واپس آ جاتے۔ کیمپ کے اندر ہمیں کسی سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ بارکوں میں ہم ایک دوسرے سے بات کر سکتے تھے۔ لیکن اس میں بھی یہ خطرہ تھا کہ جاپانیوں نے اپنے جاسوس قیدی بنا کر ہم میں چھوڑ رکھے تھے تاکہ وہ یہ معلوم کر سکیں کہ کہیں کوئی فرار کا منصوبہ تو نہیں بنا رہے۔

دن بھر سخت مشقت کے بعد ہم تھک کر چور ہو جاتے تھے اور بارکوں میں آ کر لکڑی کے شہتیروں کی طرح بے سدھ ہو کر پڑ جاتے۔ دوپہر کو ہمیں تھوڑے سے موٹے ابلے ہوئے چاول اور گندے پتوں کا شوربا دیا جاتا۔ رات کو بھی یہی کچھ کھانے کو ملتا۔ کسی کو شیو کرنے یا سگریٹ پینے کی اجازت نہیں تھی۔ رات کا اندھیرا ہوتے ہی اردگرد کے جنگل میں سناٹا چھا جاتا۔ میں بارک کی دیوار کی درز میں سے جھانک کر باہر دیکھتا تو مجھے سوائے سرچ لائٹ کی دائیں سے بائیں گردش کرتی روشنی کے دائرے کے اور کچھ نظر نہ آتا۔ میری بارک میں زیادہ تر برمی سویلین اور فوجی قیدی تھے جو اردو بہت مشکل سے بول سکتے تھے۔

ایک رات میں بارک کے فرش پر لیٹا سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیمپ کی خاموش فضا یکدم مشین گنوں کی فائرنگ سے گونج اٹھی۔ میرے ساتھی قیدی بھی جاگ اٹھے۔ چار پانچ منٹ تک مشین گن کی فائرنگ ہوتی رہی۔ درمیان میں جاپانی سپاہیوں کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ صبح معلوم ہوا بکہ رات چار انگریز قیدیوں نے کیمپ سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ ان کی مشین گن کی گولیوں سے ادھڑی ہوئی لاشیں ابھی تک کانٹے دار تاروں میں الجھی ہوئی تھیں۔ دوسرے قیدیوں کو عبرت دلانے کے لئے جاپانیوں نے ان لاشوں کو وہیں رہنے دیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک بار وہاں سے فرار کا خیال آیا تھا لیکن ان انگریز قیدیوں کی لاشیں دیکھ کر میں نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔

☆......☆......☆

فرار کی کوشش کرنے والے انگریز قیدیوں کی لاشیں کانٹے دار تاروں پر ہی لٹکتی رہیں۔ دوسرے قیدیوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے جاپانیوں نے انہیں نیچے نہیں اتارا تھا۔ یہاں تک کہ وہ وہیں گل سڑ گئیں اور ان کی ہڈیاں ہی باقی رہ گئیں۔

میں نے بھی اگرچہ دل سے فرار ہونے کا خیال خوف کے مارے نکال دیا تھا لیکن جانے کیوں دل کے ایک کونے میں اس امید کی ننھی سی شمع ضرور روشن تھی کہ میں ایک نہ ایک دن یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

ایک مہینہ گذر گیا۔ اس دوران ایک برمی قیدی فرار ہونے کی کوشش کرتا پکڑا گیا۔ جاپانیوں نے سب قیدیوں کے سامنے تلوار سے اس کی گردن اڑا دی۔ مزید ایک مہینہ گذر گیا۔ میں دن بھر سر جھکائے خاموشی سے قیدی کیمپ کے اندر مشقت میں لگا رہتا۔ تیسرے مہینے جاپانیوں نے مجھے بھی مشقت کے لئے کیمپ سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ میں بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ اب قریبی جنگل میں لکڑیاں کاٹنے اور سڑک بنانے کے کام میں لگ گیا۔

میں نے دل سے یہ خیال نکال دیا تھا کہ کبھی اس جہنم سے آزاد ہو سکوں گا۔ کہ قدرت کی طرف سے ایک ایسا انتظام ہو گیا جسکی مجھے بالکل توقع نہیں تھی۔ جنگل میں پہلے چار دن تو میں

لکڑیاں کاٹتا رہا۔ پھر مجھے سڑک کے لئے پتھر ڈھونے کے کام پر لگا دیا گیا۔ یہ سڑک جاپانی جنگل میں بنا رہے تھے۔ جو خدا جانے آگے کہاں جا کر کس بڑی سڑک سے ملنے والی تھی۔ میں جس ٹکڑے پر کام کرتا تھا وہ بانس کے ایک ذخیرے کے قریب واقع تھا۔ یہاں سڑک سے تھوڑا نیچے ایک چھوٹا سا چشمہ بہہ رہا تھا۔ پانی کی ایک شفاف دھار چٹانوں میں سے نکل کر نیچے ایک مختصر سے تالاب میں گرتی تھی جس کی دونوں جانب سبز جھاڑیاں اگی تھیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے بے شمار گول گول پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ میں یہ پتھر ٹوکرے میں بھرتا اور اسے سر پر اٹھا کر سڑک پر لے جا کر ڈال دیتا جہاں دوسرے قیدی اسے سڑک پر بچھانے میں لگے ہوتے۔

ایک روز میں خالی ٹوکرا لئے پتھر اٹھانے چشمے پر آیا تو دیکھا کہ ایک برمی لڑکی چشمے کنارے پتھر پر بیٹھی کپڑے دھو رہی ہے۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ کبھی کبھی یہاں قریبی گاؤں کی عورتیں کپڑے دھونے آجایا کرتی تھیں اور ہمیں ان سے بات کرنے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ سڑک یہاں سے اوپر چند قدموں کے فاصلے پر تھی جہاں ایک جاپانی کاندھے پر رائفل ڈالے ٹہلتا اور قیدیوں کی کارگزاری چیک کرتا رہتا تھا۔ یہ بے ضرر اور بے تعلق سی دیہاتی عورتیں تھیں۔ یہ بھی قیدیوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھیں۔ میں چشمے کے قریب ایک جگہ بیٹھ کر ٹوکری میں گول گول پتھر ڈالنے لگا۔

چشمے پر کپڑے دھونے والی لڑکی کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ میں نے ٹوکری اٹھا کر سر پر رکھی اور جب چلنے لگا تو ایک گول پتھر پر سے میرا پاؤں پھسل گیا۔ ٹوکری گر پڑی۔ لڑکی نے پلٹ کر دیکھا۔ میں نے بھی اس کی طرف دیکھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ یہ سامن تھی۔ وہی لڑکی جو رنگون کے سولی پیگوڈا کی سیڑھیوں پر پھول بیچا کرتی تھی۔ سامن کو معلوم تھا کہ جنگی قیدیوں کا کیمپ قریب ہی ہے اور وہ سمجھ گئی تھی کہ میں جنگی قیدی بن چکا ہوں۔ اسکا ایک ثبوت میری پھٹی پرانی قیدیوں والی نیلی وردی بھی تھی۔ چنانچہ حیرت کی کیفیت سے نکلتے ہی اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بانس کے درختوں کی طرف آنے کو کہا۔ میں زمین پر بیٹھا ٹوکری میں پتھر

دوبارہ ڈال رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سڑک کی طرف گشت کرنے والا جاپانی سپاہی مجھے نظر نہ آیا۔ میں نے ٹوکری وہیں رکھی اور جھک کر چلتا تیزی سے بانس کے درختوں کے پیچھے آ گیا۔ سامن نے جلدی جلدی گیلے کپڑے نچوڑے اور جھاڑیوں میں سے گذرتی میرے پاس آ گئی۔ ایک پل کے لئے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ پھر اس نے پوچھا۔

''تم کہاں پکڑے گئے تھے؟''

''یہ لمبی کہانی ہے سامن۔ اگر زندہ بچ گیا تو پھر بتاؤں گا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا یہاں سے فرار ہونے کا کوئی راستہ ہے۔''

سامن نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ گیلے کپڑے اس کے ہاتھوں میں تھے کہنے لگی۔

''کیا تم روز یہاں پتھر اٹھانے آتے ہو؟''

''ہاں۔ میں کل بھی آؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

سامن نے ایک سیکنڈ کے لئے کچھ سوچا اور بولی۔

''میں کل اسی وقت آؤں گی۔ بس اب تم جاؤ یہ لوگ بڑے ظالم ہیں۔ انہوں نے ہمارے گاؤں کے کئی لوگ مار ڈالے ہیں۔''

یہ کہہ کر سامن نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بھاگ کر جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔ سامن میرے دل میں امید کی شمع روشن کر گئی تھی۔ میرے دل میں ایک نیا جذبہ بھر گئی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب میں اس خوفناک قیدی کیمپ سے فرار ہو جاؤں گا۔ میں پتھر اٹھانے سڑک پر آیا تو جاپانی سپاہی نے رائفل کا بٹ میری پسلیوں میں دے مارا۔ میں گر پڑا۔ وہ اپنی زبان میں نہ جانے غصے میں کیا کچھ کہتا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے سامن سے باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھا ہوتا تو مجھے وہیں گولی مار دیتا۔

اب میں بے تابی سے دوسرے دن کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے رات کاٹی۔ صبح ہوئی تو دل کو یہی دھڑکا لگا تھا کہ کہیں مجھے جنگل میں جا کر مشقت کرنے سے روک نہ دیا

جائے۔ یا پھر کہیں سامین چشمے پر نہ آ سکے۔ طرح طرح کے وسوسوں نے دل کو گھیر لیا تھا۔ قیدیوں کی رول کال کے بعد کیمپ کے باہر جا کر مشقت کرنے والے قیدیوں کی ٹکڑی الگ کر دی گئی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس ٹکڑی میں میں بھی شامل تھا۔

میں سڑک پر جا کر پتھر ڈھونڈنے لگا۔ میری نگاہیں بار بار نشیب میں واقع چشمے کی طرف اٹھ جاتیں۔ سامین نے یہی وقت دیا تھا۔ مگر وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں چشمے کے پاس بکھرے پتھروں کو ٹوکری میں بھر کر چھ تھا پھیرا لگا رہا تھا کہ جاپانی سپاہی نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ میں گھبرا گیا۔ کہیں اسے علم تو نہیں ہو گیا کہ میں آج فرار ہو رہا ہوں۔ کہیں سامین بھی تو جاپانیوں کے ساتھ نہیں ملی ہوئی؟ وہ وقت ہی ایسا تھا۔ میرے دل میں ہر طرح کے خدشے پیدا ہو سکتے تھے۔ جاپانی نے سڑک کی دوسری طرف اشارہ کیا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا کہ میں سڑک کی دوسری طرف جا کر کام کروں۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ کیونکہ اس طرح میں سامین سے نہیں مل سکتا تھا۔ اور سامین سے نہ ملتا تو میں اس موت کے کیمپ سے نجات حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ انکار کا مطلب میری موت تھا۔ میں خاموشی سے سڑک کی دوسری طرف ڈھلان میں اتر گیا۔ وہ چشمہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا جہاں آنے کے لئے سامین نے مجھے کہا تھا۔

☆......☆......☆

نیک دل بری لڑکی سامین نے مجھے پہاڑی چشمے پر آنے کا کہا تھا مگر جاپانی سپاہی نے عین وقت پر مجھے سڑک کی دوسری جانب مشقت پر لگا دیا تھا۔ یہ جگہ ڈھلان میں تھی۔ یہاں سے چشمہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بڑا پریشان تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بری لڑکی چشمے پر کپڑے دھونے کے بہانے آ چکی ہو گی اور اسکی نگاہیں ادھر ادھر مجھے تلاش کر رہی ہوں گی۔ مگر میں سڑک کی دوسری طرف ڈھلان میں پتھر ڈھو رہا تھا۔ جاپانی سپاہی رائفل کندھے سے لگائے زیر تعمیر سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ میں چشمے پر نہیں جا سکتا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر دوسرے قیدی بھی مشقت میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ اس روز بری لڑکی سامین مجھے وہاں سے بھگانے کی کوئی ترکیب بتانے والی تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ سورج درختوں کے اوپر آ گیا۔ دوپہر کے وقت جنگی قیدیوں کو وہیں جنگل میں ستانے کے لئے تھوڑا سا وقفہ ملتا تھا۔ اس وقفے میں بھی ہمیں ادھر ادھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر میں جاپانی پہرے دار کی آنکھ بچا کر سڑک پر آ گیا۔ میری نظریں بے تابی سے چشمے کی طرف گئیں۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ بری لڑکی یقیناً میرا انتظار کر کے جا چکی تھی۔

دوسرے دن قیدیوں کو مشقت کے لئے جنگل میں لے جایا گیا تو میری یہی کوشش تھی کہ میں

چشمے پر جا کر پتھر ڈھوؤں مگر دوسرے روز بھی مجھے سڑک کی دوسری طرف مشقت پر لگا دیا گیا۔
اس روز ہمارا کام سڑک پر ڈالے گئے پتھروں کو پھاوڑوں سے ہموار کرنا تھا۔ ہم دس بارہ قیدی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کام کر رہے تھے۔ میں ان سب میں کم عمر تھا۔ میں جس مقام پر مشقت پر لگا تھا وہاں نشیب میں خاکی اور نسواری رنگ کی چھوٹی بڑی گول گول چٹانوں کے درمیان ایک پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ ایک بار جو میری نگاہ ادھر پڑی تو مجھے چٹان کے پیچھے ایک عورت کا چہرہ نظر آیا۔ فاصلہ کوئی پچاس ساٹھ قدموں کا تھا۔ میں نے اس چہرے کو فوراً پہچان لیا۔ یہ میری ہمدرد اور نیک دل برمی لڑکی سامین تھی۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ یہ بڑا خطرناک بلاوا تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ سامین نے میرے فرار کی کیا سکیم تیار کر رکھی ہے اور آیا وہ سکیم قابل عمل بھی ہے کہ نہیں۔ کیونکہ سامین کوئی تجربہ کار سیانی عورت نہیں تھی۔ مگر وہ اپنا ہاتھ بار بار ہلا کر مجھے بلا رہی تھی۔ مجھے فوری طور پر فیصلہ کرنا تھا۔
ابھی یا پھر کبھی نہیں ___ جنگی قیدیوں کے کیمپ کی اذیت ناک زندگی اور آزادی کے درمیان صرف پچاس قدموں کا فاصلہ تھا۔ اس فاصلے میں میری موت بھی تھی اور آزادی کی زندگی بھی تھی۔ سامین تھوڑی دیر ہاتھ ہلا کر چٹان کی اوٹ میں ہو جاتی تھی۔ میرے خون نے جوش مارا۔ میں نے دیکھا کہ گارڈ ڈیوٹی کے دونوں جاپانی سپاہی پتھروں پر بیٹھے سگریٹ پینے اور ایک دوسرے سے فس فس کر باتیں کر رہے تھے۔ اتفاق سے اس وقت ان کی پشت میری جانب تھی۔ چار جنگی قیدی میرے قریب ہی کام میں لگے تھے۔ میں وہیں آہستہ سے بیٹھ گیا۔
ایک قیدی نے میری طرف غور سے دیکھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ قیدی سمجھ گیا کہ میں نے کوئی خطرناک فیصلہ کر لیا ہے۔ وقت بڑا نازک تھا۔ وقت بڑا اہم تھا۔ بادلوں سے اچھل کر باہر نکلی ہوئی سورج کی کرن کی طرح یہ سنہری موقع پل دو پل کے لئے میرے پاس آیا تھا۔ پھر جیسے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی۔ میں نے نیچے نشیب میں جو جنگی جھاڑیاں تھیں ان میں چھلانگ لگا دی۔ چھلانگ لگانے کے ساتھ

ہی میں اٹھا اور اندھا دھند چٹان کی طرف دوڑ پڑا۔ جنگلی گھاس میرے گھٹنوں تک تھی۔
دوڑنے میں دشواری ضرور ہو رہی تھی مگر ایک اطمینان بھی تھا کہ دوڑنے کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

آپ یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ جاپانیوں کی قید سے فرار ہونا ایک آسان بات تھی۔
حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دو باتیں میرے حق میں جا رہی تھیں۔ ایک یہ کہ میں کیمپ کی چار دیواری سے باہر کھلے جنگل میں مشقت پر تھا۔ دوسری بات یہ کہ پہرے دار اس وقت غافل ہو گئے تھے۔ جونہی میں چٹان کے عقب میں آیا سامین نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتی ہوئی اس طرف لے گئی جہاں دو بڑی بڑی چٹانوں کے درمیان ایک تنگ راستہ بنا ہوا تھا۔ یہ کوئی پچاس ساٹھ گز کا راستہ تھا جس کے آگے پہاڑی ندی کا کٹاؤ تھا۔ پانی چھوٹے بڑے پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر اچھلتا ہوا تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ برمی لڑکی مجھے کہاں چھپانے کا پروگرام بنائے ہوئے ہے کیونکہ یہ سارا علاقہ کھلا تھا اور جاپانی مجھے بڑی آسانی سے تلاش کر سکتے تھے۔

سامین مجھ سے دو قدم آگے تیز تیز جا رہی تھی۔ ندی کنارے وہ ایک طرف گھوم گئی۔
میں بھی ادھر ہی کو گیا۔ آگے بھی ایک بلند چٹان تھی جس کی ایک دراڑ میں سے پانی چھوٹی سی آبشار کی شکل میں نیچے ندی میں گر رہا تھا۔ اس چٹان کے پیچھے بڑے بڑے پتھروں کے درمیان ایک چھوٹی سی قدرتی سرنگ بنی ہوئی تھی۔ سامین نے کہا۔

”میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ“

یہ کہہ کر وہ سرنگ میں داخل ہو گئی۔ یہاں اندھیرا ہے۔ سرنگ میں صرف ایک آدمی کے گذرنے کی گنجائش تھی۔ سامین آگے تھی۔ اندھیرے میں مجھے اس کا ہیولا سا نظر آتا تھا۔ سرنگ میں کئی موڑ آئے۔ اترائی چڑھائی بھی آئی۔ یہ سرنگ چٹانوں کے اندر ہی اندر چکر کاٹتی وادی کی دوسری طرف نکل گئی تھی۔ کھلی فضا اور روشنی میں آتے ہی میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کیا دیکھتا ہوں

کہ سامنے ایک نہر بہہ رہی ہے۔ نہر کے اوپر بانس اور ناریل کے درخت جھکے ہوئے ہیں۔ نہر کنارے ایک سمپان یعنی چھوٹی کشتی بندھی تھی۔ ہم کشتی میں بیٹھ گئے۔ سامین نے چپو تھام لئے اور کشتی پانی کے بہاؤ کی طرف چل پڑی سامین نے پوچھا۔ "تمہیں نکلتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟" میں نے کہا کہ "صرف ایک قیدی نے دیکھا تھا مگر وہ میرا خیر خواہ ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ میرے فرار پر خوش ہوا تھا۔

مگر ہم آگے کہاں جا رہے ہیں؟" سامین بولی۔ "ایسی جگہ جہاں جاپانی سپاہی تمہیں تلاش نہ کر سکیں۔"

میں سوچنے لگا ہو سکتا ہے جاپانی سپاہیوں کو میرے فرار کا علم ہو گیا ہو اور وہ میری تلاش میں نکل چکے ہوں۔ مگر ابھی تک کسی طرف سے رائفل یا برین گن کے فائر کی آواز نہیں آئی تھی۔ ندی ایک اتنے گھنے جنگل میں داخل ہو گئی تھی کہ وہاں دن کے وقت بھی درختوں جھاڑیوں کی وجہ سے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ کشتی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ندی نے ایک موڑ کاٹا تو سامین کشتی کو کنارے پر لے آئی۔ اس کی ہدایت پر میں نے کشتی کو کنارے پر کھینچ لیا اور ایک کافی بڑی جھاڑی میں چھپا دیا۔ اس کشتی کو برمی زبان میں سمپان کہتے ہیں اور یہ درخت کے تنے کو کھوکھلا کر کے بنائی جاتی ہے اور اس میں صرف دو آدمی ہی آمنے سامنے بیٹھ سکتے ہیں۔ ماہی گیر اسے سر پر اٹھا کر بھی لے جاتے ہیں۔

سامین مجھے ایک چٹان کے اندر بنی ہوئی قدرتی کھوہ میں لے آئی۔ کھوہ کا منہ تو چھوٹا تھا مگر پیچھے کافی کھلی جگہ تھی۔ دہانے کو گھاس پتوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ سامین نے یہاں پہلے سے سب انتظام کر دیا تھا۔ زمین پر سوکھے پتوں کا بستر لگا تھا۔ پانی سے بھرا ہوا مٹکا۔ ایک ماچس، موم بتی، سگریٹ۔ اور کچھ جنگلی پھل وہاں موجود تھے۔ میں نے سامین سے کہا "میں یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہتا سامین۔ کوئی ایسا بندوبست کرو کہ میں اس راستے پر چل پڑوں جو بنگال کی طرف نکل جاتا ہے۔" سامین کہنے لگی۔ "اسکا انتظام بھی ہو جائے گا۔ لیکن تمہیں ابھی دو ایک دن یہاں

چھپے رہنا ہوگا۔ ہمارا گاؤں قریب ہی ہے۔ مگر میں تمہیں وہاں نہیں لے جا سکتی۔ وہاں جاپانیوں کے جاسوس بھی ہیں جو انہیں خبر کر دیں گے۔ میرا بڑا بھائی سانگ میرے ساتھ مل گیا ہے۔ وہ تمہارا انتظام کرنے آج صبح ہی دوسرے گاؤں کی طرف چلا گیا تھا۔ تم یہاں آرام کرو۔ میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔"

سامین چلی گئی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد میرے لئے چاول اور مچھلی کا شوربہ لے کر آئی۔ ایک عرصے بعد ایسی چیزیں کھانے کو ملی تھیں۔ میں سارے چاول کھا گیا۔ سامین جاتے ہوئے بولی۔

"یونہی باہر مت نکلنا۔ کسی نے دیکھ لیا تو جاپانی ایک سیکنڈ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں شام کو کھانا لے کر آؤں گی۔"

سامین چلی گئی۔ مجھے اس خفیہ کمین گاہ میں رہتے ہوئے چھ روز گذر گئے۔ سامین نے مجھے بتایا کہ جاپانی ایک جیپ میں اسکی تلاش میں گاؤں میں بھی آئے تھے مگر آگے نکل گئے۔ پانچویں روز سامین کا بڑا بھائی سانگ میرے پاس کھوہ میں آیا۔ کہنے لگا۔

"سارے علاقے پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ برسات بھی شروع ہو گئی ہے۔ جنگل کے سارے راستے بند ہو گئے ہیں۔ کوئی ایسا راستہ نہیں ہے کہ تم بنگال جا سکو۔ میں نے تمہارے لئے ایک ترکیب سوچی ہے۔ میرا ایک دوست مولمین کے پاس ساؤتنگ کی بندرگاہ پر گودی مزدوروں کا میٹ mate ہے۔

یہاں سے ہفتے میں ایک بار مال بردار سمندری جہاز فوجی اور دوسرا سامان لے کر انڈونیشیا کی طرف جاتا ہے۔ انڈونیشیا پر بھی اگرچہ جاپانیوں کا قبضہ ہے مگر وہ مسلمان کا ملک ہے۔ اگر تم اس ملک میں کسی طرح چلے جاؤ تو تمہیں وہاں کسی نہ کسی مسلمان گھرانے میں پناہ مل سکتی ہے۔ وہاں تمہیں پہچانے کا بھی کوئی نہیں۔ جنگ کو تو آخر ایک دن ختم ہونا ہی ہے۔ پھر تم وہاں سے اپنے وطن جا سکتے ہو۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس تجویز کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے

سانگ سے پوچھا۔ "کیا مال بردار جہاز میں میرے پکڑے جانے کا خطرہ نہیں ہوگا۔ جاپانی مجھے وہاں گرفتار کر سکتے ہیں" سانگ بولا۔ "ابھی تم فکر نہ کرو۔ تمہارا حلیہ بدل دیا جائے گا۔ میں نے اپنے دوست سے بات بھی کر لی ہے۔ اگر تمہیں میری تجویز قبول ہو تو تیار ہو جاؤ۔ میں آج رات کے پچھلے پہر ہی تمہیں اپنے ساتھ یہاں سے لے چلوں گا۔" میں نے سوچا انڈونیشیا مسلمان ملک ہے۔ کم از کم جنگ ختم ہونے تک مجھے وہاں کسی مسلم فیملی میں ضرور پناہ مل جائے گی۔ میں نے ہاں کر دی۔ سامین اور اسکا بھائی مجھے صبح تیار رہنے کی ہدایت کر کے چلے گئے۔

☆......☆......☆

برمی لڑکی کا بھائی سانگ گاؤں سے مجھے خفیہ طور پر نکال لے جانے کا منصوبہ تیار کر چکا تھا اور میں نے اس کے منصوبے پر عمل کرنے کی حامی بھری تھی۔ بات یہ ہے کہ میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ میں جاپانیوں کی قید سے بھاگا ہوا جنگی قیدی تھا اور وہ میری تلاش میں تھے۔ سارا علاقہ ان کے قبضے میں تھا۔ وہ کسی بھی وقت مجھ تک پہنچ سکتے تھے۔ کیونکہ علاقے میں جاپانیوں کے حامی برمی مخبروں کی کمی نہیں تھی۔

سانگ کہہ گیا تھا کہ میں رات کو آؤں گا۔ اس نے وہاں سے میرے فرار کا سارا بندوبست کر لیا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ مجھے ساتونگ نام کی ایک گودی سے مال بردار جہاز میں سوار کروا کر انڈونیشیا کی طرف روانہ کر دیا جائے گا۔ اگرچہ انڈونیشیا بھی اس وقت جاپانیوں کے قبضے میں تھا لیکن وہ مسلمانوں کا ملک تھا اور برمیوں کی طرح وہاں کے انڈونیشی مسلمان جاپانیوں کے حامی نہیں تھے بلکہ اپنے ملک کو جاپانیوں سے آزاد کرانے کے لئے خفیہ جدوجہد بھی کر رہے تھے۔ ان کی اس جدوجہد کی تفصیل میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ سامین کے بھائی سانگ نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ بڑا لمبا سمندری سفر ہوگا اور مجھے انڈونیشیا کی بندرگاہ جکارتا پہنچتے پہنچتے دس پندرہ دن لگ جائیں گے۔ کیونکہ مال بردار جہاز کو ساتونگ کی برمی بندرگاہ سے چل کر بحر انڈیمان

میں داخل ہوتا تھا۔

اس سمندر کو پار کر کے خلیج ملاکا میں آ جانا تھا۔ یہاں سے سنگاپور کو اپنی بائیں جانب کافی فاصلے پر پیچھے چھوڑتے ہوئے ان گنت چھوٹے چھوٹے آباد اور غیر آباد جزیروں کے درمیان سے گزر کر بحر جاوا میں سفر کرتے ہوئے انڈونیشیا کے سب سے بڑے شہر اور بندرگاہ جکارتا پہنچنا تھا۔ ایک تو سفر طویل تھا۔ دوسرے مال بردار جہاز کی رفتار ان دنوں کافی سست ہوا کرتی تھی۔ مگر یہ میری زندگی اور موت کا سوال تھا۔ میں تو کسی ایسے جہاز میں بھی بیٹھنے کو تیار تھا جو ایک سال تک سمندر میں سفر کرنے کے بعد انڈونیشیا پہنچتا۔ بشرطیکہ راستے میں کوئی جاپانی لانچ اسے چیک نہ کرتی۔

میں چٹانی غار میں اکیلا بیٹھا سامین کے بھائی اور اپنے خیر خواہ برمی نوجوان کا انتظار کر رہا تھا۔ رات گہری ہونے لگی۔ جنگل میں چاروں طرف دہشتناک قسم کی خاموشی چھا گئی۔ میرے کانوں میں آہٹ سی ہوئی۔ میں نے غار کے آگے آئی ہوئی جنگلی جھاڑیوں کو پیچھے ہٹا کر تیز نظروں سے دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے دو انسانی ہیولے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیئے۔ یہ سامین اور اسکا بڑا بھائی سانگ تھا۔ سامین میرے لئے کھانا بھی لائی تھی۔ سانگ نے غار میں آ کر موم بتی روشن کر دی۔ وہ ایک تھیلے میں میرے لئے کچھ کپڑے بھی لایا تھا۔ میرا حلیہ یہ بدلا گیا کہ مجھے انڈونیشی مسلمانوں کی طرح کرتے کے اوپر لنگی بندھوا کر سر پر کالی کشتی نما ٹوپی پہنا دی۔ جو انڈونیشیا کے مسلمانوں کا عام پہناوا ہے۔ سانگ نے مجھے بیس روپے بھی دیئے۔ اس علاقے میں انگریزی سکہ بھی چلتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ مجھے ندی پار کروا کر جنگل میں بنی ہوئی ایک چھوٹی سی سڑک پر لے آیا جہاں ایک پرانا غیر فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ ٹرک پر لکڑی کی گیلیاں لدی تھیں اور ایک ادھیڑ عمر برمی ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ یہاں سانگ اور سامین مجھ سے جدا ہو گئے۔ اندھیرے میں میں معصوم برمی لڑکی سامین کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکا۔ مگر اتنا آج بھی یاد ہے کہ وہ مجھ سے الگ ہوتے وقت اداس تھی۔ اداس میں بھی تھا مگر میرے آگے خطرات سے بھرا ہوا طویل سفر تھا۔ میں ایک طرح کی ہیجانی حالت میں بھی تھا۔ سامین نے ذرا سا جھک کر مجھے الوداع کیا اور اپنے

بھائی کے ساتھ درختوں کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اب زندگی بھر اس معصوم برمی لڑکی سے ملاقات نہیں ہو گی۔ اس واقعے کو اتنے برس گزر گئے ہیں بلکہ ایک زمانہ بیت گیا ہے۔ خدا جانے وہ برمی لڑکی کہاں ہو گی۔ زندہ بھی ہو گی یا نہیں۔ اگر زندہ ہو گی تو وقت نے میری طرح اس کے چہرے کے نقش و نگار بھی بدل دیئے ہوں گے۔ اب اگر ہم مل بھی جائیں تو شاید ایک دوسرے کو نہ پہچان سکیں۔

یہ تو جذبات کی باتیں ہیں اور میں جذبات کی باتوں کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ جذبات ہی زندگی کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ لیکن میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ بہرحال میں کسی نہ کسی طرح ساتونگ کی بندرگاہ پر پہنچا دیا گیا۔ یہاں مجھے ایک ایسے آدمی کے حوالے کر دیا گیا جو مزدوروں کا ایجنٹ تھا بندرگاہ پر وہ برمی مال بردار جہاز کھڑا تھا جس نے مجھے انڈونیشیا پہنچانا تھا۔ اس زمانے میں پاسپورٹ وغیرہ کا سوال ہی نہیں تھا۔ کیونکہ یہ سارا علاقہ انگریزوں کے زیرنگیں تھا۔ مزدوروں کے ایجنٹ نے جہاز کے کپتان سے بات کر کے مجھے جہاز پر خلاصی بھرتی کروا دیا۔ اس نے کپتان کو میرے بارے میں یہ بتایا کہ میں پنجابی لڑکا ہوں۔ میرے ماں باپ انڈونیشیا میں مقیم ہیں۔ وہاں سے بھاگ کر رنگون آ گیا تھا۔ رنگون میں بھوکوں مرنے لگا۔ اب واپس انڈونیشیا اپنے ماں باپ کے پاس جانا چاہتا ہوں مگر کرائے کے پیسے نہیں ہیں۔ کپتان ادھیڑ عمر کا مگر گرانڈیل پرتگالی تھا جو اس علاقے کی تقریباً ساری زبانیں بول سکتا تھا۔ اس نے مجھے جہاز پر بطور خلاصی رکھ لیا۔ طے یہ پایا کہ میں جکارتا تک جہاز پر مزدوری کر کے اپنا راشن حاصل کروں گا۔ مجھے اور کیا چاہئے تھا۔ صرف ایک بات کا ڈر تھا کہ کہیں جاپانی مجھے پکڑ نہ لیں۔ یہاں کہیں کہیں کوئی جاپانی فوجی نظر پڑ جاتا تھا اور گودی میں ایک دو جاپانی جہاز بھی کھڑے تھے مگر کسی نے مجھے اہمیت نہ دی۔ میں رنگون سے بہت دور نکل آیا تھا۔

دوسرے روز صبح جہاز نے لنگر اٹھا لیا اور انڈیمان کے سمندر میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاز پر میرا کام یہ تھا کہ ۔۔۔۔۔۔ صبح شام عرشے کے فرش کو دھو کر صاف کرتا۔ نیچے جو

چار کیبن بنے ہوئے تھے ان کی بھی صفائی کرتا۔ جہاز کے کچن میں کھانا کھانے جاتا تو باورچی مجھ سے برتن بھی صاف کروالیتا۔ میں یہ سارا کام بڑی خوشی سے کر دیتا۔ کیونکہ میں جنگی قیدیوں کے کیمپ سے بہت دور ہوتا جا رہا تھا۔ انڈیمان کا سمندر بڑا خطرناک اور ڈراؤنا سمندر ہے۔ ہر وقت یہاں طوفان کی حالت رہتی ہے۔ جہاز سارا رستہ ڈولتا رہا۔ شروع میں مجھے چکر بھی آئے۔ پھر میں عادی ہو گیا۔ خلیج ملاکا سے نکلنے کے بعد جہاز راستے میں تین جگہ جزیروں کی گودیوں میں ایک ایک دن کے لئے رکا۔ یہ میرے لئے بڑی آزمائش اور مشکل کا وقت تھا۔ کیونکہ یہاں بھی جاپانیوں کا قبضہ تھا اور گودی میں جاپانی فوجی چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں اس دوران زیادہ تر جہاز کے اندر ہی رہا۔ خدا خدا کر کے کوئی بیس دن کے بعد جہاز جکارتا کی بندرگاہ کے پانیوں میں داخل ہو گیا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اگرچہ ابھی میں خطرے میں ہی تھا۔ کیونکہ انڈونیشیا پر بھی جاپانیوں نے ڈچ فوج کو شکست دے کر قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ انڈونیشیا پر جنگ سے پہلے ہالینڈ والوں کا قبضہ تھا اور وہ اس ملک کی دولت لوٹ رہے تھے۔ جس طرح ہندوستان پر انگریزوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ ہالینڈ والوں کو ڈچ اور ولندیزی بھی کہا جاتا ہے۔ مگر انڈونیشیا کے مسلمانوں میں ہالینڈ کے جبر و استبداد سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کی ایک زبردست تحریک بھی چل رہی تھی، جس کے سربراہ سوئیکارنو تھے جو بعد میں اسلامی جمہوریہ انڈونیشیا کے صدر بنے اور جو پاکستان کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ اور جو اس بات کو نہیں بھولے تھے کہ دوسری جنگ عظیم میں انگریزوں کی جو انڈین فوج جاپانیوں اور بعد میں ولندیزیوں کے خلاف لڑ رہی تھی اس فوج کے اکثر پنجابی مسلمان فوجی اپنی فوج چھوڑ کر سوئیکارنو کی گوریلا فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ ان پنجابی مسلمان فوجیوں نے انڈونیشیا کے حریت پسندوں کے ساتھ شامل ہو کر بہت بڑا خطرہ بھی مول لیا تھا۔ کیونکہ ان کے ماں باپ بہن بھائی پیچھے پنجاب میں آباد تھے اور انگریز جنگ میں جاپانیوں کے خلاف فتح کامل کر چکا تھا اور فوج سے بھاگ کر دشمنوں کے ساتھ مل جانے

والے سپاہیوں کی سزا موت تھی اور ان اسلام پسند فوجیوں کے گھر بار والوں کو پریشان کیا جا سکتا تھا۔ مگر اسلام کا رشتہ اتنا مضبوط رشتہ ہے کہ انگریز رجمنٹوں کے مسلمان فوجیوں نے اپنے انڈونیشی مسلمان بھائیوں پر گولی چلانے کی بجائے انگریز کی فوج کو چھوڑ دیا اور انڈونیشی مسلمان حریت پسندوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ لیکن یہ بعد کی کہانی ہے جو میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ ابھی تو صورت حال یہ تھی کہ انڈونیشیا جاپانیوں کے قبضے میں تھا اور جنگ بڑے زوروں پر لڑی جا رہی تھی۔ جکارتا کی بندرگاہ میں پہنچتے ہی جہاز کا لنگر گرا دیا گیا۔ مجھے بھی اس کے ساتھ ہی چھٹی مل گئی۔ میں نے جہاز پر مزدوری کر کے تھوڑے سے پیسے جمع کر لئے تھے۔ میں بندرگاہ سے باہر نکل آیا۔ یہ علاقہ میرے لئے بالکل نیا تھا۔ میرے سامنے صاف ستھری سڑکیں تھیں جن کے کنارے کہیں سنبل اور کہیں ناریل کے درخت لہرا رہے تھے۔ جاپانیوں کے فوجی ٹرک بھی گذر رہے تھے۔ مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کیونکہ یہ لوگ دوسری یونٹوں کے جاپانی فوجی تھے اور مجھے کہاں پہچان سکتے تھے۔ اب میرا پروگرام کسی ایسے مسلمان پنجابی فیملی کو تلاش کرنا تھا جہاں میں پناہ بھی لے سکوں اور مجھے کوئی کام بھی مل جائے تاکہ جب تک جنگ ختم نہیں ہوتی میں آرام و سکون سے وقت گذار سکوں۔ میں نوجوان تھا۔ جسم مضبوط اور ورزشی تھا۔ رنگ سرخ و سپید تھا اور انڈونیشیا کے رہنے والوں سے مختلف تھا۔ شکل ہی سے پتہ چل جاتا تھا کہ میں پنجاب کے علاقہ سے آیا ہوں۔ بہرحال میں سڑک پر ایک طرف چل پڑا۔ جہاز پر سے بھرپور ناشتہ کر کے چلا تھا۔ موسم گرم تھا اور فضا حبس آلود تھی۔ سڑک پر مقامی لوگوں کے علاوہ جاپانی سپاہی چل پھر رہے تھے۔ کہیں کہیں کسی چوک میں ان کی پوسٹیں بھی تھیں۔ میں وہاں سے کترا کر نکل جاتا۔ اچانک میری نظر ایک بورڈ پر پڑ گئی۔ جس پر پنجاب ہوٹل اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھا تھا۔ ایک بھاری بدن والا پکی عمر کا آدمی کاؤنٹر کے پیچھے کرسی پر بیٹھا رجسٹر سامنے رکھے کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس آ کر سلام کیا اور پنجابی میں کہا مجھے اپنے ہوٹل میں نوکر رکھ لیں میرا اس شہر میں کوئی نہیں ہے۔ ہوٹل کے مالک نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف غور سے دیکھا اور دو تین سیکنڈ دیکھتا ہی رہا۔ پھر اشارے سے

مجھے قریب بلایا اور پنجابی ہی میں پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔ کہاں سے آئے ہو"

میں نے جھوٹی کہانی گھڑ کر سنا دی کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ مولمین میں رہتا تھا۔ جاپانیوں نے حملہ کر کے میرے ماں باپ کو ہلاک کر دیا۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر ایک جہاز میں سوار ہو گیا جس نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔ ہوٹل کے مالک کا نام عبدالرحیم تھا۔ اس کا تعلق گجرات شہر سے تھا اور وہ ایک عرصے سے انڈونیشیا میں مقیم تھا۔ کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا پھر بولا ٹھیک ہے۔ بیس روپے تنخواہ۔ روٹی ناشتہ مفت ملے گا۔ رات کو سونے کی جگہ مل جائے گی۔ منظور ہے؟ میں نے فوراً کہا۔ منظور ہے جناب ___ ہوٹل کے اندر کچھ گاہک بیٹھے چائے، کافی وغیرہ پی رہے تھے۔ ایک طرف سے زینہ اوپر کے کمروں کو جاتا تھا۔ یہ بالکل معمولی سا ہوٹل تھا۔ جس طرح ہمارے ہاں چھوٹے شہروں کے ریلوے سٹیشنوں کے سامنے ہوا کرتے ہیں۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں پڑھ لکھ سکتا ہوں۔ عبدالرحیم نے کاؤنٹر پر سے ایک کاپی اٹھا کر دی اور بولا "اس میں جتنے بل رکھے ہیں ان کی رقمیں الگ کاغذ پر اتار دو" میں وہیں ایک طرف کرسی پر بیٹھ کر کام میں لگ گیا۔ عین اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک جاپانی سپاہی کندھے پر رائفل لٹکائے ہوٹل کی طرف چلا آ رہا ہے۔

میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

☆......☆......☆

میرے دماغ میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ میری تلاش میں ہی ادھر آ رہا ہے۔ عین اس وقت سڑک پر فوجی ٹرک گزرنے لگے اور جاپانی سپاہی اس کی اوٹ میں آ گیا۔ وہ سڑک کی دوسری طرف رک گیا تھا۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے ہوٹل کے مالک رحیم صاحب سے کہا کہ جاپانی سپاہی ادھر آ رہا ہے۔ رحیم صاحب نے سڑک پر سے گزرتے فوجی ٹرکوں کی طرف دیکھا اور بولے۔

"اوپر والی منزل میں چلے جاؤ۔ جلدی کرو۔ میں سنبھال لوں گا"

انہوں نے شاید دو ٹرکوں کے درمیان سے جاپانی سپاہی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ میں زینے کی طرف بھاگا اور دوسری منزل والے کمرے میں جا کر چھپ گیا۔ اس کے بعد مجھے نہیں پتہ نیچے کیا ہوا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد رحیم صاحب خود اوپر والے کمرے میں آئے اور دروازہ بند کر کے لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر بولے۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ تم جاپانیوں کی قید سے بھاگے ہوئے خطرناک باغی ہو"؟

تب میں نے رحیم صاحب کو ساری کہانی بیان کر دی اور کہا کہ میں نے تو محض ڈر کے مارے اصل حقیقت بیان نہیں کی تھی۔ رحیم صاحب نے کہا۔

"تم برما کے پی ڈبلیو کیمپ سے اتنی دور آ گئے ہو کہ اصولی طور پر جاپانیوں کو یہاں تک تمہارے بارے میں اطلاع نہیں کرنی چاہیے تھی مگر جاپانی تمہیں تخریب کار سمجھتے ہیں۔ تم رنگون میں کسی اخبار کے دفتر میں بھی ملازم تھے؟"

"جی ہاں: میں نے کہا۔" مگر وہاں میں پروف ریڈر تھا اور میرا تخریب کاروں سے کوئی واسطہ نہیں ہے سر!

رحیم صاحب کچھ دیر چپ رہے۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"کچھ بھی ہو۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ تم میرے صوبے کے ہو۔ پنجابی لڑکے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ جاپانی تمہیں پکڑ کر لے جائیں اور پھر کسی فوجی کیمپ میں تمہیں گولی سے اڑا دیا جائے"۔

یہاں میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ میں قیام پاکستان سے پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کا کوئی شہر کوئی بڑا قصبہ ایسا نہ تھا جہاں پنجاب کے لوگ کاروبار یا نوکریوں کے سلسلے میں نہ پہنچے ہوئے ہوں۔ ملایا، سنگاپور اور انڈونیشیا کی ٹریفک پولیس میں تو جہلم، گجرات، گوجر خان، چکوال اور میانوالی کے ہزاروں جوان بھرتی ہو کر شہروں کا نظم و نسق سنبھالے ہوئے تھے۔ قد کاٹھ میں بڑے ہونے اور دلیر ہونے کی وجہ سے برصغیر اور جنوبی ملکوں کے شہروں میں لوگ ان سے بہت گھبراتے تھے۔ کسی جگہ لڑائی ہو رہی ہو اور کوئی پنجابی یا پٹھان وہاں آ جاتا تو لڑنے والے لڑائی چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ ایسے کئی منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ سخت جان اور مہم پسند ہونے کی وجہ سے پنجابی اپنے صوبے سے نکل کر دور دراز سمندر پار کے شہروں میں پھیل گئے تھے۔ اور ان ممالک میں زبردست بزنس کرتے تھے۔ اپنے صوبے میں وہ ایک دوسرے کے دشمن بھی ہو جاتے مگر سمندر پار ایک دوسرے سے مل کر بڑے خوش ہوتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نوعمری کے زمانے میں ایک روز شلوار قمیض پہنے پینانگ کی ایک سڑک پر جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک بزرگ لپک کر میری طرف آئے

اور مجھ سے بغل گیر ہونے کے بعد گلوگیر آواز میں بولے۔

"کاکا! گجراتوں آیاں کہ لاہوروں؟"

چنانچہ پنجاب ہوٹل کے مالک رحیم صاحب نے جو مجھے تحفظ دے کر خطرہ مول لیا تھا اس میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔ قیام پاکستان کے بعد کے تو اس جذبے نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا۔ اب کسی دوسرے ملک میں کوئی پنجابی، سندھی، بلوچی یا پٹھان ملتے ہیں تو اپنے پاکستانی اور مسلمان ہونے پر فخر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو یوں بے تابی سے گلے لگاتے ہیں جیسے کوئی مدتوں سے بچھڑا ہوا بھائی مل گیا ہو۔ اسکا بھی مجھے تجربہ ہو چکا ہے۔ میں ایک بار نیویارک کے ایک ریستوران میں بیٹھا کافی پی رہا تھا کہ ایک صاحب دوسری میز سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور جھک کر پوچھا۔

"آپ پاکستانی تو نہیں؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "جی۔ میں پاکستانی ہوں"

وہ ہنس کر بولے۔ "تو پھر بیٹھے کیوں ہیں۔ گلے ملیئے"

انہوں نے ایک بار بھی یہ نہیں پوچھا کہ میرا تعلق کس صوبے سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے وطن کی قدر پردیس میں جا کر ہوتی ہے۔ کتنا فراخ دل اور مہمان نواز ہے میرا وطن پاکستان کہ اگر گاڑی چھوٹ گئی ہے اور شہر میں کوئی جاننے والا نہیں اور ہوٹل میں کمرہ لینے کے لئے پیسے بھی نہیں تو آرام سے ریلوے پلیٹ فارم کے کسی بنچ پر سو کر رات گزار سکتا ہوں۔ آپ مجھے نیویارک یا واشنگٹن کے ریلوے سٹیشن پر سو کر دکھائیں۔ سیکورٹی گارڈ ڈنڈا لے کر آ جائے گا اور آپ کے خواب خرگوش کو گردن سے پکڑ کر سٹیشن سے باہر پھینک دے گا۔

خدا کے لئے کبھی اپنے وطن پاکستان کی نعمتوں پر بھی غور کر لیا کریں۔ بہرحال یہ تو آپس کی باتیں تھیں اب میں واپس اپنی کہانی کی طرف آتا ہوں۔ رحیم صاحب نے بتایا کہ جاپانی سپاہی میری ہی تلاش میں آیا تھا اور اس کے پاس میری ایک فوٹو بھی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی رہی کہ

جاپانی سپاہی نے مجھے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ دراصل میرا رنگون کے اخبار میں ملازمت کرنا اور کمامیٹ میں سیاسی لوگوں کی کوٹھی میں میرے قیام نے جاپانیوں کو یقین دلا دیا تھا کہ میں کوئی خطرناک جاسوس اور تخریب کار ہوں۔ اور وہ میری تلاش کا سلسلہ رنگون سے جکارتہ تک پہنچ گیا تھا۔ میں پریشان ضرور ہوا کہ اتنی دور آ کر بھی مجھے چین نہیں مل سکا لیکن رحیم صاحب نے میرے تحفظ کا جو ذمہ لے لیا تھا اس نے وقتی طور پر میری پریشانی دور کر دی تھی۔ رحیم صاحب کہنے لگے۔

''برخوردار! اب تمہارا میرے ہوٹل میں کام کرنا ٹھیک نہیں۔''

میں نے فکرمندی سے سوال کیا۔ ''تو میں کہاں جاؤں سر''؟

یہاں تو مجھے کوئی بھی نہیں جانتا''۔ رحیم صاحب کرسی سے اٹھے اور کہا۔

''تم ابھی اسی کمرے میں رہو۔ نیچے مت آنا میں باہر سے تالا لگا رہا ہوں۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔''

میں رات کے دس گیارہ بجے تک اسی کمرے میں بند رہا۔ رحیم صاحب ایک بار آ کر مجھے کھانا دے گئے تھے۔ اس ہوٹل میں دو چار ہی نوکر تھے اور ابھی وہ میری شکل سے پوری طرح واقف نہیں ہوئے تھے۔ رات کو جب رحیم صاحب نے ہوٹل بند کیا تو مجھے پچھلے زینے سے ایک تنگ گلی میں لے آئے۔ اس گلی کے باہر ایک اوپر سے بند سویلین پرانی جیپ کھڑی تھی۔ یہ ان کی اپنی جیپ تھی۔ میں رحیم صاحب کے ساتھ آگے بیٹھ گیا اور جیپ جکارتہ شہر کے نسبتاً بے رونق بازاروں سے گزرتی شہر کے باہر ایک جگہ تالاب کے پاس جا کر درختوں میں رک گئی۔ یہاں دو آدمی پہلے سے، منہ، سر لپیٹے پرانے ٹائپ کی فوجی جیپ لئے ہمارے انتظار میں تھے۔ رحیم صاحب نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔ ''یہ لوگ تمہیں محفوظ جگہ پر لے جائیں گے جب حالات ٹھیک ہوئے تو میں تمہیں جکارتہ واپس بلا لوں گا۔''

انہوں نے مجھے ان دو آدمیوں کے حوالے کر دیا جن کی شکل صورت مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ انہوں نے کاندھوں پر برین گنیں لٹکا رکھی تھیں۔ میں ان کے درمیان گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اور

گاڑی شہر کے مضافات سے نکل کر جنگلی علاقے میں داخل ہو گئی۔ مختصراً یہ کہ مجھے گھنے جنگل میں ایک جگہ بنے ہوئے بانس کے مکان میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں گاڑی کے رکتے ہی ایک ٹھگنے قد کا آدمی ہاتھ میں لمبا چھرا لئے اندھیرے میں سے نکل آیا۔ یہ لوگ انگریزی اور ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ بانس کا مکان لکڑی کے ایک زمین سے اونچے تختے پر بنا تھا۔ اس میں دو کوٹھڑیاں تھیں۔ ایک کوٹھڑی میں چارپائی پر بستر بچھا تھا اور مچھر دانی بھی لگی تھی جو اس علاقے میں ایک نعمت تھی کیونکہ وہاں ایسے دلیر مچھر ہوتے تھے کہ جو تیز آندھی میں بھی دشمن پر وار کر دیتے تھے اور اڑتے نہیں تھے۔ مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ مجھے وہاں رہتے تین دن گزر گئے۔ اس دوران ایک گونگا بوڑھا نوکر مجھے آ کر کھانا چائے وغیرہ دے جاتا۔ دن کے وقت مجھے جنگل میں ایک خاص حد سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں تو تنگ آ گیا۔ یہ تو ایک طرح سے جاپانیوں ہی کا قیدی کیمپ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مجھے قید کرنے والے میرے دشمن نہیں تھے۔ تیسرے دن کی بات ہے۔ میں شروع رات میں مچھر دانی کے اندر لیٹا مچھروں کی غصیلی آوازیں سن رہا تھا جو مچھر دانی کے اندر آنے کو بے تاب تھے کہ اچانک فائر کی آواز آئی۔ یہ آواز جنگل میں دور سے آئی تھی۔ دوسرے لمحے گونگا باورچی بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور مجھے کلائی سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ پھر اس نے مجھے زبردستی ایک گنجان درخت پر چڑھا دیا اور اشاروں سے کہا کہ میں چھپ جاؤں۔ اتنا میں سمجھ گیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے اور شاید جاپانی میری تلاش میں وہاں پہنچ گئے ہیں۔ میں درختوں کی گھنی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں سارا جنگل تھری ناٹ تھری اور برین گنوں کی فائرنگ سے گونج اٹھا۔ میں نے گونگے باورچی کو دیکھا۔ وہ اس باڑے میں چھپ گیا جہاں گائے بندھی رہتی تھی اور جس کے باہر بانس کے ساتھ ایک لالٹین جل رہی تھی۔ ایک گولی لالٹین کو لگی اور وہ چکنا چور ہو گئی۔ اچانک درختوں میں سے تین فوجی جیپیں نکلیں جن کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ اس میں کتنے ہی جاپانی سپاہی سوار تھے۔ وہ چھلانگیں لگا کر اترے اور ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ہوئے انہوں

نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ دو جاپانی ٹارچ روشن کر کے اپنے افسر کے ساتھ کسی کو تلاش کرنے لگے۔ میرے خیال میں وہ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میں درخت پر سانس روکے بیٹھا تھا۔ جاپانی بانس کے مکان میں گھس گئے۔ وہاں سے نکلے تو جاپانی افسر نے باڑے کی طرف اشارہ کیا۔ دو سپاہی باڑے کی طرف بھاگے اور اندر سے گونگے انڈونیشی باورچی کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے اور جاپانی افسر کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ جاپانی افسر نے بے چارے بوڑھے باورچی پر تھپیڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ باورچی غوں غاں کرتا رہا۔ انہوں نے ایک بار پھر ساری جگہ کی تلاشی لی۔ جب انہیں اور کچھ نہ ملا تو بوڑھے باورچی کو اپنے ساتھ پکڑ کر لے گئے۔ جب تک جاپانی فوجی جیپوں کی آوازیں جنگل میں بالکل غائب نہیں ہوئیں میں درخت پر ہی بیٹھا رہا۔ جنگل میں ایک بار پھر ہو کا عالم طاری ہو گیا۔ ہر طرف اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں درخت سے اتر آیا۔ سامنے بانس کی کوٹھڑی میں جانے کی بجائے میں باڑے کے پاس ہی ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ جنگل میں ہیبت ناک سناٹا تھا۔ اتنے میں مجھے جھاڑیوں میں کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ میں نے سانس روک لیا۔ پھر کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ وہ انگریزی میں کہہ رہی تھی۔

"جاپانی چلے گئے ہیں"

میں اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تین انسانی سائے درختوں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ کسی نے ٹارچ روشن کر دی۔ اسی لڑکی نے پکار کر ٹوٹی ہوئی اردو میں کہا۔ ہم تمہارے دوست ہیں۔ اگر تمہیں رحیم نے بھیجا ہے اور تم یہاں ہو تو سامنے آ جاؤ۔"

میں وہیں چپکا بیٹھا رہا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں یہ بھی کوئی چال نہ ہو۔ کہیں یہ لوگ بھی جاپانیوں کے ایجنٹ نہ ہوں۔

☆......☆......☆

اس لڑکی نے چھاپہ مار گوریلوں کی وردی پہن رکھی تھی۔ اس کے دونوں ساتھی بھی اسی لباس میں تھے۔ لڑکی جھاڑیوں سے نکل کر بانس کے مکان کے سامنے آ گئی تھی۔ اس کے ایک ساتھی کے ہاتھ میں ٹارچ روشن تھی۔ اس کی دھندلی روشنی میں مجھے لڑکی کے کٹے ہوئے سیاہ بال نظر آ رہے تھے جو اس کی گوریلا کیپ سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ میں ابھی تک چھپا تھا۔ جب گوریلا لڑکی نے پنجاب ہوٹل والے رحیم صاحب کا نام لیا تو میں باہر نکل آیا۔ لڑکی میرے قریب آ گئی۔ وہ نوجوان لڑکی تھی۔ چہرہ ایسا ہی جیسا انڈونیشیا اور ملایا کی لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ مگر اس کی آنکھوں میں بڑی تیز چمک تھی۔ اس نے اردو میں مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا ان میں سے ایک گوریلا پنجابی تھا۔ اسکا تعلق انگریز فوج کی ایک پنجاب رجمنٹ سے تھا جو اپنے انڈونیشی مسلمان بھائیوں پر گولی چلانے کی بجائے انگریز کی فوج چھوڑ کر ان مسلمان انڈونیشی ولندیزیوں کے خلاف اور اب جاپانیوں کے خلاف چھاپہ مار جنگ کر رہے تھے۔ جب تک جاپانیوں کا یہاں قبضہ نہیں ہوا تھا تو انڈونیشی گوریلوں میں آن شامل ہوا تھا، جو اپنے وطن کی آزادی کے لئے حریت پسند سوئیکارنو کی قیادت میں ڈچ آمریت کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ جاپانی آ گئے تو انگریزی فوج ولندیزیوں کے ساتھ وہاں سے بھاگ گئی۔ اب یہ آزادی کے متوالے گوریلے اپنے وطن

کو جاپانی استبداد سے پاک کرنے کے لئے خفیہ جدوجہد کر رہے تھے۔ کیونکہ جاپانی بھی ان حریت پسند گوریلوں کو ختم کرنے کے درپے تھے اور ان کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے جنگلوں میں دور دور تک بمباری کرتے تھے۔ اس پنجابی لانس نائیک کا نام اللہ داد تھا۔ اس نے مجھ سے پنجابی میں کچھ باتیں کیں۔ اس کے بعد گوریلا لڑکی نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور کہنے لگی۔ میرا نام عائشہ ہے میں اس علاقے کے گوریلا آپریشن کی انچارج ہوں۔ تم ہمارے ساتھ آؤ۔ کیونکہ صرف ہمارے پاس ہی تم محفوظ رہو گے۔ رحیم صاحب نے ہمیں تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس سارے علاقے پر جاپانیوں کا قبضہ ہے اور تمہاری تلاش میں ہیں۔" میں نے اسے بتایا کہ میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں نہ ہی میرا کبھی کسی باغی گروپ سے تعلق رہا ہے۔ عائشہ نے کہا۔ رنگون میں تم کسی اخبار کے دفتر میں کام کرتے رہے ہو اور وہاں تمہارا قیام کسی سیاسی شخصیت کے ہاں بھی تھا۔ اور تم تین مرتبہ جاپانیوں کی قید سے فرار بھی ہو چکے ہو۔ جاپانی انٹیلی جنس کے نزدیک تمہارے پاس کچھ ایسے راز ہیں جن کے پتہ چل جانے سے جاپانیوں کے لئے کلکتے پر قبضہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ میں تو حیرانی کے ساتھ اس گوریلا لڑکی کی باتیں ہی سنتا رہا۔ مطلب یہ تھا کہ اب مجھے ان گوریلوں کے ساتھ انڈونیشیا کے جنگلوں میں اس وقت تک دربدر مارا مارا پھرنا تھا جب تک جنگ ختم نہیں ہو جاتی اور میرے لئے اپنے وطن جانے کی راہ نہیں کھل جاتی۔ میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجھے ان لوگوں میں شامل ہونا پڑا۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہاں جاپانی جیپوں میں سوار ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے بڑی گولیاں چلائیں۔ اور گونگے نوکر کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ عائشہ نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" وہ اپنے ساتھیوں سے انگریزی میں ہی بات کرتی تھی۔ اگرچہ ان میں ایک آدمی انڈونیشی تھا۔ یہ سب مسلمان تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ جنگل میں ایک ایسی جگہ پر لے آئے جہاں ان کی ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس جیپ کو درختوں کی جھاڑیاں لگا کر کیموفلاج کر دیا گیا تھا۔ مختصر یہ کہ میں ان حریت پسند گوریلوں کے خفیہ ٹھکانے پر آ گیا جو جنگل میں ایک ایسی جگہ پر واقع تھا جس کی ایک جانب

سمندر تھا۔ سمندر کو دیکھ کر میرا دل بڑا خوش ہوا۔ اگرچہ میں جاپانیوں کی قید سے دور ہو گیا تھا مگر ایک طرح سے ان گوریلوں کے درمیان قید کر دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں فطرتاً مہم پسند ہوں اور میری یہی مہم پسندی اور خانہ بدوشی کا شوق مجھے اس عمر میں بھی اپنے گھر سے بھگا کر ان دور دراز اجنبی ملکوں میں لے آیا تھا۔ میرے کوئی سیاسی عزائم بھی نہیں تھے۔ سیاست کی باتیں نہ آج میری سمجھ میں آتی ہیں اور نہ اس وقت میری سمجھ میں آتی تھیں۔ مجھے جنگل، دریا، پہاڑ، جنوب مشرقی ایشیا کی موسلا دھار بارشیں، جھیلوں میں کھلے ہوئے کنول کے پھول، معبدوں میں مذہبی رقص کرتی دیو داسیاں اور اندھیری راتوں کی بارش میں کسی بانس کی جھونپڑی میں بیٹھ کر چائے پینے کا شوق اس طرف لے آیا تھا۔ آمریت، استبداد اور سامراجیت ایسے موٹے موٹے لفظ میری سمجھ سے باہر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حریت پسند گوریلوں کے خفیہ ٹھکانے میں ہر قسم کی سہولت کے باوجود میرا جی وہاں گھبرانے لگا کسی وقت میں اکیلا سمندر کے کنارے نکل جاتا اور حد نگاہ تک پھیلے ہوئے وسیع سمندر کو تکتا رہتا۔ جی میں آتا کسی کشتی میں بیٹھ کر انجانے گمنام جزیروں کو نکل جاؤں اور پھر کبھی واپس نہ آؤں۔ میں نے جنوبی سمندروں کے بحری ڈاکوؤں کی بڑی کہانیاں پڑھی تھیں اور اس زمانے میں میری بڑی خواہش تھی کہ میں بھی بحری قزاقوں کے کسی جہاز میں بھرتی ہو جاؤں اور ٹارزن کی طرح رسے کو پکڑ کر خنجر دانتوں میں دبائے ایک جہاز سے دوسرے جہاز میں چھلانگ لگاؤں۔ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ اگرچہ ان جنوبی سمندروں کو بحری ڈاکوؤں سے پاک کر دیا گیا ہے لیکن کہیں کہیں بحری قزاقوں کے بادبانی جہاز اب بھی دیکھے جاتے ہیں جو سمندری شاہراہوں پر کسی نہ کسی تجارتی جہاز کو لوٹ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ میں بحری ڈاکو تو کہاں بنتا مگر مجھے ان ڈاکوؤں کو دیکھنے کا بچپن ہی سے بڑا شوق تھا۔

اس جنگل والے خفیہ ٹھکانے میں کئی گوریلے آتے اور اسلحہ لے کر چلے جاتے۔ گوریلا لڑکی عائشہ بھی گوریلا آپریشن کے سلسلے میں اکثر غائب رہتی تھی۔ انگریزی فوج کا لانس نائیک اللہ داد سے پنجابی ہونے کے ناطے بڑی باتیں ہوا کرتیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک سال سے ان

انڈونیشی حریت پسندوں کے ساتھ ہے اور اس نے کئی معرکوں میں حصہ لیا ہے۔ اب وہ زیادہ تر اس خفیہ اڈے پر ہی رہتا جہاں اسلحے کا بھاری ذخیرہ ڈمپ کر کے رکھا گیا تھا۔ یہ لانس نائیک بڑا پرہیز گار اور عبادت گذار آدمی تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد وظیفے کا ورد بھی کرتا تھا۔ وہ کھانا بھی بڑا اچھا بنا لیتا تھا۔ مرطوب موسم ہونے کی وجہ سے چائے وہاں دن بھر چلتی تھی۔ ایک دن میں اس کے ساتھ بانس کے ایک جنگل میں گھوم رہا تھا۔ یہاں سینکڑوں قسم کے استوائی پیڑ پودے اگے ہوئے تھے۔ مجھے بائیں جانب سنبل کے چھ سات بڑے گھنے درخت نظر آئے۔ یہ درخت ساتھ ساتھ قطار میں اُگے تھے اور ان کی ٹہنیوں پر سرخ پھول کھل رہے تھے۔ میں ان درختوں کی طرف جانے لگا تو اللہ داد نے مجھے روک دیا۔

''ادھر مت جانا۔ وہاں ایک چڑیل رہتی ہے۔''

میں نے بڑے شوق سے پوچھا۔ کیا تم نے اس چڑیل کو دیکھا ہے؟''

''ہاں'' اللہ داد بولا۔ ''میں نے اسے پہلی دفعہ ایک خوبصورت لڑکی کی شکل میں دیکھا تھا جس نے دلہنوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ میرے شوق میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ مجھے بچپن ہی سے اس قسم کی پراسرار باتوں سے بڑی دلچسپی رہی ہے میں نے اللہ داد سے کہا۔ مجھے بتاؤ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ وہ مجھے واپس اڈے پر لے آیا۔ یہاں اس نے چائے بنائی اور چائے سے بھرا ہوا تام چینی کا مگ ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔

''اس روز موسم بڑا خوشگوار تھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں یہاں اکیلا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد میں یونہی سیر کرتا اس جنگل میں آ گیا۔ جب سنبل کے درختوں کے پاس پہنچا تو مجھے ایسی آواز آئی جیسے کوئی عورت پاؤں میں جھانجھریں پہنے چل رہی ہو۔ میں نے غور کیا تو یہ آواز سنبل کے درختوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں سمجھا کہ کوئی دیہاتی عورت ہو گی۔ مگر یہاں کی دیہاتی عورتیں پاؤں میں جھانجھریں خاص خاص موقعوں پر ہی پہنتی ہیں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ درختوں کے پیچھے سے ایک نہایت خوبرو لڑکی دلہن بنی سر

پر چاندی کا تاج رکھے۔ ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی تھامے چھن چھن کرتی نکل آئی ہے۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایسی خوبصورت لڑکی میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اچانک اس نے میرا نام لے کر مجھے بلایا۔ خدا جانے وہ کونسی طاقت تھی جو مجھے ایک پل کے لئے کھینچتی ہوئی اس کی طرف لے گئی۔ چار چھ قدم ہی چلا ہوں گا کہ ایکدم رک گیا۔ یہ دیکھ کر ایک بار مجھے خوف کے مارے پسینہ آ گیا کہ اس خوبصورت دلہن کے دونوں پاؤں الٹے تھے۔ میں نے بچپن میں سن رکھا تھا کہ چڑیلوں کے پاؤں الٹے ہوتے ہیں۔ میں نے فوراً ایک خاص چیز پڑھنی شروع کر دی۔ میں وہیں کھڑے کھڑے منہ میں پڑھ بھی رہا تھا اور لڑکی کی طرف پھونکیں بھی مارتا جا رہا تھا۔ اچانک اس لڑکی کا چہرہ بگڑنے لگا پھر اسکا چہرہ جو بے حد خوبصورت تھا اتنا ڈراؤنا ہو گیا کہ میں بھی ڈر گیا۔ وہ چیخیں مارتی ان درختوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔ اب جب کبھی میں اس طرف آتا ہوں تو دل میں وظیفہ پڑھ رہا ہوتا ہوں اور احتیاطاً ان درختوں کی طرف نہیں جاتا۔ اللہ داد کہانی سنانے کے بعد چائے پینے لگا۔ میری عقل ابھی پختہ نہیں ہوئی تھی۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب لگی کہ ایک دلہن بنی خوش شکل عورت پھونک مارنے سے چڑیل بن گئی۔ میں نے اللہ داد سے پوچھا۔ ''بھائی! آپ کو پھونک نہیں مارنی چاہئے تھی'' اللہ داد بولا۔ ''مگر وہ عورت کہاں تھی۔ وہ تو چڑیل تھی''

میرے منہ سے نکل گیا۔ ''کیا پتہ آپ کے پھونک مارنے سے چڑیل بن گئی ہو۔'' اس پر اللہ داد نے مجھے بہت ڈانٹا اور کہا۔ خبردار ایسی بات پھر نہ کہنا۔ چڑیلیں جنگلوں میں ایسے ہی روپ دھار کر سامنے آیا کرتی ہیں۔ ''اگر میں پھونک نہ مارتا تو وہ مجھے کھا جاتی۔''

تب میری عمر زیادہ نہیں تھی۔ لاعلمی کا زمانہ تھا۔ مجھے بڑا شوق رہتا تھا کہ کوئی جن بھوت ملے۔ کسی چڑیل سے ملاقات ہو اور میں اسے دیکھوں کہ وہ کیسی ہوتی ہے۔ جب بڑا ہوا۔ ذرا عقل آئی تو کئی چڑیلوں کو دیکھنے کا موقع ملا مگر وہ سب ایسی تھیں کہ جنہیں پھونک مار کر عورتیں بنا دیا گیا تھا۔ کسی چڑیل کو اصلی روپ میں دیکھنے کی حسرت ہی رہی۔ بہرحال میں دن میں کسی وقت لانس نائیک صاحب کی نظر بچا کر جنگل میں نکل جاتا اور اور سنبل کے درختوں کے آس پاس پھرتا رہتا۔ اس

امید میں کہ شاید وہ چڑیل کہیں نظر آ جائے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ میرے دل کی دل میں ہی رہی۔ اب میرا دل وہاں اچاٹ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ وہاں سے کسی طرف فرار ہو جاؤں مگر وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ میرے لئے یہ ایک ایسی جیل تھی کہ جس کی کوئی دیوار نہیں تھی لیکن وہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ آخر قسمت نے میرا ساتھ دیا اور ایک موقع مل گیا۔

ایک رات میں ابھی سویا نہیں تھا۔ اس روز کچھ اور چھاپہ مار بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ جنگل میں گہری خاموشی تھی۔ اللہ داد اور دوسرے گوریلے ایک طرف بیٹھے آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں سمندر کی طرف سے کسی لانچ کی وسل کی آواز آئی۔ وہ اٹھ کر اس طرف چلے گئے۔ میں بھی اٹھ بیٹھا۔ اور ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک کافی بڑی موٹر لانچ ساحل پر آن لگی۔ یہ لوگ اس میں سے لکڑی کی پیٹیاں اتارنے لگے۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ موٹر لانچ وہاں سے دور سمندر میں واقع کسی جزیرے سے ان لوگوں کے لئے اسلحہ لے کر آتی ہے۔ میرے لئے وہاں سے نکل بھاگنے کا یہ ایک سنہری موقع تھا۔ لانچ کے سامنے کی جانب بڑا سا تختہ ڈال دیا گیا تھا جس پر سے اسلحے کی پیٹیاں اتاری جا رہی تھیں۔ لانچ کے پہلو کی طرف رسے کی ایک سیڑھی بھی لٹک رہی تھیا۔ اس طرف چاند کی روشنی نہیں تھی۔ میں چپکے سے سمندر میں اتر گیا اور تیرتا ہوا سیڑھی تک جا پہنچا۔ پھر اس کے ذریعے لانچ کے ڈیک پر پہنچ گیا۔ سب لوگ مال اتارنے میں لگے تھے۔ میں دوڑ کر لانچ کی پچھلی طرف جہاں رسوں کے بڑے بڑے گچھے اور چھ سات پرانے ٹائر پڑے تھے جا کر چھپ گیا۔ جب سارا مال اتار دیا گیا تو لانچ ساحل سے پیچھے ہٹی اور پھر ایک چکر لگا کر سمندر میں اس جزیرے کی طرف چل پڑی جہاں میرے خیال میں میرے لئے آزادی اور ایڈونچر تھا۔

☆......☆......☆

انڈونیشیا میں اتنے چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں کہ آپ انہیں گننا شروع کریں تو تھک جائیں گے۔ ان میں آباد جزیرے بھی ہیں اور غیر آباد بھی۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو آتش فشاں پہاڑوں کے پھٹنے سے بن گئے ہیں اور جہاں ہر لمحے کسی نہ کسی آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ اس وجہ سے ان جزیروں پر لوگ باقاعدہ گھر بنا کر نہیں رہتے بلکہ اردگرد کے جزیروں سے ہفتے میں ایک دو بار آتے ہیں اور اپنی پسند کے درخت وغیرہ کاٹ کر لے جاتے ہیں۔ لیکن میں سمگلروں کے سٹیمر یعنی بڑی لانچ کے ذریعے جس جزیرے پر پہنچا وہاں جرائم پیشہ لوگوں کا راج تھا۔ سٹیمر کھلے سمندر میں دو گھنٹے سفر کرنے کے بعد اس جزیرے پر پہنچ گئی۔ ایک تو رات کا وقت تھا۔ میں عرشے پر رسوں اور پرانے ٹائروں میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ سٹیمر کے سمگلر گوریلوں کو اسلحہ فروخت کر کے آئے تھے۔ چنانچہ وہ کسی کیبن میں بیٹھے کھانے پینے میں مصروف تھے۔ میں بڑا خوش ہو رہا تھا کہ گوریلا چھاپہ ماروں کی محبت بھری قید سے چھٹکارا ملا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ کبھی وہاں سے نکلنے کا خطرہ مول نہ لیتا۔ لیکن میری آزاد اور ایڈونچر طبیعت کا وہاں گذارہ ناممکن تھا اور مجھے یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔ خطرہ بھی کیسا۔ بلکہ میں تو اس خیال سے سمگلروں کے سٹیمر میں سوار ہو گیا تھا کہ شاید کسی جزیرے میں بحری ڈاکوؤں کو دیکھنے کا موقع مل

جائے۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ جن لوگوں نے سمندر پر چاند چمکتے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ منظر کتنا دلفریب ہوتا ہے۔ سمندر کی موجیں چاند کی کشش کے باعث یوں اوپر اٹھ رہی ہوتی ہیں جیسے چاند سے ملنے کو بے تاب ہوں۔ اس وجہ سے سٹیمر بھی ڈول رہا تھا۔

اتنے میں دو چھوٹے قد کے ملائی سمگلر عرشے پر نمودار ہوئے۔ وہ سٹیمر کے سامنے کی جانب جہاں سٹیمر کے دونوں پہلو آ کر ملتے تھے کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے ٹارچ کو بار بار ہلا کر دور جزیرے کے ساحل پر اپنے خاص لوگوں کو سگنل دیئے اور پھر ایک دوسرے سے فس فس کر باتیں کرتے نیچے چلے گئے۔ میں اپنی جگہ سے نکل کر عرشے کے سامنے جنگلے کے پاس آیا۔ کوئی جزیرہ قریب آ رہا تھا جس میں کالے کالے سیاہ پہاڑ ابھرے ہوئے تھے۔ ان کے دامن میں کہیں کہیں روشنی جھلملا رہی تھی۔ یہ ملائی سمگلر بڑے خونخوار قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور آدمی کو مار ڈالنا ان کے لئے ایسے ہی ہوتا ہے جیسے ہم مچھر یا مکھی مار ڈالتے ہیں۔ سٹیمر جزیرے کے ساحل سے کچھ دور گہرے پانیوں میں رک گیا۔ یا تو ساحل کے قریب پانی کم گہرا تھا اور یا وہاں پانی کے نیچے نوکیلے پتھروں والی چٹانیں تھیں کہ سٹیمر آگے نہیں گیا تھا۔ کوئی سمگلر ملاح ڈیک پر نہیں آیا تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ سٹیمر کی دوسری منزل کا بھی ایک گیلری نما ڈیک یعنی عرشہ تھا اور اس عرشے پر سے تختہ ایک بڑی کشتی کے ساتھ لگا دیا گیا تھا جو ساحل سے آئی تھی۔ یہ لوگ کشتی میں بیٹھ کر ساحل کی طرف چلے گئے، جو وہاں سے بمشکل ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ جب سٹیمر پر گہری خاموشی چھا گئی تو میں نے اوپر والے ڈیک کے جنگلے سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ تختہ نچلے ڈیک کی گیلری میں کھینچ لیا گیا تھا۔ وہاں ضرور کوئی نہ کوئی گارڈ موجود ہو گا۔ اب مجھے اس سٹیمر سے نکل کر جزیرے پر پہنچنا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نیچے سے تھائی میوزک کی آواز آنے لگی۔ شاید گارڈ ڈیوٹی والے نے چھوٹا ٹرانسسٹر لگا دیا تھا۔ میں سٹیمر کی دوسری طرف آ کر جائزہ لینے لگا۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ ان لوگوں نے سمندر میں لنگر ڈال رکھا ہے۔ لنگر کی موٹی فولادی زنجیر کے ساتھ لٹک گیا اور آہستہ آہستہ جھولتا ہوا سمندر میں اتر گیا۔ یہاں سے تیرتا ہوا میں کنارے پر آیا اور جھاڑیوں درختوں کے

اندھیرے میں ایک طرف چلنے لگا۔ یہاں جاپانیوں کے علاوہ زہریلے سانپوں کا بھی خطرہ تھا۔ مجھ سے جتنی احتیاط ہو سکتی تھی احتیاط کر رہا تھا۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جزیرہ زیادہ بڑا نہیں ہے اور وہاں صرف ایک ہی اونچی جگہ روشنی جھلملا رہی تھی۔ یہ لوگ اسلحہ کے سمگلر تھے۔ اور یہیں سے گوریلا کمانڈوز کو اسلحہ سپلائی ہوتا تھا۔ یہ گوریلا کمانڈوز وہ اسلحہ جاپانیوں کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ ظاہر ہے جاپانی اس جگہ کی تلاش میں ہوں گے کیونکہ انڈونیشیا کے حریت پسند مسلمان گوریلا ہالینڈ والوں اور انگریزوں کے بعد اب جاپانیوں کا بھی بڑا نقصان کر رہے تھے حالانکہ یہ سارے جزیرے جاپانیوں کے تسلط میں تھے۔ میں اس طرف بڑھا جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ روشنی ایک لالٹین کی تھی جو ایک لمبی بارک کے برآمدے میں ستون کے ساتھ لٹکا دی گئی تھی۔ میں نے ان لوگوں کو دیکھا جو سٹیمر پر اسلحہ لے کر آئے تھے۔ یہ لوگ کھانے پینے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میرا ان لوگوں کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ یہ گوریلا چھاپہ مار نہیں تھے بلکہ اسلحہ سمگل کرنے والے تھے جو مجھے پکڑ کر قید بھی کر سکتے تھے اور مجھے گولی سے بھی اڑا سکتے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ یہ گوریلا لڑکی عائشہ اور لانس نائیک اللہ داد کی واقفیت کو بھی خاطر میں نہ لائیں۔ کیونکہ ان کا اسلحہ کا لاکھوں ڈالر کا کاروبار تھا اور وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے سپلائی کیمپ میں کوئی غیر آدمی آئے۔ جزیرے پر کسی دوسری جگہ کوئی روشنی بھی نظر نہیں آ رہی تھی کہ جس سے مجھے یہ خیال ہوتا کہ وہاں کچھ اور لوگ بھی رہتے ہیں۔ میرا خیال یہ تھا کہ یہاں وہ لوگ ہوں گے جو بحری ڈاکوؤں کا لوٹا ہوا مال خریدنے کے لئے ایک چور بازار سجاتے ہیں اور ڈاکوؤں سے اونے پونے ان کا قیمتی مال خرید لیتے ہیں۔ پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور سمگلروں کی بارک سے ہٹ کر جزیرے کے شمال کی طرف چلنے لگا۔ علاقہ غیر ہموار تھا۔ زمین سخت لاوے کی تھی اور درخت بھی کافی تھے۔ زمین پر گھاس بھی کہیں کہیں بڑی اونچی تھی۔ مجھے سمگلروں کے قہقہوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ چاندنی کی وجہ سے چلنے میں خاص دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ زمین کے تھوڑی سی اونچی جگہ پر ایک چھوٹا سا جھونپڑی نما کیبن بنا ہوا ہے جس میں اندھیرا ہے۔ میں پچھلی طرف سے

ہوتا ہوا کیبن کے برآمدے میں آ گیا۔ کیبن کے دونوں دروازے غائب تھے۔ دھندلی چاندنی میں مجھے اندر ایک طرف لوہے کی جالی دار چارپائی دیوار کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ اس کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔ کیبن کی چھت کا بڑا سا تختہ ایک طرف سے اکھڑا ہوا تھا جہاں سے ہلکی ہلکی چاندنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے چارپائی ڈال دی اور یہ سوچ کر اس پر لیٹ گیا کہ اب دن کی روشنی میں ہی پتہ چلے گا کہ اس جزیرے پر سمگلروں کے علاوہ اور لوگ بھی رہتے ہیں کہ نہیں۔ سمندر کی طرف سے مرطوب ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب دھماکوں سے جزیرے کی فضا گونج رہی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دھماکے ایسے تھے جیسے کوئی بم برسا رہا ہو۔ مگر کسی ہوائی جہاز کی آواز نہیں تھی۔ میں یہ سمجھا کہ سمگلروں کے اسلحہ کے ڈمپ میں آگ لگ گئی ہے اور ان کا گولہ بارود پھٹ رہا ہے۔ زمین دھماکوں سے ہل رہی تھی۔ جس طرف سمگلروں کی بارک تھی اس طرف سے ہر دھماکے کے ساتھ شعلے سے اٹھتے اور آسمان روشن ہو جاتا تھا۔ میں وہیں چارپائی کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔ بہت جلد مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ دھماکے ایک خاص ترتیب سے ہو رہے ہیں۔ جیسے کسی طرف سے گولے آ کر جزیرے میں گر رہے تھے۔ ہر دو سیکنڈ کے بعد ایک گولہ آ کر پھٹتا تھا۔ جزیرہ یوں ہل رہا تھا جیسے زلزلہ آ رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہاں گہری خاموشی چھا گئی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو کر وہاں بیٹھا رہا۔ مجھ میں اٹھ کر کیبن سے باہر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ بمشکل پانچ منٹ گذرے ہوں گے کہ دو تین سٹیمروں کی آوازیں آئیں اور پھر ان سٹیمروں پر سے جزیرے پر سرچ لائٹس کی روشنیاں پھینکی جانے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی خاص قسم کی اونچی اونچی انسانی آوازیں بلند ہونے لگیں جن کو میں بڑی اچھی طرح سے پہچانتا تھا۔ یہ جاپانی سپاہیوں کی آوازیں تھیں۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ جاپانی بحریہ کی کسی یونٹ نے اس جزیرے پر موجود سمگلروں کے اسلحہ ڈپو کو تباہ کرنے کے لئے حملہ کر دیا تھا۔ پہلے چھوٹی توپوں سے وہاں گولہ باری کی اور اب اپنی جنگی کشتیاں لے کر جزیرے پر اتر رہے تھے۔

میں نے سر پکڑ لیا۔ جس مصیبت سے بھاگا تھا اب وہی مصیبت ایک بار پھر میرے سر پر منڈلا رہی تھی۔ بہر حال میں نے اتنی احتیاط ضرور کی کہ میں کیبن سے نکل آیا۔ کیونکہ سمگلروں کو تلاش کرتے ہوئے جاپانی فوجی اس کیبن تک آ سکتے تھے۔ میں پیچھے درختوں میں غائب ہو گیا اور پھر ایک گھنی شاخوں والے درخت میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جزیرے پر آہستہ آہستہ دن کی روشنی پھیلنے لگی۔ درخت پر سے میں نے شاخوں کو ہٹا کر دیکھا تو ساحل سمندر کے قریب جاپانیوں کی تین جنگی کشتیاں کھڑی تھیں اور جاپانی فوجی ایک دوسرے کو پکارتے ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ جزیرے پر جاپانیوں نے قبضہ کر لیا ہے سمگلروں کا اسلحہ بھی تباہ کر دیا ہو گا اور سمگلر یا تو سارے کے سارے مارے گئے ہوں گے یا گرفتار کر لئے گئے ہوں گے اور اب جاپانی واپس چلے جائیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس کی بجائے یہ ہوا کہ میرے دیکھتے دیکھتے دو جاپانی جنگی کشتیاں واپس چلی گئیں اور ایک کشتی اور اس کے سپاہی وہیں جزیرے پر ہی رہ گئے۔ اب مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں عائشہ کے گوریلا کیمپ سے کیوں نکلا۔ میں گڑھے سے نکل کر کنوئیں میں گر گیا تھا۔ جاپانیوں نے جزیرے پر پوسٹیں قائم کر دی تھیں۔ جنگی لانچ میں لگی ہوئی چار توپوں کی نالیاں مجھے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ڈیک پر بھی جاپانی سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ساحل پر ایک جگہ انہوں نے جاپانی جھنڈا بھی چڑھا دیا تھا۔ میں مشکل میں پڑ گیا۔ اب کیا کروں؟ سمگلروں کی لانچ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ گولہ باری سے ڈوب گئی تھی۔ ان کی بارک میں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ چار جاپانی فوجی ٹامی گنیں اٹھائے اس کیبن کی طرف بھی آ گئے جہاں میں نے لوہے کی چارپائی بچھا رکھی تھی۔ جاپانیوں کو وہاں کچھ نہ ملا تو چارپائی اٹھا کر لے گئے۔ میں کافی دیر سے درخت میں چھپا بیٹھا تھک گیا تھا۔ میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ جاپانی فوجیوں کی سرگرمیاں جزیرے پر قبضے کے بعد اس ساحل تک ہی محدود تھیں جہاں سمندر میں ان کی جنگی کشتی کھڑی تھی اور جہاں انہوں نے ایک پوسٹ بھی بنالی تھی۔ ان کا جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ شاید سمگلروں کی بارک کا ایک حصہ گولہ باری سے بچ گیا تھا جہاں جاپانیوں نے اپنا کیمپ بنا لیا تھا۔

تب میں درخت سے اتر آیا۔ کیبن کی طرف جانے کی بجائے میں اس کے پیچھے ایک جگہ جھاڑیوں میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو سمندر میں کود جاؤں اور عقب کی جانب سے سمندر میں تیر کر کسی دوسرے جزیرے تک پہنچنے کی کوشش کروں اور یا پھر اسی جزیرے میں بیٹھ کر جاپانی سپاہیوں کی واپسی کا انتظار کروں۔ یعنی وہ کب جزیرے کو خالی کر کے جاتے ہیں۔ پہلی ترکیب پر عمل کرنا اپنے آپ کو سمندری شارک مچھلیوں کے آگے ڈالنے کے برابر تھا۔ مجھے لامحالہ دوسری ترکیب پر ہی عمل کرنا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ میں بغیر پانی اور خوراک کے زندہ کیسے رہوں گا۔ سمندر کا پانی پی نہیں سکتا تھا۔ درختوں کے پتے اور گھاس بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ مگر رہنا مجھے اسی جگہ پر تھا۔ دوپہر گذری تو بھوک اور پیاس کے مارے برا حال ہونے لگا۔ بھوک کو تو میں کنٹرول کر سکتا تھا مگر پیاس مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں صبر کر کے بیٹھا رہا۔ دوپہر کے بعد جھاڑیوں سے اٹھ کر خالی کیبن میں آ گیا۔ اونچی جگہ ہونے کی وجہ سے وہاں سے مجھے ساحل سمندر پر کھڑی جاپانیوں کی فوجی لانچ صاف نظر آ رہی تھی۔ بارک کی عقبی دیوار بھی تھوڑی سی دکھائی دیتی تھی۔ اسکا آدھا حصہ گولہ باری سے اڑ گیا تھا۔ بھوکا پیاسا بیٹھا رہا۔ تیسرا پہر بھی گذر گیا۔ پھر جزیرے پر شام کا اندھیرا چھانے لگا۔ پیاس کی وجہ سے میری زبان لکڑی کی طرح سخت ہونے لگی تھی۔ میں نے گھاس اور پتوں کو چبا کر ان کی رطوبت سے دل کو تھوڑی تسلی دی۔ گھاس اتنی کڑوی تھی کہ میں اسے کھا نہیں سکتا تھا۔ اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے جب رات ہو گئی تو میں نے ایک فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ بڑا خطرناک تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ بھوک اور پیاس نے مجھے موت کے کنارے پہنچا دیا تھا۔ جب ہر طرف جزیرے پر خاموشی چھا گئی اور ساحل کی طرف سے آتی جاپانیوں کی آوازیں بھی خاموش ہو گئیں تو میں اپنے کیبن سے نکلا اور درختوں جھاڑیوں کی اوٹ لیتا جاپانیوں کے کیمپ والی بارک کی طرف چل پڑا۔ بارک کی دیوار والی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا تھا۔ آسمان پر بادل چھانے لگے تھے جسکی وجہ سے چاندنی غائب ہو گئی تھی۔ میں نے کھڑکی کے اندر جھانک کر دیکھا۔ یہ بارک کا ایک چھوٹا سا سٹور تھا جہاں لکڑی

کے کھوکھوں اور بڑی سی میز پر بوتلیں اور ڈبے پڑے تھے۔ مجھے ڈبل روٹی کی خوشبو بھی آئی اور میں اندر کود گیا۔ یہاں مجھے وہ ساری چیزیں مل گئیں جن کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے ڈبل روٹی کے پیکٹ بسکٹ کے ڈبے۔ آڑو۔ اناناس کے جوس کے ٹن اور ٹھنڈے مشروب کی بوتلیں اور سارڈین مچھلی کے ٹن جلدی جلدی ایک تھیلے میں ڈالے اور اسے کھڑکی سے باہر لڑھکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں خود بھی باہر ڈھلان پر لڑھک گیا۔ جاپانی سپاہی دوسری طرف گارڈ ڈیوٹی پر تھا جس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں سٹور سے کوئی چیز چرائی جا سکتی ہے۔ آدھا راستہ تو میں نے رینگ کر طے کیا پھر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا واپس اپنے کیبن میں آ گیا اور تھیلا کھول کر کھانے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑا۔ ایک چاقو ہر وقت میری جیب میں رہا کرتا تھا۔ اس کی مدد سے میں نے کولڈ ڈرنک کے ڈبوں کو کاٹا اور اوپر تلے چار ڈبے پی گیا۔ پھر ڈبل روٹی کے ساتھ سارڈین مچھلی جو اہال کر ڈبوں میں بند کی ہوئی تھی کھائی۔ جسم کی توانائی واپس آ گئی۔ اب میں زیادہ روشن دماغی سے وہاں سے کسی رات نکل جانے کی ترکیب پر غور کرنے لگا۔ میں نے باقی کی کھانے پینے کی چیزیں کیبن سے باہر پیچھے کی طرف ایک جھاڑی میں چھپا کر رکھ دیں۔ میں کیبن کی طرف واپس آ رہا تھا کہ کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ غور سے سنا۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ میں ڈرتے ڈرتے آواز کی طرف گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چھوٹے سے گڑھے میں ایک عورت ایسے پڑی ہے جیسے مر چکی ہو یا مر رہی ہو۔ لگتا تھا کہ وہ گڑھے میں گر پڑی ہے۔ میں گڑھے میں اتر گیا۔ عورت انڈونیشی تھی اور اسکی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ کی نہیں تھی۔ میں اسے باہر نکالنے کے لئے جھکا تو اس نے اپنی زبان میں پانی مانگا۔ وہاں کی اتنی زبان مجھے آ گئی تھی۔ میں بھاگ کر جھاڑیوں کی طرف گیا اور اس کو کولڈ ڈرنک کا ٹن کھول کر پلایا۔ میں نے اردو میں پوچھا۔ تم کون ہو اور یہاں کیسے آ گئی ہو؟ عورت نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ ”کچھ پتہ نہیں۔ کچھ معلوم نہیں“ اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

☆......☆......☆

میں یہی سمجھا کہ یہ عورت مصیبت زدہ ہے۔ اسے جاپانی کسی جزیرے سے اٹھا کر ساتھ لے آئے ہوں گے۔ موقع پا کر یہ بھاگ نکلی اور اب بھوکی پیاسی ان سے چھپتی پھر رہی ہے۔ میں نے اپنے تھیلے میں سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لیں۔ اس بے ہوش عورت کو اٹھایا اور اپنے ٹوٹے پھوٹے کیبن میں لے آیا۔ تھوڑی دیر میں اسے ہوش آ گیا۔ میں نے اسے کچھ کھانے پینے کو دیا۔ تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے اپنا نام سوی بتایا۔ وہ ایک صحت مند خاتون تھی مگر اس کی آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ جو کیبن کے نیم اندھیرے میں مجھے زیادہ گہرے نظر آ رہے تھے۔ ایک بات کی وضاحت یہاں کرتا چلوں کہ جو لوگ دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں یا اس سے پہلے جنوب مشرقی ایشیا کے ان علاقوں میں رہ چکے ہیں انہیں خوب معلوم ہوگا کہ وہاں مقامی زبانیں تو بولی ہی جاتی تھیں مگر دو غیر ملک کے آدمی ایک دوسرے سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرتے تھے جسے ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ مثلاً اب جانے کو مانگتا۔ ادھر تم جانے کا نہیں ہے۔ ادھر تم گاڑی کھڑی کرنے کا نہیں ہے۔ پڑھے لکھے گھرانوں کے لوگ اور ان کی عورتیں اس سے اچھی اردو بھی بول لیتی تھیں۔ اس خاتون کا تعلق بھی کسی پڑھے لکھے گھرانے سے تھا جیسا کہ اس نے بعد میں بتایا۔ چنانچہ وہ ذرا بہتر ہندوستانی بول لیتی تھی۔ یہاں ڈچ زبان کو وہی مقام حاصل تھا جو

انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں ہمارے ہاں تھا۔

اس عورت کا لباس انڈونیشی نہیں تھا۔ اس نے پرانی سی جین اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ بال گردن تک کٹے ہوئے تھے۔ پاؤں میں ربڑ کے جوتے تھے۔ اس کا نام سوی تھا۔ اس کے باپ کا ایک قریبی جزیرے میں جنرل سٹور تھا۔ جاپانی جزیرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں لوٹ مار اور قتل عام شروع کر دیا۔ سوی اس وقت اپنے باپ کے ساتھ سٹور میں تھی۔ جاپانی سپاہی اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے سوی کے باپ کو گولی مار دی اور سوی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے تھے۔ پھر وہ اسے اس جزیرے میں لے آئے جہاں وہ گولہ باری کے بعد جان بچا کر جنگل میں چھپ گئی اور اب میرے سامنے بیٹھی تھی۔ میں نے سوی سے کہا۔

"جاپانی تو تمہیں سارے جزیرے میں تلاش کریں گے"

وہ بولی۔ "اسی لئے میں یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے فرار ہو جانا چاہتی ہوں"

میں نے کہا۔ "وہ تو میں بھی چاہتا ہوں مگر ہمارے چاروں طرف سمندر ہے۔ ہم یہاں سے فرار کیسے ہو سکتے ہیں"

سوی نے کہا۔ "تمہیں شاید پتہ نہیں کہ اس سمندر میں بے شمار چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ یہاں سے بھی بیس پچیس میل کے فاصلے پر ایک ایسا جزیرہ موجود ہے جہاں قبضہ تو جاپان ہی کا ہے مگر جاپانیوں نے وہاں کوئی کیمپ قائم نہیں کیا۔ کیونکہ اس جزیرے میں جرائم پیشہ لوگ رہتے ہیں اور ان کا تال میل علاقے کے بحری ڈاکوؤں سے قائم ہے۔"

بحری ڈاکوؤں کے نام پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے سوی سے پوچھا کہ ہم اس جزیرے پر کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ سوی کہنے لگی۔

"جاپانی اپنے ساتھ کچھ علاقائی ماہی گیر بھی لائے ہیں جن کی چھ سات چھوٹی کشتیاں جزیرے کے جنوبی ساحل پر کھڑی رہتی ہیں۔ یہ لوگ دن کے وقت جاپانیوں کے لئے تازہ مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ ہم ان کی کوئی ایک کشتی اٹھا کر یہاں سے بھاگ سکتے ہیں۔"

اس وقت سوی کی تجویز بھی بڑی معقول لگی۔ میں نے کہا۔ "میں آج رات حالات کا جائزہ لوں گا۔"

وہ کہنے لگی۔ "اگر تم جائزہ لیتے رہ گئے تو جاپانیوں کی گولیاں ہمیں بہت جلد بھون ڈالیں گی ہمیں ابھی چل کر کشتی اڑا لینی ہو گی تاکہ ہم جزیرے سے نکل جائیں۔"

میں نے نن فو کا تھیلا نکالا اور سوی کے ساتھ جزیرے کے جنوبی ساحل کی طرف چلا۔ سوی آگے آگے تھی۔ ہم پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ جزیرے کا جنوبی ساحل غروب ہوتے چاند کی دھندلی چاندنی میں نظر آ رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر کچھ جھونپڑیاں تھیں۔ اور پانچ چھ چھوٹی کشتیاں ساحل کی ریت پر کھڑی تھیں۔ سوی بولی۔ "ایک کشتی کھینچ کر ادھر لے آؤ۔"

میں نے تھیلا وہیں رکھا اور کشتی کی طرف بڑھا۔ یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی کہ وہاں کوئی جاپانی سپاہی گارڈ ڈیوٹی پر موجود نہیں تھا۔ مچھیرے جھونپڑیوں کے اندر سو رہے تھے۔ میں ایک کشتی نکال کر لے آیا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے اور کشتی کو ایک طرف چلانے لگے۔ سوی چاند ستاروں کے حساب سے راہ نمائی کر رہی تھی۔ وہ اس جزیرے میں پہلے بھی دو چار مرتبہ جا چکی تھی۔ اصل میں وہاں اسکا ایک رشتے دار رہتا تھا جو بحری ڈاکوؤں سے لوٹ مار کا مال خرید کر پیچھے اپنے ایجنٹوں کو روانہ کر دیتا تھا۔ اس طرح سے اس جزیرے میں مجھے یہ سہولت تھی کہ کچھ دیر ٹکنے کو ایک ٹھکانہ مل سکتا تھا۔ ہماری کشتی کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد چوروں کے جزیرے میں پہنچ گئی۔ وہاں کے لوگوں نے اس جزیرے کا یہی نام رکھا ہوا تھا۔ کیونکہ جب بھی کوئی بحری ڈاکوؤں کا جہاز وہاں آتا تو ایک چور بازار لگتا تھا۔ جزیرے میں دور دور کہیں کہیں دھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ سوی کو اپنے رشتے دار کے مکان کا پورا علم تھا۔ چنانچہ وہ ایک محفوظ راستے سے مجھے وہاں لے گئی۔ اس کا رشتے دار سو رہا تھا۔ سوی کے آوازیں دینے پر وہ آنکھیں ملتا باہر نکل آیا۔ وہ چھوٹے قد کا گول مٹول سا آدمی تھا جس کے سر کے بال سفید ہو رہے تھے۔ پہلے سوی کو اور پھر اس کے ساتھ مجھے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ سوی نے اپنی زبان میں اس کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ اور پھر مختصر

لفظوں میں اپنے اغواء ہونے اور اپنے والد کے مارے جانے کی کہانی سنائی۔ وہ ہمیں اندر لے گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جہاں فرش پر چٹائی بچھی تھی۔ ایک طرف پلنگ تھا۔ مخمل لیمپ روشن تھا۔ کھڑکیوں پر جالی دار ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ اس آدمی کا نام شولا تنگ تھا۔ سوی کے آنے سے وہ کافی پریشان ہو گیا تھا۔ میری طرف کنکھیوں سے بار بار دیکھ رہا تھا۔ بہرحال رات گذر گئی۔ اگلے دن ناشتے کے بعد وہ سوی سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ میں باہر برآمدے میں چٹائی پر بیٹھا اس کی آواز سنتا رہا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ بعد میں سوی نے مجھے بتایا کہ اس کا رشتے دار میرے بارے میں پریشان ہے کیونکہ میری شکل سے پتہ چل جاتا ہے کہ میں انڈونیشیا کا رہنے والا نہیں ہوں اور اگر کسی جاسوس نے مجھے دیکھ لیا تو وہ جاپانیوں کو خبر کر دے گا اور میرے ساتھ وہ بھی پکڑ لیا جائے گا۔ میں نے سوی سے کہا۔

"مجھے دو چار روز یہاں رہنے کی اجازت لے دو۔ اس کے بعد میں خود ہی کسی طرف نکل جاؤں گا۔"

میرا پروگرام یہ تھا کہ جونہی جزیرے میں کوئی بحری ڈاکوؤں کا جہاز آیا میں وہاں سے نکل کر ان لوگوں میں شامل ہونے کی کوشش کروں گا۔ میں سوی کے اس رشتے دار کے پاس رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ دوسرے ہی دن بحری قزاقوں کا ایک جہاز وہاں آ گیا۔ جہاز جزیرے سے کافی دور کھلے سمندر میں ہی لنگر ڈالے ہوئے تھا۔ قزاق کشتیوں میں مال لاد کر جزیرے پر آئے اور وہاں چور بازار کا کاروبار شروع ہو گیا۔ بحری قزاقوں کے چہرے اکھڑ اور وحشی تھے۔ ان میں جنوب مشرقی ایشیا کے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ کئی ایک کے کانوں میں سونے چاندی کی بالیاں تھیں اور سروں پر رنگدار رومال بندھے تھے۔ کوئی قزاق ایسا نہیں تھا جس کی پیٹی کے ساتھ پستول نہ لٹک رہا ہو۔ وہ لوٹے ہوئے مال کے تھیلے الٹ رہے تھے اور اس کے عوض غیر ملکی کرنسی وصول کر رہے تھے۔ ان کے آنے سے وہاں ایک شور سا مچ گیا تھا۔ میں نے ساحل کے پاس دو جاپانی سپاہیوں کو بھی دیکھا جو ان قزاقوں سے ایک خاص ٹیکس وصول کر رہے تھے۔ ظاہر

ہے ان کی اجازت کے بغیر یہ لوگ جزیرے پر نہیں آسکتے تھے۔ میں ایک ریستوران میں آ گیا جہاں کچھ قزاق بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کافی اور دیگر مشروب پی رہے تھے۔ انہوں نے پستول نکال کر میز پر رکھے ہوئے تھے۔ میں اسی فکر میں تھا کہ کسی بحری قزاق سے بات کروں اور وہ مجھے اپنے عملے میں شامل کرلے اور یوں ایک بالکل نئے ایڈونچر کا آغاز ہو۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اسی علاقے میں ایسے جزیرے بھی تھے جہاں اگر کوئی بحری ڈاکو پکڑا جاتا تو لوگ اسے وہیں گولی مار دیتے تھے۔ کیونکہ بہرحال یہ لوگ ڈاکو اور قاتل تھے اور کسی بھی ملک کے قانون کی نظروں میں ان کی سزا موت تھی۔ لیکن یہ لوگ بھی بڑے ہوشیار تھے اور سوائے اس چوروں کے جزیرے کے دوسرے کسی بھی جزیرے کے قریب نہیں پھٹکتے تھے۔ ریستوران میں ان لوگوں کے قہقہوں اور ہا[illegible] سے اک شور سا مچا تھا۔ میں ایک طرف کونے میں چھوٹی سی میز کے پاس بیٹھ گیا اور کافی منگوا کر پینے لگا۔ میری ساتھ والی میز پر ایک چوڑے نتھنوں گھنگریالے بالوں والا باڈی بلڈر ٹائپ کا قزاق بیٹھا بھنی ہوئی بطخ کھا رہا تھا۔ یہ قزاق جب اٹھ کر جانے لگا تو اس کی پتلون سے خدا جانے کیسے ایک بٹوہ نکل کر نیچے گر پڑا۔ قزاق کو اس کی خبر نہ ہوئی اور وہ جھومتا جھامتا ریستوران سے نکل گیا۔ میں نے جلدی سے بٹوا اٹھا کر کھولا تو وہ ڈالر اور پاؤنڈ کے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اچانک ایک خیال میرے دماغ میں بجلی کی طرح چمک گیا۔ میں بٹوا لے کر اس قزاق کے پیچھے دوڑ پڑا۔ وہ ریستوران سے ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا، میں بھاگ کر اس کے سامنے آگیا اور بٹوا دکھا کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا کہ یہ اس کا بٹوا ہے ریستوران میں گر گیا تھا۔ قزاق نے جھپٹ کر بٹوا مجھ سے چھین لیا۔ اسے کھول کر دیکھا۔ پھر بڑی حیرت بھری نظروں سے میری طرف تکنے لگا۔ شاید اسکی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس چوروں کے جزیرے میں ایک ایماندار لڑکا کہاں سے نکل آیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ میں نے ایمانداری سے نہیں بلکہ حکمت عملی سے کام لیا تھا۔ قدرت نے مجھے ایک موقع مہیا کردیا تھا اور میں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ بولا۔ ''تم نے یہ بٹوا واپس کیوں کردیا؟'' میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ''میں امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' وہ قہقہہ

لگا کر ہنسا اور میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

''یہاں نئے نئے آئے لگتے ہو؟''

تب میں نے اس کے آگے اپنی کہانی ڈال دی اور کہا کہ میں ان لوگوں میں شامل ہو کر کھلے سمندروں کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ اس قزاق نے غور سے مجھے اوپر سے نیچے دیکھا اور پھر اپنی بیلٹ میں سے پستول نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا اور ایک طرف اشارہ کرکے بولا۔ وہ جو آدمی سامنے والے کھوکھے میں بیٹھا پیسے گن رہا ہے اس کو گولی مار دو۔ اگر وہ مرگیا تو میں تمہیں اپنے ساتھ جہاز پر لے چلوں گا۔ مجھے پسینہ آگیا۔ ایک بے گناہ کو میں کیسے گولی مار سکتا تھا۔ میں نے فوراً کہا۔

''میں کھانا بڑا اچھا پکالیتا ہوں۔ آلو بھی چھیل سکتا ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں ڈیک کی صفائی بھی کرلیتا ہوں۔'' بحری قزاق نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ پستول میرے ہاتھ سے لے کر پیٹی میں لگائی اور سگار کو ایک طرف پھینک کر بولا۔ تم ایماندار ہو۔ مجھے پسند ہو۔ چلو میرے ساتھ۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ میں نے یونہی اپنا نام پری بتا دیا۔ اسکا نام لوبو تھا اور وہ جزائر ہوائی کا رہنے والا تھا۔ وہاں کئی قتل کرنے کے بعد بحری ڈاکوؤں میں آن شامل ہوا تھا۔ اس نے مجھے جہاز کے کپتان سے ملایا اور اپنی زبان میں اس سے شاید میری ایمانداری کی تعریف کے ساتھ ساتھ میرے شوق کا اظہار بھی کیا۔ قزاقوں کے جہاز کا کپتان ہاتھی کی طرح گرانڈیل تھا۔ اسکی کمر میں دو پستول لگے تھے۔ گنجان ڈاڑھی اس کے پھولے ہوئے پیٹ تک پھیلی تھی۔ وہ خنجر کی نوک سے اپنا پیالے جتنا بڑا پائپ صاف کر رہا تھا۔ میری طرف لال لال آنکھوں سے دیکھ کر کچھ غرایا۔ پھر لوبو کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر غرایا۔ لوبو مجھے لے کر باہر آگیا اور بولا۔ ''کپتان نے تمہیں رکھ لیا ہے۔ مگر تم جہاز پر صرف میرے لئے کھانا بنایا کرو گے۔ تنخواہ تمہیں میں دوں گا۔'' مجھے اور کیا چاہئے تھا۔ دوسرے دن سارے بحری قزاق کشتیوں میں سوار ہوکر اپنے جہاز کی طرف چل پڑے۔ ایک کشتی میں میں بھی لوبو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بحری قزاقوں کے ساتھ کھلے سمندروں میں سیاحت کرنے کی میری دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی۔ اس لئے میں

بہت خوش تھا۔ چوروں کے جزیرے سے لنگر اٹھانے کے بعد یہ جہاز دو دن تک خدا جانے کن کن سمندروں میں چکر لگاتا رہا۔ اس جہاز کے انجن کافی پرانے تھے اور جہاز کی حالت بھی خستہ ہی تھی مگر وہ کام دے رہا تھا۔ تیسرے روز جہاز پر اچانک ادھر ادھر بھاگنے لگے لوبو بھی کیبن سے نکل کر ڈیک پر آ گیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ دور سے ایک جہاز کے مستول نظر آ رہے تھے۔ لوبو کہنے لگا۔

"شکار نظر پڑ گیا ہے۔ تم نیچے کیبن میں ہی رہنا۔ یہ تھوڑی دیر میں حملہ کرنے والے ہیں۔"

اسی وقت جہاز پر انسانی کھوپڑی اور ہڈیوں والا کالا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ یہ بحری قزاقوں کے جہاز کا خاص نشان ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

ہمارے بحری قزاقوں کے جہاز نے سمندر میں ایک جہاز کو دیکھ لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی جہاز پر بحری قزاقوں کا سیاہ جھنڈا لہرا دیا گیا تھا۔ میرے محسن بحری قزاق لوبو نے مجھے کیبن میں رہنے کی ہدایت کی اور خود اوپر چلا گیا۔ مگر میں دیکھنا چاہتا تھا کہ بحری قزاق کس طرح حملہ کرتے ہیں۔ چنانچہ میں کیبن سے نکل کر عرشے پر آ گیا اور ایک طرف چھپ کر سب کچھ دیکھنے لگا۔ ہمارے جہاز پر چار پرانی مارٹر توپیں بھی تھیں۔ ہمارا جہاز اپنے شکار کے قریب آ گیا تھا۔ تب یکے بعد دیگرے دوسرے جہاز پر مارٹر توپ کے گولے پھینکے گئے۔ گولے اس طرح پھینکے گئے تھے کہ جہاز کے آس پاس سمندر میں گر کر پھٹیں۔ مطلب جہاز کے مسافروں کو خوفزدہ کرنا تھا۔ وہ جہاز زیادہ بڑا نہیں تھا اور اس پر کوئی توپ بھی نہیں لگی تھی۔ قزاق جہاز مزید قریب آ گیا اور پھر ڈاکو للکارتے ہوئے رسوں کی مدد سے دوسرے جہاز پر کودنے لگے۔ ایک قیامت سی برپا ہو گئی جس میں عورتوں کی چیخوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے یہ سب کچھ ناگوار لگا۔ میرے دل میں بحری ڈاکوؤں کے ایڈونچر کا جو شوق پیدا ہوا تھا وہ اس ظلم و ستم کو دیکھ کر رفو چکر ہو گیا۔ مجھے ان بحری قزاقوں پر سخت غصہ آنے لگا جو عورتوں اور بچوں پر بھی ظلم کر رہے تھے۔ ڈاکوؤں نے جہاز کو جی بھر کر لوٹا اور سارا سامان اپنے جہاز پر لے آئے۔ میں چھپا بیٹھا یہ

سارا دردناک منظر دیکھ رہا تھا۔ میرے دل میں ان ڈاکوؤں کے خلاف بغاوت کے شدید جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ ان سنگدل قزاقوں نے لوٹ مار کے علاوہ جہاز پر ضرور کچھ بے گناہ مسافروں کو قتل بھی کیا ہوگا۔

شام کے وقت جب ملاح ڈاکو عرشے پر بیٹھے اپنے حصے کا مال سنبھال رہے تھے، میں نے لوبو سے کہا۔ "مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔" لوبو نے میری طرف گردن گھما کر دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اسے لوٹ مار سے اپنا حصہ روپوں کی شکل میں ملا تھا جنہیں وہ گن کر تھیلی میں ڈالتا جا رہا تھا۔ بحری ڈاکوؤں کا جہاز سورج غروب ہو جانے کے بعد شفق کی گہری سرخ ہوتی روشنی میں سمندر میں ایک طرف جا رہا تھا۔ ہوا بڑی تیز تھی اور اس میں سمندری لہروں کی نمی تھی۔ میں رات کو لوبو کے واسطے کالی کافی کا مگ لے کر آیا تو وہ اپنی برتھ پر لیٹا جیسے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ میں نے اسے پہلے ایسے فلسفیانہ موڈ میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ برتھ سے اتر کر کیبن کے فرش پر بیٹھ گیا اور مجھ سے کافی کا مگ لے لیا۔ میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ کافی کا گھونٹ بھرنے کے بعد لوبو نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ میں ان بحری ڈاکوؤں کے ساتھ اپنی خوشی سے رہ رہا ہوں؟ نہیں مجھے بھی یہ لوٹ مار اور ظلم کی زندگی بالکل پسند نہیں۔" میں نے کہا۔ "تو پھر تم ان کے ساتھ کیوں رہتے ہو۔ انہیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" لوبو نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے کافی پیتا رہا۔ پھر اچانک گردن میری طرف گھماتے ہوئے کہنے لگا۔ "ہمارا جہاز یہاں سے سو میل دور ایک ویران جزیرے کی طرف جا رہا ہے۔ وہاں ہم لوگ دو دن ٹھہریں گے۔ دو دن بعد جب جہاز وہاں سے روانہ ہوگا تو میں اس میں نہیں ہوں گا۔" "کیا مطلب؟" میں نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔ لوبو فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "مطلب یہ کہ بحری ڈاکوؤں والی زندگی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"میں خود اس جہاز پر رہنا نہیں چاہتا۔ کیا تم مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو گے؟"

لوبو میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "مگر تمہیں تو بحری ڈاکوؤں کے ساتھ رہنے کا بڑا شوق تھا۔"

میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"وہ میری حماقت تھی۔ یہ لوگ مجرم ہیں۔ قتل کرتے ہیں۔ لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ یہ بے رحم اور سنگ دل ہیں میں نے توبہ کر لی ہے۔ تم مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تمہاری خدمت کیا کروں گا۔"

لوبو بولا۔ "میں اس کا جواب جزیرے پر پہنچ کر دوں گا۔ اتنی دیر تم اپنے فیصلے پر اچھی طرح غور کر لو"

غور کیا کرنا تھا۔ فیصلہ میں نے کر لیا تھا۔ مجھے بحری ڈاکوؤں سے نفرت ہو گئی تھی۔ ان کا ظلم دیکھ کر۔ ان کی سنگ دلی دیکھ کر۔ ساری رات جہاز سمندر میں سفر کرتا رہا۔ دوسرے دن سمندر میں ایک جزیرے کا دھبہ سا نظر آنے لگا۔ یہ ایک ویران جزیرہ تھا مگر یہاں میٹھے پانی کے چشمے تھے۔ جہاز کو یہاں سے پانی ذخیرہ کرنا تھا۔ سارے ڈاکو جہاز سے اتر کر جزیرے میں آرام کرنے لگے۔ دوپہر تک میں عرشے کی صفائی میں لگا رہا۔ پھر کچن میں آ گیا۔ یہاں لوبو مل گیا۔ اس نے مجھے آہستہ سے کہا۔

"کیا اب بھی اپنے فیصلے پر قائم ہو پری؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ مسکرا کر کچن کے باہر چلا گیا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ رات کے وقت لوبو مجھے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا۔ "اب بولو کیا کہتے ہو؟" میں نے اس کی منت کی کہ کسی طرح مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلے۔ میں ان وحشی قزاقوں کے جہاز پر ایک دن بھی نہیں رہ سکتا۔ لوبو نے ایک چشمے کی طرف اشارہ کیا جہاں زنگ آلود پتھروں کے درمیان سے شفاف پانی کی لکیر بہہ رہی تھی۔

"جہاز منہ اندھیرے جزیرے کو چھوڑ دے گا۔ اب تم جہاز پر مت جانا۔ اسی جنگل میں کسی جگہ باقی رات گزار دو۔ صبح جب جہاز لنگر اٹھا کر یہاں سے روانہ ہو جائے گا تو میں تمہیں اسی چشمے کے پاس آ کر ملوں گا۔ خبردار کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔"

لوبو جہاز کی طرف چلا گیا۔ میں نے سمندر میں کھڑے بحری ڈاکوؤں کے جہاز کی جھلملاتی روشنیوں کو دیکھا اور دل میں کہا۔ اب کبھی تم پر سوار نہیں ہوں گا۔ یہ کہہ کر میں چشمے کی طرف

نکل گیا۔ کسی نہ کسی طرح میں نے وہاں درختوں میں رات گذار دی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ لوبو کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا۔ میں کچھ وقت کے لئے سو بھی گیا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو آسمان پر صبح کاذب کی نیلی نیلی روشنی ہو رہی تھی۔ پھر جہاز کے انجن کی آواز آنے لگی۔ میں دوڑ کر درخت کی اوٹ میں آ گیا۔ بحری ڈاکوؤں کا جہاز آہستہ آہستہ جزیرے سے دور ہٹ رہا تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں اس غیر آباد جزیرے پر اکیلا رہ گیا ہوں۔ مگر دوسرے ہی لمحے مجھے لوبو اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے کاندھے پر پلاسٹک کا ایک تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ تھیلے میں وہ میرے لئے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لایا تھا۔ میں نے جزیرے کی ویرانی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا کہ اب ہم اس جزیرے سے کیسے نکلیں گے؟ وہ بولا۔ "اس کا بھی سارا بندوبست ہو گیا ہے۔ تم یہ جلدی سے کھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔" وہ مجھے جزیرے کے جنوبی ساحل کی طرف لے گیا۔ یہاں سمندر کا پانی ایک چھوٹی سی کھاڑی کی شکل میں جزیرے کے اندر تک آ گیا تھا۔ کنارے کنارے بھورے پتھروں کی چٹانیں تھیں۔ یہاں ایک جگہ اس نے جھاڑیوں کو ادھر ادھر ہٹایا تو مجھے وہاں ایک چھوٹی سی کشتی دکھائی دی۔ لوبو ہنسا۔ "یہ کشتی ہم لوگوں نے اس لئے چھپا رکھی تھی کہ کبھی کسی ہنگامی حالت میں اس کی ضرورت پڑ جائے۔" میرے پوچھنے پر کہ ہم یہاں سے کدھر جائیں گے لوبو نے کہا۔ "یہاں سے مشرق کی طرف آسٹریلیا کا ملک ہے مگر ادھر جنگ ہو رہی ہے۔ ہم ادھر نہیں جا سکتے۔ جنوب کی طرف اتنا بڑا سمندر ہے کہ ہم زندہ نہیں بچ سکتے۔ مجھے ایک راستے کا پتہ ہے۔ یہ راستہ یہاں سے شمال کی جانب جزیروں کی آبنائے سے گذر کر مغرب کی طرف پوڈانگ کو جاتا ہے جہاں بڑے گھنے جنگل ہیں۔ ان جنگلوں میں ایک دریا بہتا ہے اس دریا کے کنارے تین کالی چٹانیں ساتھ ساتھ زمین سے باہر نکلی ہوئی ہیں۔ وہاں کچھ جنگلی قبیلے ہیں۔ اسی جگہ ایک سپیرن عورت رہتی ہے۔ وہ میری منہ بولی ماں ہے۔ اس کے پاس میں نے اپنی کچھ دولت ہیروں کی شکل میں جمع کرا رکھی ہے۔ میں وہ اس سے واپس لے لوں گا اور لنکا میں جا کر نئی زندگی شروع کروں گا۔ میں نے پوچھا۔ "وہاں سے لنکا ہم کس طرح جائیں گے۔ سارے علاقے پر تو جاپانیوں کا قبضہ ہے اور لنکا

تک جو سمندر ہے وہاں جاپانی جنگی جہاز گشت کر رہے ہوں گے۔" لوبو کہنے لگا۔ "وہ سپیرن عورت سارا انتظام کر دے گی۔ اس کے پاس علاقے کے اکثر سمگلر آتے رہتے ہیں اور وہ ان سے اپنا کمیشن بھی وصول کرتی ہے" میں نے کہا۔ "مگر وہ وہاں کیا کرتی ہے؟" لوبو نے کہا۔ "اسکی ساری زندگی اسی جنگل میں گذر رہی ہے۔ جنگلی قبیلے کے لوگ بھی اسکی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اسے سانپ پالنے کا شوق ہے۔ جنگلی لوگ اس سے اس لئے بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ کسی سانپ کو بھیج کر انہیں ہلاک نہ کروا دے۔" لوبو نے بڑے لمبے خطرناک سفر کا منصوبہ سامنے رکھ دیا تھا۔ اب میں پچھتانے لگا کہ میں کیوں بحری قزاقوں کے جہاز پر سوار ہو گیا۔ مگر اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ آدمی کو کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہئے۔ مگر وہ میرے جذبات کا زمانہ تھا۔ جذبات کی اپنی دلکشی، اپنی ایک جنت ہوتی ہے۔ میرا عزم جوان تھا۔ کھلے سمندروں میں سفر کرنے کا جذبہ بھی تھا۔ کبھی کبھی میرا دماغ مجھے آنے والے خطروں سے ڈراتا مگر میرے جذبات اس پر غالب آ جاتے، ہم کشتی جھاڑیوں سے نکال کر کھاڑی کے پانی میں لے آئے۔ لوبو اس ویران جزیرے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے کچھ تازہ ناریل کشتی میں رکھ لئے۔ لوبو کے تھیلے میں تین دن کی خشک خوراک اور پانی سے بھرا ہوا ایک پلاسٹک کا تھیلا بھی تھا۔ اگرچہ لوبو کے حساب کے مطابق موسم ٹھیک رہنے کی صورت میں ہمیں تیسرے دن پوڈانگ کے ساحل پر جا لگنا تھا۔ یہ سب کچھ اندازے سے ہی ہو رہا تھا۔ مگر لوبو کو سمندری سفر کا بڑا تجربہ تھا۔ میرے سامنے اب ایک ہی منزل تھی کہ لوبو کے منصوبے کے مطابق لنکا پہنچ جاؤں اور وہاں سے پنجاب کی طرف نکل جانے کی کوشش کروں۔ کیونکہ یہ علاقہ ابھی انگریزوں کے پاس ہی تھا۔ مشکل صرف یہ تھی کہ پوڈانگ سے لنکا کے ساحل تک پہنچنے کے لئے ہم جاپانیوں کے سمندری دفاع سے نکلنے میں کیسے کامیاب ہوں گے۔ بہر حال یہ مسئلہ پوڈانگ پہنچنے کے بعد شروع ہوتا تھا۔ ہم دونوں کشتی میں سوار ہو گئے۔ لوبو چپو چلانے لگا۔ وہ کشتی کو بڑی مہارت سے چلاتا کھاڑی سے نکال کر سمندر میں لے آیا۔ میں کچھ گھبرا بھی رہا تھا کہ کھلے سمندر میں یہ کشتی کب تک چلے گی۔ جب میں

نے لوبو سے اپنی تشویش کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگا۔

''ہم کھلے سمندر میں نہیں جائیں گے۔ بلکہ ہم اس علاقے میں بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے ان گنت جزیروں کے دریا نما پانیوں میں سفر کریں گے۔ میں اس سمندر سے واقف ہوں۔ اگر راستے میں کوئی طوفان آ گیا تو میں بڑی آسانی سے کشتی کسی بھی قریبی جزیرے میں لے جا سکتا ہوں۔''

ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ یہ بڑا تکلیف دہ سفر تھا۔ طوفان تو راستے میں کوئی نہ آیا مگر اپنی باری پر چپو چلاتے چلاتے میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ رات کے وقت تجربہ کار ملاح لوبو نے کشتی کو ایک تیز رفتار سمندری لہر پر ڈال دیا۔ اور کشتی اپنے آپ ساری رات اور دوسرا سارا دن سفر کرتی رہی۔ دوسری رات بھی گذر گئی۔ اس دوران ہمیں دائیں بائیں کسی نہ کسی جزیرے کے پہاڑیوں کے دھبے کسی وقت دکھائی دے جاتے تھے۔ اسی روز دوپہر کے بعد ہماری کشتی پوڈانگ کی کھاڑی میں داخل ہو گئی۔ یہاں اتنے گھنے درخت تھے کہ ان کے درمیان ساحل پر دور تک اندھیرا چھا رہا تھا۔ لوبو بڑی احتیاط سے کشتی چلاتا کنارے کی طرف آ گیا۔ یہاں ایک جگہ اس نے کشتی روک دی۔ ہم کشتی سے اتر کر گیلی ریت پر لیٹ گئے۔ جب جسم میں خون پوری طرح سے دوبارا گردش کرنے لگا تو لوبو کہنے لگا۔ ''سیبرن کا جھونپڑا اس جنگل میں کافی آگے جا کر ہے۔ ہمیں اب ایک ایسے جنگل میں سے پیدل گذرنا ہو گا جہاں ایک وحشی جنگلی قبیلے کی حکومت ہے۔ یہ جنگلی آدم خور تو نہیں ہیں مگر انہیں انسانی کھوپڑیاں جمع کرنے کا بڑا شوق ہے۔ یہ لوگ مسافروں پر اچانک حملہ کر دیتے ہیں اور ان کی گردنیں اڑا دیتے ہیں۔ یہ انسانی کھوپڑیوں کے شکاری ہیں۔ اگرچہ وہ میری منہ بولی ماں سیبرن سے ڈرتے ہیں مگر جب تک ہم سیبرن کی جھونپڑی میں نہیں پہنچتے ہمیں ان جنگلیوں کی طرف سے خطرہ ہے۔''

لوبو نے پستول ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس نے خنجر مجھے دے دیا۔ اور اس دہشت ناک جنگل میں ہمارا خطرناک سفر شروع ہو گیا۔

☆......☆......☆

یہ جنگل بھی اپنی طرز کا ایک انوکھا جنگل تھا۔ کہیں درخت اتنے گھنے ہو جاتے کہ میرے بحری قزاق ساتھی لوبو کو بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑتا حالانکہ وہ ادھر سے کئی بار گزر چکا تھا۔ اور کبھی چھوٹی چھوٹی سیاہ چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کبھی دلدلی میدان آ جاتے جن میں سبز رنگ کی دلدل جیسے سانس لے رہی ہوتی۔ لوبو کہنے لگا۔ ''ان دلدلوں نے کئی ہاتھی کئی بھولے بھٹکے مسافروں کو نگلا ہے۔ ایک بار آدمی ان میں گر پڑے تو پھر اس کا بچنا ناممکن ہے۔ دلدل اسے آن کی آن میں نیچے کھینچ لیتی ہے۔'' ہم ایک ایسی پگ ڈنڈی سے گزر رہے تھے جو لوبو نے ڈھونڈ نکالی تھی۔ خدا خدا کر کے ان خطرناک آدم خور دلدلوں کا سلسلہ ختم ہوا تو پھر وہی کالے کالے درختوں کا جنگل شروع ہو گیا۔ ان درختوں کی شاخیں زمین پر اگی ہوئی لمبی گھاس سے گلے مل رہی تھیں۔ یہاں ایک درخت پر بہت بڑا اژدہا لٹک رہا تھا۔ میں نے لوبو سے کہا اسے گولی مار دو۔ وہ کہنے لگا۔ یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ صرف اس کے قریب سے گزرتے ہوئے سانس کو تھوڑی دیر کے لئے روک لینا۔ کیونکہ اگر تم نے سانس لیا تو یہ تمہیں وہیں جھپٹ کر نگل جائے گا۔ میں نے سبز و سیاہ رنگ کے اژدہا سے چار قدم پہلے سانس روک لی اور اس کے آگے دس قدموں تک سانس کو روکے رکھا۔ ابھی تک ہمیں کھوپڑیوں کا شکار کرنے والے جنگلیوں میں سے کوئی نہیں ملا تھا۔ لوبو ان کے

لئے ہر آن چوکس تھا اور اپنی پیلے رنگ کی چمکدار آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ لیتا تھا۔ چلتے چلتے ہمیں شام ہوگئی۔ خودرو جنگلی جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس کی وجہ سے ہم زیادہ تیز نہیں چل سکتے تھے۔ لوبو کہنے لگا۔

"ہمیں یہیں کسی جگہ رات گزارنی ہوگی۔"

میں نے سنسان جنگل کی بھیانک خاموشی سے گھبرا کر کہا۔

"اگر رات کو سوتے میں کھوپڑیوں کے شکاری یا کوئی شیر چیتا آ گیا تو کیا ہوگا۔"

لوبو ہنس کر بولا۔ "تم فکر نہ کرو رات کے پہلے حصے میں تم پہرہ دینا۔ اس کے بعد میں پہرہ دوں گا اور یہ شیر وغیرہ رات کے دوسرے حصے میں ہی شکار کے لئے نکلتے ہیں۔ اور پھر ہم کسی محفوظ جگہ پر ٹھکانہ بنائیں گے۔"

محفوظ جگہ یہ تھی کہ لوبو نے ایک چٹان کے اندر بنی ہوئی قدرتی غار کو منتخب کر لیا۔ یہ غار کوئی چھ سات فٹ کے گھیرے میں پھیلا تھا اور اس کے منہ کے آگے جنگلی جھاڑیوں نے پردہ سا ڈال رکھا تھا۔ وہ غار میں گھستے ہی زمین پر لیٹ گیا اور بولا۔ باہر پہرہ دو آدھی رات کے وقت مجھے جگا دینا۔ پھر میں پہرہ دوں گا۔ میں پستول ہاتھ میں لے کر غار کے دہانے پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ لوبو ایک بے فکر نیم جنگلی قسم کا آدمی تھا جس کی زندگی کا زیادہ حصہ بحری ڈاکوؤں کے ساتھ غارت گری کرتے گزرا تھا۔ وہ لیٹتے ہی سو گیا اور اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ اگرچہ یہ میری نوجوانی اور خوش فکری کا زمانہ تھا مگر میری پرورش شہری ماحول میں ہوئی تھی جہاں آدمی فکر فاقے کے جنجال میں الجھا رہتا ہے جہاں سونے سے پہلے آدمی کو نیند آور گولیاں کھانی پڑتی ہیں۔ جہاں نیند کے پاؤں پڑ کر اسے اپنے بستر تک لایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کھوپڑی اڑا کر لے جانے والے جنگلیوں کا زیادہ خوف لگا ہوا تھا۔ کیونکہ لوبو نے کہا تھا کہ وہ پیچھے سے آ کر اچانک حملہ کر دیتے ہیں اور آدمی کو اس وقت پتہ چلتا ہے جب اس کی کٹی ہوئی گردن زمین پر پڑی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے میں غار کی دیوار کے ساتھ لگ کر پہرہ دے رہا تھا۔ یوں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ رات کتنی گزر

چکی ہے۔ کسی وقت تو مجھے لگتا کہ رات ایک جگہ رکی ہوئی ہے اور اب کبھی دن نہیں نکلے گا۔ مچھر مجھے بہت تنگ کر رہے تھے۔ ان کی وجہ سے بھی میری نیند غائب ہوگئی تھی۔ خدا جانے اس وقت رات کا کیا بجا ہوگا کہ بحری قزاق لوبو کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر غار کے باہر آ گیا اور نیند بھری آواز میں بولا۔ جاؤ اب تم جا کر سو جاؤ۔ باقی رات میں پہرہ دوں گا۔ میں زمین پر لیٹ گیا۔ آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں۔ میں سو گیا۔ مجھے سوئے میرا خیال ہے زیادہ وقت نہیں گزرا ہوگا کہ لوبو نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا اور بولا۔

"جلدی یہاں سے نکل چلو۔ مجھے کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔"

میں اس کے ساتھ غار سے باہر نکل آیا۔ لوبو فضا میں کچھ سونگھتا ہوا جھاڑیوں میں جھک کر چل رہا تھا۔ پھر اس نے ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ اور مجھے درخت پر چڑھنے کے لئے کہا۔ میں درخت پر چڑھا تو وہ بھی تیزی سے درخت پر چڑھ آیا۔ ہم زمین سے کوئی پندرہ بیس فٹ کی اونچائی پر گھنے درخت کی شاخوں میں چھپ گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لوبو نے فضا میں کونسا خطرہ محسوس کیا تھا۔ میں کچھ پوچھنے لگا تو اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر مجھے خاموش کر دیا۔

عین اس وقت ایسی آواز آئی۔ جیسے کچھ لوگ جھاڑیوں میں سے گزرتے چلے آ رہے ہیں۔ دوسرے لمحے مجھے اندھیرے میں مجھے چار پانچ آدمیوں کے سائے دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھوں میں تیر کمان تھے۔ وہ جھک کر اس غار کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں تھوڑی دیر پہلے ہم پناہ لئے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی جنگلی ہیں جو آدمیوں کے سر اتار کر لے جاتے ہیں۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ یہ جنگلی حملہ کرنے کے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے دو آدمی غار میں داخل ہو گئے۔ فوراً ہی باہر آئے اور ایک نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ باقی کے جنگلی ادھر ادھر تکنے لگے۔ شاید انہیں ہماری تلاش تھی۔ لوبو نے پستول کی نالی کا رخ شاخوں میں سے نکال کر ان کی طرف کر دیا۔ لوبو زیادہ سے زیادہ ایک دو کو ہلاک کر سکتا تھا لیکن اتنی دیر میں ان

کے تیروں کی بوچھاڑ ہمیں چھلنی کر سکتی تھی۔ میں لوبو کو منع کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں بول نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس کا پستول والا ہاتھ پیچھے کھینچنے کی کوشش کی تو اس نے میرے ہاتھ کو جھٹک دیا۔

ایسا کرنے سے پتوں میں ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ جنگلیوں میں سے ایک نے ہمارے درخت کی طرف دیکھا۔ ہماری زندگی ابھی باقی تھی۔ عین اس وقت نہ جانے درخت کی کونسی شاخ میں سے ایک پرندہ پھڑ پھڑا کر اڑ گیا۔ جنگلی یہی سمجھا کہ یہ پرندے کی آہٹ تھی۔ وہ لوگ ہمارے درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے جنگل کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔

انہیں گئے جب کافی دیر ہو گئی تو لوبو نے آہستہ سے کہا۔

"نیچے اترتے ہیں۔"

ہم ایک بار پھر اسی غار میں آ گئے۔ لوبو کا خیال تھا کہ جنگلی اب اس طرف نہیں آئیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ جب دن کی روشنی جنگل میں چاروں طرف پھیل گئی تو وہ بحری قزاق جنگل کے محفوظ راستوں سے ہوتا ہوا اپنی منہ بولی ماں سپیرن کے ڈیرے کی طرف چل پڑا مجھے قدم قدم پر یہی ڈر لگا رہا کہ ابھی کسی نہ کسی طرف سے جنگلی لوگ نکل کر ہم پر حملہ کر دیں گے۔ مگر لوبو قزاق بڑے اطمینان سے چل رہا تھا۔ جیسے اسے یقین ہو کر جنگلی اس طرف نہیں آ سکتے۔ ہم ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے آ گئے۔ یہ ندی اصل میں سمندر کا پانی ہی تھا جو کھاڑی سے ندی کی شکل میں نکل کر جنگل میں آ گیا تھا۔ اس ندی کے کنارے کنارے میں نے سرخ اور زرد رنگ کے عجیب و غریب پھول کھلے ہوئے دیکھے۔ ندی پیچھے رہ گئی۔ ہم ایک بہت زیادہ گنجان جنگل میں آ گئے تھے۔ بحری قزاق ایک جگہ رک گیا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کر کے مجھے ساتھ ساتھ کھڑی تین چٹانیں دکھائیں۔ کہنے لگا۔

"ہم سپیرن ماں کے ڈیرے میں پہنچ گئے ہیں۔" بڑے ہی دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے ہم آخر ایک جھونپڑے کے پاس پہنچ گئے۔ جھونپڑے کا بانس کا دروازہ کھلا تھا۔ باہر مٹی کے دو مٹکے پڑے تھے۔ دن کی روشنی میں مجھے جھونپڑے کے کھلے دروازے میں سے کچھ پٹاریاں رکھی نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً ان پٹاریوں میں سانپ تھے۔ سپیرن نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرا ساتھی قزاق جھونپڑی

کے باہر ایک طرف بیٹھ گیا اور بولا۔ "وہ یہیں کہیں ہو گی۔ ابھی آ جائے گی۔" اتنے میں ایک کالی سیاہ فام پختہ عمر کی عورت درختوں کے درمیان سے نکل کر ہماری طرف آئی۔ اس نے گیروے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بال شانوں پر کھلے تھے۔ آنکھیں شنگرف کی طرح چمک رہی تھیں۔ سب سے خوفناک بات یہ تھی کہ اس کے گلے میں تین چار سانپ پڑے تھے جن میں ایک سانپ نے اپنا پھن اٹھا رکھا تھا۔ قزاق لوبو کو دیکھ کر وہ عورت بہت خوش ہوئی۔ پھر میری طرف دیکھا اور پوچھا کہ یہ کون ہے۔ قزاق نے میرا مختصر سا تعارف کرایا۔ وہ عورت ہمیں وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔ پھر اندر سے کچھ کیلے اور ناریل لا کر ہمیں کھانے کو دیئے۔ وہ ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔ اب ایک سبز رنگ کا سانپ اس کے ہاتھ میں تھا جس سے وہ بچوں کی طرح کھیل رہی تھی۔ سانپ کے منہ سے کسی کسی وقت پھنکار کی ہلکی سی آواز نکل جاتی تھی۔ مجھے وہاں بڑا خوف محسوس ہونے لگا تھا اور میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے اس بھیانک سپیرن سے رخصت ہو جاؤں مگر میرے ساتھی قزاق نے ابھی اس سے اپنے ہیروں کی امانت واپس لینی تھی۔ آخر اس نے سپیرن سے ہیروں کی بات کر دی اور کہا کہ میں نے بحری ڈاکوؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا ہے اور اب لنکا جا کر شریف لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ سپیرن کی شنگرفی رنگ کی آنکھیں لوبو کے چہرے جمی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ عورت ہیرے واپس کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ وہ اٹھ کر جھونپڑی کے اندر گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں چمڑے کی ایک تھیلی تھی۔ تھیلی سپیرن نے قزاق کے حوالے کی اور کہا۔ "گن کر پورے کر لو تمہارے ہیرے جواہرات بالکل ویسے کے ویسے ہیں۔" "ماں! مجھے تم پر اعتبار نہیں ہو گا تو اور کس پر ہو گا؟" اس کے بعد سپیرن نے خبردار کیا کہ پوڈانگ سے لنکا تک آدھا سمندر جاپانیوں کے قبضے میں ہے۔ تم ان کے درمیان سے کیسے نکلو گے؟ قزاق لوبو نے کہا۔ "میں اس کا انتظام کر لوں گا پوڈانگ میں میرے کچھ دوست ہیں جو سمندری سرحد پار کرا دیں گے۔" وہ رات ہم نے وہیں کاٹی۔ میں تو رات بھر جاگتا رہا۔ اس ڈر نے سونے نہ دیا کہ کہیں کسی پٹاری سے کوئی سانپ نکل کر مجھ پر حملہ نہ کر

دے۔دوسرے دن ہم جانے لگے تو سپیرن نے قزاق سے کہا۔

بیٹا! تمہارے پاس ہیرے ہیں۔ راستہ خطرناک اور طویل ہے۔ ہو سکتا ہے راستے میں ڈاکو مل جائیں۔ میں تمہاری حفاظت کے لئے تمہارے پیچھے اپنے دو سانپ روانہ کر دوں گی۔ وہ پوڈانگ تک تمہاری حفاظت کریں گے۔اس کے بعد سپیرن نے پٹاری میں سے دو سانپ باہر نکالے۔ دونوں سانپ سیاہ رنگ کے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور چار چار فٹ لمبے تھے۔ سپیرن قزاق کی طرف بڑھی اور دونوں سانپوں کو قزاق کی گردن میں ایک بار پھیر دیا۔اس کے بعد میری طرف آئی تو میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ سپیرن ہنس کر بولی۔

"یہ میرے بیٹے سانپ ہیں۔ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ صرف تمہارے جسم کی خاص خوشبو سونگھنا چاہتے ہیں۔اس طرح سے انہیں جنگل میں تمہارا پیچھا کرنے میں آسانی ہوگی۔"

لوبو نے بھی مجھے حوصلہ دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سپیرن نے میری گردن میں دونوں سانپوں کو لپیٹ دیا۔ میں نے سانس روک لی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا ہے۔خدا خدا کر کے سانپوں نے میرے گلے کا ایک چکر پورا کیا اور سپیرن نے انہیں پرے ہٹا لیا۔ میری جان میں جان آئی۔ سپیرن کہنے لگی۔"اب ان میرے بچوں، میرے سانپوں نے تمہارے جسموں کی بُو لے لی ہے۔تم جہاں بھی ہو گے یہ تمہیں تلاش کر لیں گے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آئی تو یہ تمہاری مدد کریں گے۔"

دوپہر کو تھوڑا بہت کھا کر ہم دونوں سپیرن سے رخصت ہو کر پوڈانگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ واپسی کا سفر تھا۔ ہم انہی راستوں پر چل رہے تھے جن پر چلتے ہوئے ہم وہاں تک پہنچے تھے۔ شام تک جنگل میں ہمارا سفر جاری رہا۔ رات کو ایک چٹان کی کھوہ میں آرام کیا۔دوسرے دن کا سورج نکلا تو دوبارہ سفر پر چل پڑے۔ اس روز آسمان پر بادل چھا گئے اور ہوا چلنے لگی۔ ہم ایک ٹیلے سے نکلے ہی تھے کہ اچانک تین جنگلی ہاتھوں میں چھرے پکڑے ہمارے سامنے آ گئے۔ پستول قزاق کی پیٹی میں لگی تھی۔ قزاق نے پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک جنگلی نے خنجر حملہ

کرنے کے لئے اوپر کیا اور قزاق کی گردن اڑانے ہی والا تھا کہ اچانک سانپ کے پھنکار کی آواز آئی اور جنگلی جیسے کھڑا تھا ویسے کا ویسا دھڑام سے گھاس پر گر پڑا۔ یہی حال دوسرے جنگلی کا ہوا۔ تیسرا جنگلی ڈر کر بھاگ گیا۔اس کے بعد گھاس سے سپیرن کے دونوں سانپ اپنا پھن اٹھائے نکلے۔ لاشوں کے پاس آ کر ان کا ایک ایک چکر لگایا اور گھاس میں غائب ہو گئے۔ قزاق میری طرف دیکھ کر بولا۔

"ہمیں اب راستہ بدل کر چلنا ہوگا۔"

☆......☆......☆

اس وقت اگر سانپ ہماری مدد کو وہاں نہ پہنچتے تو ان خونخوار جنگلیوں سے ہمارا بچ نکلنا ناممکن تھا۔ یہ سانپ میرے قزاق ساتھی لوبو کی منہ بولی سپیرن ماں نے ہماری حفاظت کے لئے ہمارے ساتھ کر دیئے تھے جو ہماری نظروں سے اوجھل رہ کر ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ قزاق نے اپنے چہرے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی جان کی پروا نہیں۔ افسوس یہ ہوتا کہ میرے قیمتی ہیرے جواہرات ہاتھ سے نکل جاتے۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں یہ ہیرے جواہرات اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں کیا؟"

قزاق نے ایک قہقہہ لگایا۔ بولا۔

"اگر میرے پاس دولت نہیں ہوگی تو خالی جان لے کر کیا کروں گا؟ دولت کی خاطر میں اپنی جان بھی قربان کر دوں۔ آخر دوسروں کی جان لے کر میں نے یہ دولت جمع کی ہے۔"

قزاق کی منطق میری سمجھ سے باہر تھی۔ بہر حال ہم کسی نہ کسی طرح دشوار گزار خطرناک جنگلوں میں سفر کرتے پوڈانگ پہنچ گئے۔ یہاں آتے ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ پوڈانگ پر جاپانیوں نے قبضہ کر

لیا ہے۔ جس بات سے میں ڈرتا تھا آخر وہی بات ہوئی۔ یعنی ایک بار پھر جاپانیوں سے آمنا سامنا ہو گیا تھا۔

میرے ساتھی قزاق پر اس خبر سے صرف یہی اثر پڑا کہ وہ سپیرن کے خاص آدمی کے بارے میں فکر مند ہوا کہ اب اسے کہاں تلاش کیا جائے۔ کیونکہ پوڈانگ کا چھوٹا سا بندرگاہ نما شہر جاپانیوں کی گولہ باری سے تقریباً تباہ ہو چکا تھا اور کرفیو لگا تھا۔ ہم دن کے وقت وہاں پہنچے تھے۔ اس وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش ہو کر تھمی تھی اور زمین گیلی تھی۔ قزاق اس خاص آدمی کے ٹھکانے سے واقف تھا مگر کرفیو کی وجہ سے وہاں تک جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہم گھنے جنگل سے نکل آئے تھے اور اب دھان کے کھیتوں میں سے گزرتے شہر کی ایک سڑک پر آ کر رک گئے۔ قزاق بولا۔ یہ شہر کے لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔ میں نے جاپانی سپاہیوں کو سڑک پر گشت لگاتے دیکھ لیا تھا۔ اور سمجھ گیا تھا کہ یہ علاقہ جاپانی قبضے میں آ چکا ہے اور کرفیو لگا ہے۔ میرے ساتھی قزاق کی سمجھ میں نہ آیا کہ کرفیو کیا ہوتا ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اگر وہ جاپانی سپاہی کے سامنے گیا تو اسے شوٹ کر دیا جائے گا تو وہ کہنے لگا۔

"یہ تمہارا کرفیو کب ختم ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "کچھ معلوم نہیں ____ ہمیں کسی محفوظ جگہ پر چھپ جانا چاہئے۔ جب شہر کے لوگ سڑکوں پر نکلیں گے تو ہم بھی باہر آ جائیں گے۔"

قزاق نے ہیرے جواہرات کی تھیلی اپنی کمر کے ساتھ باندھ رکھی تھی۔ کہنے لگا۔ ٹھیک ہے۔ چلو وہاں پر جا کر چھپ جاتے ہیں۔ اس نے جس طرف اشارہ کیا تھا وہاں بانس کا جھنڈ تھا جس کے سائے میں سیمنٹ کا ایک بہت بڑا پائپ پڑا ہوا تھا۔ ہم اس کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔ پائپ کا دہانہ چھ سات فٹ ہوگا۔ اس کا عقبی منہ کسی نے پتھروں سے بند کر دیا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ یہاں کوئی غریب آدمی رہتا ہوگا۔ پائپ کے اندر اخباروں کے کچھ کاغذ بھی بکھرے ہوئے تھے۔ چھپنے کے لئے ہمیں بڑی اچھی جگہ مل گئی تھی۔ یہاں سے ہمیں ناریل کے درختوں کے بیچ میں شہر کی

سڑک بھی دکھائی دے رہی تھی۔ جو سنسان پڑی تھی۔ کسی وقت کوئی فوجی گاڑی تیز رفتاری سے گزر جاتی تھی۔

میں قزاق ساتھی سے زیادہ پریشان تھا۔ کیونکہ میں جاپانیوں کی قید سے بھاگا ہوا تھا۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ پوڈانگ پر قابض جاپانی فوجی مجھے شاید ہی پہچان سکیں پھر بھی میں نادانستہ طور پر ایک بار پھر خطرے کے منہ میں آ گیا تھا۔ اس بارے میں میں نے اپنے قزاق ساتھی کو کچھ نہ بتایا اور پائپ کے اندر بیٹھا سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کیونکہ صاف ظاہر تھا ہم وہاں سے کوئی بھی بحری جہاز پکڑ کر کسی دوسرے ملک کی طرف نہیں جاسکتے تھے۔ میرے قزاق ساتھی کو چونکہ صورت حال کی سنگینی کا علم نہیں تھا اس لئے وہ بڑا مطمئن تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اب ہم سمندری جہاز میں سفر نہیں کر سکیں گے تو وہ میری طرف منہ کھول کر تکنے لگا۔ "کیوں" میں نے کہا کہ یہ سارا علاقہ اب جاپانیوں کے قبضے میں ہے۔ جونہی ہم شہر میں داخل ہوں گے ہمیں مشتبہ سمجھ کر پکڑ لیا جائے گا اور پھر خدا جانے ہمارا کیا حشر ہو۔ قزاق نے بے نیازی سے کہا۔

"سیمرن ماں کے آدمی کو تم نہیں جانتے۔ وہ خفیہ طریقے سے ہمیں یہاں
سے کسی جہاز میں سوار کروا دے گا۔ تم دیکھ لینا۔"

قزاق احمقوں کی جنت میں رہ رہا تھا۔ اسے کچھ احساس نہیں تھا کہ حالات اچانک پلٹا کھا چکے ہیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ رات کسی نہ کسی طرح گزار لوں۔ پھر واپس جنگل میں سفر شروع کر دوں گا۔ آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں بھی جاپانی سپاہی آ جائیں گے۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہو گیا کہ میں ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ چار جاپانی فوجی اچانک ہمارے سامنے آ گئے۔ انہوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ ہم پائپ سے باہر نکل آئے۔ میں نے فوراً ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ میں جاپانی فوجیوں کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ مگر میرے ساتھی قزاق کو ان باتوں کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے یہ حماقت کی کہ پائپ سے باہر نکلتے ہی بیلٹ میں سے پستول نکال کر فائر کر دیا۔ ایک جاپانی نے اس پر اندھا دھند فائر

کھول دیا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ قزاق کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو کر تڑپنے لگا۔ ایک فوجی نے رائفل کا رخ میری طرف کیا۔ میں نے فوراً ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ ایک فوجی نے میری گردن پر رائفل کی نالی لگا دی۔ ایک فوجی جلدی سے اپنے شدید زخمی ساتھی کو اٹھا کر پیچھے لے گیا جہاں شاید ان کی کوئی میڈیکل پوسٹ تھی۔ باقی سپاہیوں نے قزاق کی جیبوں کی تلاشی لی تو ہیرے جواہرات سے بھری ہوئی تھیلی نکل آئی۔ جاپانی بڑے خوش ہوئے۔ میں نے ہاتھ نیچے کر لئے تھے اور اس وقت کو کوس رہا تھا جب میں نے اس قزاق کے ساتھ پوڈانگ کا رخ کیا تھا۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

جاپانیوں نے میرے ہاتھ پشت پر رسی سے باندھ دیئے اور مجھے لے کر بندرگاہ پر آ گئے۔ یہاں ایک فوجی حوالات میں بند کر دیا جہاں پہلے سے یہاں کے کچھ مقامی لوگ قید تھے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر صورت حال ایکدم بدل گئی تھی۔ میں اس آئے دن کی جاپانی قید سے تنگ آ گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیا کہ جو ہوگا مجھے قبول ہوگا۔ میں فرار کے بارے میں بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ میرے ساتھی قیدی پژمردہ اور بے یقینی کی کیفیت میں حوالات کی دیوار کے ساتھ لگ کر ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ کسی نے میری طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے بھی کسی سے کوئی بات نہ کی اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

قدرتی طور پر میں یہی سوچ رہا تھا کہ ہمیں ان کوارٹر گارڈ سے نکال کر پوڈانگ کے کسی قیدی کیمپ میں ڈال دیا جائے گا۔ جہاں ہم جنگ کے ختم ہونے تک انتہائی ناک زندگی بسر کریں گے۔ وہ بھی اگر ہم زندہ رہے تو ______ لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ دوسرے روز ہمیں بندرگاہ پر لے جا کر ایک بہت بڑے جنگی جہاز پر سوار کر دیا گیا جس کی توپوں کی نالیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ یہ بات میرے لئے ایک معمہ بن گئی کہ ہمیں جنگی جہاز پر کیوں لادا گیا ہے۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے جاپانی ہمیں یہاں سے آگے کسی جزیرے میں بنے ہوئے جنگی کیمپ میں لے جا رہے ہوں۔

ہمیں جہاز کے نیچے لے جا کر ایک سٹور میں بند کر دیا جہاں لکڑی کے خالی کھوکے ادھر

ادھر بکھرے پڑے تھے۔ وہاں پر کسی کھڑکی یا روشندان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جہاز کا یہ نچلا حصہ سمندر کے اندر تھا۔ ہم چھ ساتھ قیدی تھے۔ دو برمی تھے۔ ایک انڈونیشیا کا مزدور تھا اور باقی فلپائنی تھے جو اس شہر میں محنت مزدوری کرنے آئے ہوئے تھے کہ جاپانیوں نے انہیں پکڑ کر قید میں ڈال دیا۔

رات کے کسی لمحے جہاز چل پڑا۔ جب جہاز کو سمندر میں سفر کرتے دو دن گزر گئے تو ہمیں تشویش ہوئی کہ یہ جاپانی ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ اسی روز جہاز سمندر میں کسی جگہ رکا۔ ایک جاپانی فوجی آیا اور ہم قیدیوں میں سے دو کو پکڑ کر لے گیا۔ ایک گھنٹے بعد جہاز چل پڑا اگر دونوں قیدی واپس نہ آئے۔ دو تین گھنٹے بعد جہاز ایک بار پھر رکا اور وہی جاپانی فوجی آیا اور ہم میں سے دو مزید قیدیوں کو پکڑ کر لے گیا۔ ہم سمجھ گئے کہ آخری وقت آ گیا ہے۔ جاپانی ہمارے ساتھیوں کو جہاز کے عرشے پر لے جا کر شوٹ کر رہے ہیں۔ پھر خیال آتا کہ جہاز رکتا کیوں ہے؟ یہ چلتے جہاز پر سے بھی قیدیوں کو شوٹ کر کے لاشیں سمندر میں پھینک سکتے ہیں۔ تیسری بار جہاز رکا تو وہ مزید قیدیوں کو لے گئے۔ چوتھی بار جہاز رکا تو صرف میں اکیلا ہی قیدی رہ گیا تھا۔ جاپانی سپاہی مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اوپر عرشے پر لے آیا۔ میں دل میں خدا کو یاد کرنے لگا۔ کیونکہ صاف ظاہر تھا کہ جاپانی اوپر عرشے پر لے جا کر مجھے یا شوٹ کر دیں گے یا اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں گے۔ میں نے دیکھا کہ جہاز ایک چھوٹے سے سرسبز جزیرے کے قریب ساحل سے کچھ فاصلے پر سمندر میں کھڑا ہے۔ صبح کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ جہاز پر سے ایک کشتی اتار دی گئی۔ مجھے اس کشتی میں بٹھایا اور جزیرے کے ساحل پر لا کر چھوڑ دیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے جزیرے کے ساحل پر گولی سے اڑایا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا اور جاپانی سپاہی کشتی میں بیٹھ کر اپنے جہاز کی طرف واپس چلے گئے۔ تب معلوم ہوا کہ ان جاپانیوں نے قیدیوں کو الگ الگ ویران جزیروں میں جلا وطن کر دیا تھا۔ چنانچہ مجھے اکیلے ہی اس جزیرے پر اتار دیا گیا۔ میرا ساتھی بننے والا کوئی دوسرا قیدی باقی نہیں بچا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جاپانی جنگی جہاز نے لنگر اٹھا لیا اور پھر سمندر میں چلتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ جزیرہ غیر آباد نہیں ہے اور یہاں ضرور ماہی گیر قسم کے لوگ جنوبی ساحل کی طرف آباد ہوں گے۔ میں نے سارے جزیرے کو دیکھ ڈالا۔ مجھے کسی انسان کی شکل نظر نہ آئی۔ یہ جزیرہ بہت چھوٹا سا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے میں میں نے سارا جزیرہ گھوم کر دیکھ لیا۔ جزیرے کے اندر بڑے گھنے درخت تھے۔ ساحل سمندر پر جگہ جگہ بھوری چٹانیں زمین سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ جزیرے پر ایک دہشت ناک قسم کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سمندر کی لہریں بڑے سکون سے ساحل تک آ کر واپس چلی جاتیں۔ ناریل درختوں کے نیچے کافی تعداد میں گرے ہوئے تھے۔ یہی ناریل اب میری خوراک تھے۔ رات بسر کرنے کے لئے میں نے جھاڑیوں میں تھوڑی سی جگہ بنالی۔ سمندر میں شام کی روشنی جسے انگریزی میں Twilight کہتے ہیں بڑی دیر تک رہتی ہے۔ شام کو بھی درختوں پر کوئی پرندہ نہ آیا جس سے ثابت ہوا کہ یہ جزیرہ سمندر میں کافی فاصلے پر واقع ہے۔ مجھے رابنسن کروزو کا ناول یاد آ گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے بھی یہاں پندرہ بیس سال اکیلے گزارنے پڑیں گے؟ اس خیال سے ہی میں کانپ اٹھا۔ آدھی رات کے وقت آسمان پر چاند نکل آیا جس کی روشنی سمندر اور جزیرے پر پھیل گئی۔ خاموشی اور گہری ہو گئی تھی۔ میں سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی چپو چلاتا کشتی کو ساحل کی طرف لا رہا ہے۔

☆......☆......☆

چپوؤں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ کوئی کشتی ساحل کی طرف آ رہی ہے۔ میں جلدی سے جھاڑیوں سے نکل کر ساحل کی طرف آیا۔ اور ناریل کے درختوں کی اوٹ سے دیکھنے لگا۔ چاندنی میں ہر شے صاف نظر آ رہی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ساحل سے کچھ دور سمندر میں ایک بحری جہاز کھڑا ہے اور ایک بڑی سی کشتی جس میں کچھ آدمی سوار ہیں سمندر میں لہروں پر ڈولتی ساحل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کشتی ساحل پر آ کر رُک گئی۔ اس میں سے چھ سات آدمی چھلانگیں لگا کر اترے۔ پھر انہوں نے کشتی میں سے ایک ایسے آدمی کو کھینچ کر نیچے اتارا جس کے دونوں ہاتھ رسّی سے بندھے ہوئے تھے۔ اس آدمی کے بال کاندھوں تک آئے ہوئے تھے۔ چاندنی میں اس کا چہرہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔ وہ گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا جیسے اس کے پاؤں میں کوئی تکلیف ہو۔ چار آدمی اس کو اپنی نگرانی میں چلا رہے تھے۔ انہوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ دو آدمی تیزی سے آگے ساحل کی ریت پر ایک جگہ زمین میں لوہے کی لمبی لمبی میخیں ٹھونکنے لگے۔ میں یہ پُراسرار منظر بڑی حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ یہ کوئی بحری ڈاکو قسم کے لوگ ہیں اور اپنے کسی دشمن کو جزیرے پر قتل کرنے کے لئے لائے ہیں۔ اگر ایسی بات تھی تو پھر یہ زمین میں لوہے کی لمبی لمبی میخیں کس لئے گاڑی جا رہی تھیں؟ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ لیکن بہت جلد یہ معمہ حل ہو گیا۔

جب چاروں طرف لوہے کی چار میخیں زمین میں اچھی طرح سے گاڑھ دی گئیں تو ان لوگوں نے قیدی آدمی کو رائفل کی نوک پر ریت پر سیدھا لٹایا اور اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں لوہے کی میخوں کے ساتھ زنجیروں کی مدد سے مضبوطی سے باندھ دیئے۔ پھر ایک آدمی نے قیدی کے پیٹ پر زور سے لات ماری۔ قیدی زمین پر ان میخوں کے ساتھ اتنی مضبوطی سے کس کر بندھا ہوا تھا کہ وہ اپنا جسم نہ ہلا سکا اور صرف درد کی وجہ سے سر کو دائیں بائیں کرتا رہا۔ اس کے بعد ایک آدمی نے آگے بڑھ کر بندھے ہوئے قیدی کی کمر کے گرد ایک بیلٹ کس کر باندھ دی۔ پھر وہ سارے کشتی میں بیٹھ کر واپس اپنے جہاز کی طرف چل دیئے۔ ان کی کشتی جہاز پر اٹھا لی گئی۔ کچھ دیر بعد جہاز نے آہستہ آہستہ اپنا رخ بدلا اور دوسری طرف سمندر میں روانہ ہو گیا۔ میں درختوں میں اسی طرح چھپا بیٹھا رہا۔ جب جہاز کافی دور چلا گیا تو جلدی سے اس آدمی کے پاس گیا جس کو اس کے دشمن مرنے کے واسطے زمین پر باندھ گئے تھے۔

چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ اس آدمی نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسی علاقے میں عام بولی جانے والی شکستہ زبان میں کہا۔ ''فکر نہ کرو۔ میں تمہارا دشمن نہیں دوست ہوں'' اب بھی وہ آدمی حیرانی سے مجھے تکے جا رہا تھا۔ گویا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس ویران اور بے آباد جزیرے پر بھی کوئی انسان موجود ہو سکتا ہے۔ اس نے کسی قدر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''میری کمر کے ساتھ جو بیلٹ بندھی ہے اسے اتار کر سمندر میں پھینک دو جلدی کرو''

میں سمجھ گیا کہ پیٹی میں ضرور کوئی دھماکہ خیز مادہ بھرا ہوا ہے۔ میں نے جلدی سے پیٹی کھولی اور اسے دوڑ کر سمندر میں پھینک دیا۔ اس نے پیچھے سے آواز دی۔ واپس بھاگو میں واپس دوڑ پڑا۔ جب اس کے قریب پہنچا تو اس نے چلا کر کہا زمین پر لیٹ جاؤ۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ کوئی بیس سیکنڈ بعد جزیرہ ایک دھماکے کی آواز سے گونج اٹھا۔ بیلٹ کے ساتھ بندھا ہوا ٹائم بم پھٹ گیا تھا۔ میں نے اس آدمی کی زنجیریں کھول کر اسے آزاد کر دیا۔ وہ ریت پر بیٹھا اپنی کلائیوں اور ٹخنوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم رحمت کے فرشتہ بن کر کہاں سے آ گئے! کون ہو تم؟ یہ جزیرہ تو غیر آباد ہے۔''

میں نے اپنے بارے میں اصل حقیقت کو بیان نہ کیا اور صرف اتنا بتایا کہ سمندر میں ایک تجارتی جہاز کسی جاپانی آب دوز کا تارپیڈو لگنے سے ڈوب گیا تھا۔ میں کسی طرح بچ کر آج صبح ہی یہاں پہنچا ہوں۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور یہ کون لوگ تھے جو تمہیں ہلاک کرنے کی غرض سے یہاں باندھ گئے تھے۔

اس آدمی کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ رنگ زردی مائل تھا۔ چہرے کے نقش ہسپانوی خانہ بدوشوں ایسے تھے۔ بال سیاہ کالے اور چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں تھیں۔ اس نے میری طرف ایک بھرپور گہری نگاہ ڈالی اور بولا۔

"تم نے میری جان بچائی ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ میرا نام کارلو ہے۔ میرا تعلق ملک سپین کے ایک خانہ بدوش قبیلے سے ہے۔ میں ملک ملک کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میری ملاقات ایک شخص بردلو سے ہوگئی جو سمگلروں کے ایک بین الاقوامی گروہ سے وابستہ تھا۔ میں بھی اس میں شامل ہو گیا لیکن میں نے دیکھا کہ یہ لوگ منشیات کا دھندا کرتے ہیں تو میں نے بردلو سے کہا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا اور تم لوگوں سے الگ ہو رہا ہوں۔ اس وقت یہ لوگ اپنے بحری جہاز میں آسٹریلیا کی طرف جا رہے تھے۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ مجھے ان کو بتانے کی بجائے خاموشی سے کسی بندرگاہ پر اترنے کے بعد غائب ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر میں نے بردلو پر اعتبار کیا کیونکہ میں اسے اپنا دوست سمجھتا تھا۔ تب انہوں نے مجھے ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی وقت مجھے باندھ کر جہاز کے تہہ خانے میں ڈال دیا اور پھر اس جزیرے پر مرنے کے لئے چھوڑ گئے۔ اگر تم دس پندرہ منٹ دیر کر دیتے تو میری کمر کے ساتھ بندھا ہوا ٹائم بم پھٹ جاتا اور میرے جسم کے پرخچے اڑ جاتے۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"یہ سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوا ہے۔ ابھی تمہاری زندگی باقی تھی۔ پس خدا نے پہلے مجھے اس جزیرے پر بھیج دیا تاکہ میں تمہیں موت کے منہ سے بچا سکوں۔"

کارلو نے جزیرے کے درختوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کیا اس جزیرے میں جنگلی پھلوں کے درخت ہیں؟"

میں نے جواب میں کہا۔ "میں کل صبح ہی یہاں آیا ہوں۔ میں نے سارے جزیرے کو دیکھا ہے۔ مجھے سوائے ناریل کے کوئی پھل دار درخت نظر نہیں آیا۔" کارلو نے اپنے گھٹنے کو دباتے ہوئے کہا۔

"جہاز میں انہوں نے مجھ پر تشدد بھی کیا تھا۔ بردلو چاہتا تھا کہ میں منشیات کے دھندے میں ان کا ساتھ دوں۔ مگر میرے ضمیر کو یہ گوارا نہیں تھا۔ میں منشیات کو انسانیت کا دشمن سمجھتا ہوں۔ میرے گھٹنے پر انہوں نے لوہے کی سلاخیں ماری تھیں۔ کوئی بات نہیں یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جنگلی جڑی بوٹیوں کا بھی ماہر ہوں۔ سپین کے خانہ بدوشوں کو جڑی بوٹیوں کا بڑا علم ہوتا ہے۔ اس جزیرے میں مجھے وہ بوٹی ضرور مل جائے گی جو میرے گھٹنے کا درد ختم کر کے رکھ دے گی۔ میرا خیال ہے کچھ دیر آرام کر لیتے ہیں صبح اٹھ کر جزیرے کا جائزہ لوں گا۔"

ہم وہیں ریت پر لیٹ گئے۔ چاند مغرب میں ڈھلنے لگا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہم بہت جلد گہری نیند سو گئے۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب ساحل پر چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کارلو وہاں نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ناریل کے درختوں کی قطار میں سے نکل کر میری طرف آیا۔ وہ ناریل کو توڑ کر کھا رہا تھا۔ ریت پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"میں نے سارا جزیرہ دیکھ لیا ہے۔ یہاں سوائے ناریل کے کھانے کے واسطے دوسرا کوئی جنگلی پھل نہیں ہے اور خالی ناریل پر ہم زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتے"

میں نے کہا۔ "مگر یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔"

کارلو سر ہلا کر بولا۔ "کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائے گا میں فلپائن کی طرف جاتے ہوئے اس علاقے سے کئی بار گزر چکا ہوں۔" اس نے اپنی پرانی پتلون اوپر کھسکا کر مجھے اپنا گھٹنا دکھایا جس پر کوئی سرخ رنگ کی دوا لگی تھی۔ کہنے لگا۔ "مجھے میرے مطلب کی بوٹی یہاں مل گئی تھی۔ اس کا رس گھٹنے پر لگا دیا ہے۔ درد بہت کم ہو گیا ہے۔"

وہ جزیرے کے مغرب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

ہم ساحل کی ریت پر سمندر کے ساتھ ساتھ چلتے جزیرے کے مغربی علاقے میں آ گئے۔ یہاں بھورے رنگ کی چھوٹی بڑی بے شمار چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کارلو بولا۔

"یہاں سے اگر ہم جنوب مغرب کی طرف سمندر میں سفر کرنا شروع کریں تو پہلے مڈغاسکر اور پھر جنوبی افریقہ آ جائے گا۔ شمال مشرق مغرب میں زوروں کی جنگ ہو رہی ہے۔ جنوبی افریقہ میں ابھی تک امن ہے۔ اگرچہ وہاں بھی جنگی حالت ہے۔ جنوبی افریقہ پر انگریز قابض ہیں۔ وہاں ہمیں پناہ مل جائے گی۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ ہمیں آگے کہاں جانا ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن مڈغاسکر تک ہم کیسے پہنچیں گے کارلو؟"

کارلو بولا۔

"یہی سوال مجھے پریشان کر رہا ہے۔ کیونکہ اس جزیرے اور جنوبی افریقہ کے جزیرے مڈغاسکر تک بحر الکاہل کا ایک بہت بڑا سمندر پھیلا ہے۔ صرف ایک بات حوصلہ دیتی ہے کہ یہ سمندر ہمیشہ پُرسکون رہتا ہے۔ اگر ہم درختوں کے تنے جوڑ کر اسا تختہ بنا کر سمندر میں چل پڑیں تو میرے اندازے کے مطابق سمندر کی لہریں ہمیں بیس بائیس دنوں میں مڈغاسکر یا افریقہ کے مشرقی ساحل پر پہنچا دیں گی۔"

کارلو کی سکیم کافی خطرناک تھی۔ اس میں زندہ ساحل تک پہنچنے کی امید بہت کم تھی۔ لیکن اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ ہم نے گرے پڑے درختوں کے تنوں کو جوڑنا شروع کر دیا۔ ہم ایک ایسی ناپائیدار کشتی تیار کر رہے تھے جو بحر الکاہل جیسے عظیم الشان سمندر میں کہیں بھی ہمارا ساتھ چھوڑ سکتی تھی۔

☆......☆......☆

درختوں کے گرے پڑے تنوں کو ہم نے ایک دوسرے سے اچھی طرح مضبوطی سے باندھ لیا۔ اس کام کے لئے ہم نے وہ زنجیریں بھی استعمال کیں جن سے کارلو واس کے دشمن باندھ کر چلے گئے تھے۔ ان کے علاوہ جنگلی بیلوں کی موٹی موٹی رسیوں کو بھی کام میں لائے۔ یہ ایک کافی چوڑا سا تختہ بن گیا جس پر ہم نے درمیان میں ناریلوں کا ایک ڈھیر لگا دیا اور اسے بھی قدرتی رسیوں کے جال سے جکڑ دیا تاکہ سمندر میں ڈولنے کی وجہ سے ناریل سمندر میں نہ پھسل جائیں۔ یہ کوئی ایسا پختہ اور یقینی انتظام نہیں تھا۔ لیکن ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہم جب بھی اس جزیرے سے نکلتے ہمیں یہی کرنا پڑتا۔

کارلو ایک ماہر ملاح بھی تھا۔ اسے سمندری سفر کا بڑا تجربہ تھا۔ اس نے تختے کے درمیان میں درخت کی ایک شاخ گاڑ کر اس کے ساتھ اپنی قمیض باندھ دی تاکہ ہوا کے رخ کا پتہ چل سکے۔ آخر ایک روز منہ اندھیرے ہم اپنی ناپائیدار تختے نما کشتی پر بیٹھ گئے۔ کارلو نے رسی کو کھول دیا۔ رسی کے کھلتے ہی تختہ سمندر میں ایک طرف آہستہ آہستہ چل پڑا۔ پھر ایک بڑی سی موج نے اسے پہلے اوپر اٹھایا پھر پیچھے کی طرف ڈال دیا۔ ہمارا تختہ جزیرے کے ساحل سے تیزی کے ساتھ دور ہونا شروع ہو گیا۔ اور پھر کوئی ایک گھنٹے کے بعد جزیرہ نظروں سے اوجھل ہوا اور ہم کھلے

سمندر میں آ گئے۔

کھلے سمندر میں آتے ہی میرا دل بیٹھ گیا۔ چاروں طرف سبز رنگ کا وسیع و عریض سمندر ہی سمندر تھا۔ جس کی اوپر نیچے ہوتی سطح پر ہمارا تختہ اپنے آپ ایک طرف بہتا چلا جا رہا تھا۔ انسان جب کسی بحری جہاز میں سفر کرتا ہے تو سمندر کی سطح جہاز کے عرشے سے کافی نیچے ہوتی ہے اور انسان کو اتنا خوف محسوس نہیں ہوتا لیکن ہم تو بالکل سمندر کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ بھی خطرہ تھا کہ کوئی شارک مچھلی ٹکر مار کر ہمارے تختے کو نہ الٹ دے۔ مگر کارلو بڑا مطمئن تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ سمندر سارا سال پرسکون رہتا ہے۔ اس میں بہت کم طوفان آتے ہیں۔ اور اگر کوئی طوفان آ بھی گیا تو ہم اپنے آپ کو رسیوں سے باندھ لیں گے۔ ویسے بھی یہ تختہ ڈوب نہیں سکتا نہ اس میں پانی بھر سکتا ہے۔ بس کسی نہ کسی طرح ہمیں اس کے ساتھ چمٹے رہنا ہوگا۔"

کارلو نے ہدایت کر دی تھی کہ ہم دن میں چار چار ناریلوں سے زیادہ نہیں کھائیں گے۔ انہی کا پانی پئیں گے اور گری کھا کر بھوک مٹائیں گے۔ اس حساب سے ہمارے پاس دو مہینے کی خوراک تھی۔ ایک خطرہ بہرحال اپنی جگہ پر موجود تھا کہ کہیں کسی جاپانی یا جرمن جنگی جہاز سے سامنا نہ ہو جائے۔ پھر اسی سمندر میں جنگی آبدوزیں بھی پانی کے اندر چل پھر رہی تھیں۔ پھر ساحل کے قریب پہنچ کر ہماری کشتی یا تختہ سمندر میں تیرتی کسی بارودی سرنگ سے ٹکرا کر تباہ ہو سکتا تھا۔ غرض کہ ہم ہزاروں قسم کے خطرات کو ساتھ لئے سمندر میں سفر کر رہے تھے۔

پہلے تین دن آرام سے گزر گئے۔ چوتھے دن دوپہر کے بعد بادل چھا گئے اور تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ ہمارا تختہ بری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ کارلو بڑی مہارت سے تختے کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کئی بار یہ تختہ گھوم جاتا۔ مگر اسکا رخ جنوب مغرب کی طرف رہا۔ کیونکہ سمندری موجوں کا رخ بھی اسی طرف تھا۔ تیز ہواؤں نے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ سمندری موجوں اور ہواؤں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہم نے اپنے آپ کو رسیوں سے جکڑ لیا تھا اور تختے پر لیٹ گئے تھے۔ ایک زبردست طوفانی موج نے ہمیں نیچے سے اٹھا کر کئی

گز دور دوسری موج پر پھینک دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تختہ الٹا نہیں تھا۔ وہ رسی ٹوٹ گئی جس کے ساتھ ناریلوں کا جال بندھا تھا۔ کتنے ہی ناریل جال میں سے نکل کر سمندری لہروں کی نظر ہو گئے۔ کارلو نے اپنے آپ کو جال کے اوپر گرا دیا اور باقی ناریلوں کو گرنے سے بچا لیا۔ خدا خدا کر کے طوفان کا زور کم ہوا۔ مگر ہوا اب بھی بڑی تیز چل رہی تھی۔ بارش بھی ہو رہی تھی۔ جب طوفان ختم گیا اور سمندر بھی قدرے پرسکون ہوا تو ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں نے کارلو سے کہا۔ "تم تو کہتے تھے کہ اس سمندر میں طوفان نہیں آتے۔ یہ طوفان کہاں سے آ گیا؟"

کارلو بولا۔ "میں نے تو کہا تھا کہ اس سمندر میں کبھی کبھار ہی طوفان آتے ہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ کبھی کبھار کا طوفان آج ہی آ جائے گا۔ بہرحال ہمارے پاس اتنے ناریل بچ گئے ہیں کہ ہم مزید تین ہفتے گزارہ کر سکتے ہیں۔" لیکن آگے کیا ہونے والا تھا اسکی ہمیں خبر نہیں تھی۔

ہمارا بے یار و مددگار سمندری سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ میرا خیال ہے بحر الکاہل کے وسیع و عریض سمندر میں یہ ہمارا سولہواں سترہواں دن تھا۔ ناریل کی گری ہمارے جسموں کی پوری نشوونما نہیں کر سکتی تھی۔ ہم بھوک پیاس سے تو بچ گئے تھے مگر میں اپنے جسم میں کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ کارلو کا بھی یہی حال تھا۔ ہم زیادہ تر تختے پر لیٹے رہتے۔ سمندری لہریں اسے اپنے آپ جنوب مغرب کی طرف دھکیلے لئے جا رہی تھیں۔ اس وقت مجھے دو ایک بار اپنا شہر لاہور بڑا یاد آیا۔ بھاٹی گیٹ کی رونق یاد آ گئی اور دل نے کہا کس نے تمہیں اپنا شہر چھوڑنے کو کہا تھا۔ لیکن پھر یہ خیال بھی آتا کہ آخر ایڈونچر ایڈونچر ہوتا ہے۔ اسکا تجربہ شہروں میں بیٹھ کر نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی زندہ قوموں کے افراد نے اسی طرح سمندروں میں خطرات مول لے کر نئے نئے ملک دریافت کئے ہیں اور مسلمان عرب ملاحوں نے آج سے سینکڑوں برس پہلے سمندروں میں سفر کر کے ملایا اور چین تک تجارتی راستے دریافت کئے تھے۔ اس خیال سے میرا حوصلہ بڑھ جاتا مگر سمندر میں بالکل کھلی حالت میں سفر کرنے سے ہمارا برا حال ہو گیا تھا۔ سمندری ہوا نے ہمارے جسموں پر نمک کی ایک تہہ قلم کی طرح چڑھا دی تھی جو سخت پریشان کر رہی تھی۔ سمندر کی کوئی لہر ہمارے اوپر سے گزرتی تو

مزید نمک کی تہہ چڑھ جاتی۔ ہمارے رنگ سانولے ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں حلقے پڑنے لگے تھے۔ میں کسی وقت حوصلہ ہارنے لگتا تو کارلو اپنی باتوں سے دوبارہ میرے اندر نئی طاقت بھر دیتا۔

ایک دن سمندر پر دھوپ پھیلی تھی۔ اسکی چمک ہمیں حسب معمول پریشان کر رہی تھی۔ ہم دوپہر کا لنچ کر رہے تھے۔ یعنی ایک ایک ناریل ہمارے ہاتھ میں تھا۔ اسکا پانی پینے کے بعد اسکی گری کھا رہے تھے کہ اچانک ہمیں کچھ فاصلے پر سمندر میں ایک جزیرہ سا ابھرا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے خوشی سے تقریباً چیخ کر کہا۔

"کارلو! زمین آ گئی"

زمین کی قدر کھلے سمندر میں پہنچ کر ہی ہوتی ہے۔ کارلو نے اس طرف دیکھا تو بجائے خوش ہونے کے وہ پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"وہ زمین نہیں وہیل مچھلی ہے۔"

میرے دیکھتے دیکھتے اس ویل مچھلی کی گردن سے پانی کا ایک فوارہ سا نکلا اور پھر وہ سمندر میں غوطہ لگا گئی۔ کارلو نے گھبرا کر کہا۔

"اپنے آپ کو رسی سے جکڑ کر لیٹ جاؤ۔ اس نے ہمیں دیکھ دیا ہے۔ وہ اب ہمارے نیچے آ کر ہمیں الٹانے کی کوشش کرے گی۔"

ہم نے جلدی جلدی اپنے آپ کو رسیوں میں باندھا اور تختے سے چمٹ گئے۔ کوئی دو منٹ بعد تختہ اوپر کو اٹھا اور پھر وہ سمندر کی سطح سے کوئی پندرہ بیس فٹ اوپر کو اچھلا۔ میرے منہ سے خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔ تختہ الٹنے کی بجائے بالکل اسی طرح سمندر کی لہروں پر آن گرا۔

کارلو چلایا۔

"اسی طرح لیٹے رہنا۔ وہیل نے دیکھ لیا تو وہ اسے تباہ کر دے گی۔"

ہماری خوش قسمتی تھی کہ ویل دوبارا ہمیں نہ دیکھ سکی۔ اس کے خیال میں ہم تختے سے گر کر سمندر میں ڈوب چکے تھے۔ ہم بھی وہیل کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ لہریں بڑے زور و شور سے ٹکرا رہی

تھیں۔ کچھ دیر بعد سکون ہو گیا۔ کارلو نے سر اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ "وہیل نکل گئی ہے۔"

پہاڑ جتنی بڑی وہیل مچھلی ضرور نکل گئی تھی لیکن ہمارے باقی بچے ہوئے کافی ناریل سمندر کی نظر ہو گئے تھے۔ اب کارلو کو بھی تشویش ہوئی۔ کہنے لگا۔

"ہمارے پاس صرف چار دن کی خوراک رہ گئی ہے۔ اب کوئی نہ کوئی ساحل ضرور نظر آ جانا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "کہیں ہم سمندر میں بھٹک تو نہیں گئے؟"

کہنے لگا۔ "رات کو ستارے دیکھ کر ہی بتا سکوں گا"

جب رات آئی تو ہم بے دم سے ہو کر تختے پر پڑے تھے۔ کارلو نے ستاروں کو غور سے دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"ہم ٹھیک سمت کو جا رہے ہیں۔"

میں نے لیٹے ہی لیٹے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اب میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ کسی وقت دل چاہتا آہستہ سے سمندر میں پھسل جاؤں۔ خدا جانے یہ سمندر کا طلسم تھا یا کیا بات تھی کہ سمندر مجھے اپنی طرف کھینچنے لگا تھا۔ بلانے لگا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ میرے لئے سمندر میں بڑا سکون ہے۔ سمندر میں گرتے ہی میری ساری تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔ لیکن اللہ نے ہماری بڑی مدد کی اور عین اسی وقت دور سے زمین کی کالی لکیر نظر آ گئی جب ہم زندگی سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔

سب سے پہلے یہ لکیر کارلو نے دیکھی۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے دکھائی۔ یہ سیاہ لکیر سمندری موجوں میں کسی وقت ڈوب بھی جاتی تھی۔ کارلو نے کہا۔ "یہ زمین ہے۔" "ضرور یہ ڈغاسکر کا ساحل ہو گا"

یہ لکیر آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی۔ اب سمندر میں ہمیں لہروں کے ساتھ گھاس اور جھاڑیاں بھی تیرتی نظر آنے لگی تھیں۔ کچھ بگلے بھی ہمارے اوپر سے اڑتے ہوئے گذر گئے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ہم خشکی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کافی دیر تک ہمارا تختہ لہروں پر بہتا رہا۔

اب لہروں کا زور اور رخ ساحل کی طرف ہو گیا تھا اور وہ ہمارے تختے کو بڑی تیزی سے ساحل کی طرف لے جا رہی تھیں۔ دور دور درختوں کے جھنڈ واضح ہونے لگے۔ چٹانیں بھی نظر آنے لگیں۔ آخر سمندری لہروں نے ہمارے تباہ شدہ تختے کو اچھال کر ساحل کی گیلی ریت پر پھینک دیا۔ ہم تختے پر سے پھسل کر ریت پر اوندھے گر پڑے اور وہیں پڑے رہے۔ جیسے خشکی زمین کا شکریہ ادا کر رہے ہوں اس نے آخر ہمیں اپنے ساتھ لگا لیا۔ پھر ہم ریت پر بیٹھ گئے۔ ایک لگا ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک چلے گئے درختوں پر ڈالی۔ کارلو نے دور مجھے ایک لائٹ ہاؤس کا مینارہ دکھاتے ہوئے کہا۔

"ہم کسی براعظم پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ کوئی جزیرہ نہیں ہے۔"

☆---☆---☆

ہم ساحل کی ریت پر تھکے ہارے بیٹھے تھے کہ وہاں کچھ لوگ آ گئے۔ یہ حبشی لوگ تھے مگر جنگلی نہیں تھے۔ ان میں سے کچھ نے نیکریں پہن رکھی تھیں اور سر پر ٹوپیاں کے ویسٹ تھے۔ میرا ساتھی کارلو فرانسیسی زبان جانتا تھا۔ اس نے ان سے پوچھا کہ یہ کونسا ملک ہے۔ ایک حبشی نے کہا۔ یہ موزمبیق کا ملک ہے۔ کارلو نے انہیں اپنے خوفناک سمندری سفر کی داستان مختصراً سنائی۔ وہ ہمیں اٹھا کر ایک قصبے میں لے گئے جہاں ہمیں کھانے پینے کو چیزیں دی گئیں۔ یہ لوگ بڑے نیک دل تھے۔ انہوں نے ہمیں تین دن وہاں رکھا اور ہماری خوب خاطر مدارت کی۔ ان کی زبانی ہمیں پتہ چلا کہ جرمنوں اور انگریزوں کی اس وقت جنگ اوپن غازی کے مقام پر لڑی جا رہی ہے۔ ہم اس وقت جنوب مشرقی افریقہ میں تھے جہاں جنگ کے اثرات نہ ہونے کے برابر تھے۔ تین دن میں ہماری طاقت بحال ہو گئی تھی۔ کارلو کہنے لگا۔ یہاں سے سپین جانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم یہاں سے سوڈان جائیں۔ پھر موریطانیہ سے ہوتے ہوئے مراکو پہنچیں۔ مراکو کی شمالی بندرگاہ ٹانجیر سے سپین بالکل اوپر تھوڑے فاصلے پر ہے۔ درمیان میں آبنائے جبرالٹر ہے۔ مگر اس کے لئے ہمیں سارے وسطی افریقہ کے گھنے جنگلوں اور موریطانیہ کے صحرا سے گزرنا پڑے گا۔ جو بہت مشکل کام ہے۔ مگر دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اوپر شمال کی طرف جنگ ہو رہی ہے۔ ادھر سارے

راستے بند ہوں گے۔"

میں بھی سوچ میں پڑ گیا۔ میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ کارلو کے ساتھ سپین کے خانہ بدوشوں میں شامل ہو جاؤں گا اور ان کے رسم و رواج اور رومانوی زندگی کا مطالعہ کروں گا۔ کیونکہ میں نے ہسپانوی خانہ بدوشوں کے بارے میں بڑی دلچسپ رومانٹک باتیں سن رکھی تھیں۔ اور پھر دل میں یہ خواہش بھی تھی کہ اس ملک کو دیکھوں گا جہاں مسلمانوں نے سات سو سال حکومت کی تھی۔ جہاں مسلمان سائنس دانوں نے ایسے ایسے تجربات کیے تھے اور سائنسی کارنامے انجام دیئے تھے کہ جن سے آج بھی یورپ فائدہ اٹھا رہا ہے۔

میں غرناطہ، الحمراء اور مسجد قرطبہ دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن کارلو نے وہاں تک پہنچنے کی جو ترکیب بیان کی تھی وہ بڑی خطرناک ہی نہیں تھی بلکہ بہت حد تک ناممکن بھی تھی۔ ہم ناریل ساتھ لے کر سمندری سفر تو کر سکتے تھے مگر آدم خوروں اور زہریلے سانپوں والے گھنے جنگلوں اور سورج کی تپش میں جلتے ہوئے صحراؤں کو عبور نہیں کر سکتے تھے۔ اس طویل سفر کے واسطے روپوں کی بھی ضرورت تھی۔ جو ہمارے پاس نہیں تھے۔ میں نے کارلو کو مشورہ دیا کہ ہمیں سپین تک پہنچنے کے لئے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا چاہیے۔ کارلو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہی ایک نزدیکی اور ممکن راستہ ہے۔ فکر نہ کرو۔ ہم پورا سامان اور اسلحہ لے کر چلیں گے۔"

جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ ہم افریقہ کے سارے وسطی علاقے سے ہی گزر کر سپین تک پہنچنے کی کوشش کریں گے تو اس کے لئے ہم نے پیسے جمع کرنے کا سلسلہ بھی بنا لیا۔ ہم وہیں بندرگاہ پر کام کرنے لگے۔ کوئی دو ماہ بعد اتنی رقم اکٹھی ہو گئی جو ہمارے اخراجات کے لئے کافی تھی۔ سب سے پہلے ہم نے ایک ایک رائفل اور ایک ایک پستول خریدے۔ دو خنجر بھی خرید لئے جن پر سوار ہو کر ہمیں یہ خطرناک سفر کرنا تھا۔ دو چار تھیلے، بسکٹوں اور خشک دودھ اور خشک گوشت کے ڈبے بھی ساتھ رکھ لئے اور ایک نقشہ بھی لیا جس کو غور سے دیکھنے کے بعد کارلو نے جگہ

جگہ نشان لگا دیئے۔ موزمبیق نام ہی کے ساحلی شہر سے ریل گاڑی ویلا کبرال تک جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ یہاں سے آگے افریقہ کی سب سے بڑی نیاسا یا ملاوی جھیل تھی۔ جھیل پار کرنے کے بعد ہم ملاوی کے ملک میں داخل ہو جاتے۔ وہاں سے ہمیں زمبابوے اور پھر زائر کے ممالک سے گزر کر نائجیریا سے ہوتے ہوئے موریطانیہ اور شمال مغرب میں مراکو پہنچنا تھا۔ یہ اتنا طویل سفر تھا کہ آج جب میں افریقہ کا نقشہ دیکھتا ہوں تو حیرت میں گم ہو جاتا ہوں کہ ہم نے اتنے بڑے براعظم کے خطرناک جنگلوں اور خونی صحراؤں میں اکیلے سفر کرنے کا ارادہ کیسے کر لیا۔

بہر حال ہم نے ارادہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا اور ٹرین میں سوار ہو کر جھیل ملاوی کے مشرقی کنارے والے ویلا کبرال کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ ابھی اس ملک کا نام یہاں لینڈی ہی تھا۔ یہاں سے ہم نے سب سے آخری ڈبے میں سے اپنے خچروں کو اتارا اور جھیل نیاسا یا کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب ہمیں جھیل پار کرکے tLiving Stone ام کے قصبے سے زمبابوے کے باڈر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے وسطی افریقہ کے ملک زائر میں داخل ہونا تھا۔ اس ملک کے شروع میں جنگل تھے اور شمال کی طرف صحرا تھا۔

بہر حال ہم نے رات کو ایک جگہ آرام کیا۔ دوسرے دن نقشے کے مطابق اور وہاں کے لوگوں کی راہ نمائی میں جھیل نیاسا یا کے کنارے آ گئے۔ اس جھیل کا نام وکٹوریہ جھیل بھی تھا۔ اسے مشہور انگریز سیاح Living stone نے دریافت کیا تھا۔ اور یہ دریائے نیل کا منبع بھی ہے۔ میں جانتا ہوں آپ اس تمہید سے ضرور بور ہو رہے ہوں گے لیکن یقین کریں آگے آپ کی دلچسپی کی اتنی باتیں اور واقعات آنے والے ہیں کہ آپ کسی لمحے تو ششدر رہ کر رہ جائیں گے۔ صرف تھوڑی دیر کی بوریت برداشت کریں۔ کیونکہ جھیل وکٹوریہ بہت بڑی جھیل ہے۔ اسے دیکھ کر خدا کی شان یاد آ گئی۔ میں حیران تھا کہ عین خشکی کے درمیان سمندر جتنی وسیع جھیل کہاں سے پیدا ہو گئی؟ جھیل کو ہم نے ایک بہت بڑے بجرے کے ذریعے پار کیا اور اسے پار کرتے ہوئے کئی گھنٹے لگ گئے۔ اس قصبے میں ہم نے رات ایک سرائے میں بسر کی۔ سرائے میں ایک بوڑھے نیگرو سے

ملاقات ہوئی۔ اس نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہمیں زائیر جانے کی بجائے وہیں سے اوپر تنزانیہ سے ہوتے ہوئے نیروبی پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ زائیر کے راستے میں ایسے ایسے گنجان جنگل ہیں جہاں آج تک کوئی انسان نہیں گیا اور جہاں بڑے وحشی جنگلی قبیلے آباد ہیں۔ کارلو مجھے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا۔

''نیروبی کینیا میں ہے اور وہاں انگریزوں کی حکومت ہے اور میری اطلاع کے مطابق جنگ ہو رہی ہے۔ ہمیں وہاں پہنچتے ہی پکڑ لیا جائے گا''

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کارلو انگریزی علاقے کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا ہے۔ اس کی کوئی وجہ ضرور تھی جو مجھے معلوم نہیں تھی ہو سکتا ہے وہ کوئی مفرور قاتل ہو۔ بہر حال میں کارلو کے رحم و کرم پر تھا اور اکیلا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے لامحالہ کارلو کے تجویز کیے ہوئے پروگرام کے مطابق ہی سفر کرنا تھا۔ چنانچہ ہم نیروبی کی سمت جانے کی بجائے Living Stone سے زائیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم باڈر سے ذرا ہٹ کر ایک جنگل میں سے گذر رہے تھے۔ راستے میں ایک دریا آ گیا جس کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اسکا پانی گدلا اور تیز تھا۔ یہاں ایک ملاح نے اپنی کشتی پر ہمیں دریا پار کرایا اور ہمیں آگے جنگل کے راستے سفر کرنے کی بجائے مشورہ دیا کہ ہم دریا کے کنارے کنارے اوپر کی طرف جائیں مگر کارلو نے پھر وہی ضد کی کہ اس طرح سفر لمبا ہو جائے گا اور ہم جنگ والے علاقے میں پہنچ جائیں گے۔

چنانچہ ہم دریا کو چھوڑ کر جنگل میں داخل ہو گئے، ہم نے کھانے پینے کی کافی چیزیں اپنے ساتھ رکھ لی تھیں اور خچر برابر ہمارا ساتھ دے رہے تھے۔ دو دن تک ہم تاریک براعظم افریقہ کے ان گھنے وسطی جنگلوں میں سفر کرتے رہے۔ راستے میں ہم نے کئی سانپ مارے۔ ایک شیر کو بھی زخمی کیا۔ ابھی تک ہمیں کسی وحشی قبیلے کے لوگ نہیں ملے تھے۔

تیسرے دن ہم خچروں سے اتر کر جنگل کے دشوار گذار جھاڑیوں کو کاٹتے ہوئے قدم قدم آگے بڑھ رہے تھے کہ ہمیں اپنے بائیں جانب مہاگنی کے سیاہ کالے اور گنجان درختوں کے

درمیان ایک چھوٹی سی پکی سڑک نظر پڑی۔ ہم جلدی سے وہاں آئے اور سڑک کو غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔

''خدا کا شکر ہے سڑک آئی اب ہم خچروں پر بیٹھ کر سفر کر سکیں گے۔''

مگر کارلو خوش ہونے کی بجائے کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ وہ سڑک پر ایک جگہ سیاہ دھبے کو جھک کر غور سے دیکھ رہا تھا۔ میری طرف اشارہ کر کے بولا۔

''ڈیزل کا نشان ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی شکاری ادھر سے جیپ پر گذرا ہوگا۔''

کارلو نفی میں سر ہلا کر بولا۔

''نہیں۔ یہ ٹرک کے پہیوں کے نشان ہیں۔''

ابھی ہم ان نشانوں کا معائنہ ہی کر رہے تھے کہ پیچھے سے کسی ٹرک کے انجن کی آواز سنائی دی۔ کارلو میرا بازو پکڑ کر مجھے کھینچتا ہوا درختوں کے پیچھے لے گیا۔ یہاں ہمارے خچر بھی جھاڑیوں کے پتے کھا رہے تھے۔ ہماری آنکھیں سڑک پر لگی تھیں۔ ٹرک کی آواز قریب آ رہی تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ایک بڑا سا ٹرک جس کی چھت نہیں تھی سڑک پر نمودار ہوا۔ اسے ایک گورے رنگ کا مونچھوں والا آدمی چلا رہا تھا۔ اس نے سر پر چیتے کی کھال کا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ ٹرک میں پندرہ بیس حبشی اس حالت میں بیٹھے تھے کہ دو گورے رنگ کے آدمی رائفلیں ہاتھوں میں لئے ان کے سر پر کھڑے تھے۔ ٹرک گذر گیا تو کارلو کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

''ہم ایک ایسے جرائم پیشہ لوگوں کے علاقے میں آ گئے ہیں جو آدم خور جنگلیوں سے زیادہ خونخوار ہیں۔''

میں اسکا منہ تکنے لگا کہ یہ کس نئی مصیبت کا سامنا ہو گیا۔

☆......☆......☆

میں اور میرا ہسپانوی ساتھی کارلو وسطی افریقہ کے گھنے جنگل میں گنجان درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھے تھے۔ کارلو جلدی سے اٹھ کر اس طرف گیا جدھر سے ابھی ابھی ٹرک گذرا تھا۔ پھر وہ واپس آ کر بیٹھ گیا اور اپنی چمکیلی آنکھوں سے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں وہ بولا۔

''میں نے سن رکھا ہے کہ افریقہ کے جنگلوں میں کہیں کہیں جرائم پیشہ گوروں نے اپنے ناجائز کاروبار کے ایسے اڈے بنا رکھے ہیں جہاں وہ لوگوں کو اغواء کر کے لاتے ہیں پھر انہیں یا تو بھاری تاوان لے کر چھوڑ تے ہیں یا انہیں ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ انہوں نے نیگرو لوگوں کو زبردستی غلام بھی بنا رکھا ہے۔ میرا خیال ہے ہم بھٹک کر ایسے ہی کسی جرائم پیشہ علاقے میں نکل آئے ہیں۔''

''ہمیں فوراً یہاں سے واپس چل دینا چاہیے۔'' میں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

کارلو بولا۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں''

اس کے فوراً بعد ہم دونوں اس راستے پر واپس جا رہے تھے جدھر سے چل کر ہم ان گنجان درختوں کے ذخیرے میں آئے تھے۔ ابھی ہم نے تھوڑا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ خدا جانے

کدھر سے مشین گن کا فائر آیا اور درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹ کر ہم پر گریں۔ ہم فوراً زمین پر لیٹ گئے۔ کارلو نے ریوالور نکال لیا ہم کہنیوں کے بل رینگنے لگے۔ مشین گن کا دوسرا برسٹ فائر ہوا۔ گولیاں ہمارے قریب ہی دائیں بائیں آ کر گریں۔ کارلو نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پیچھے کو دو چار فائر کر دیئے۔ مگر ہم جرائم پیشہ لوگوں کے نرغے میں آ چکے تھے۔ چھ سات آدمی برین گنیں تانے جھاڑیوں کے پیچھے سے نمودار ہوئے اور ہمیں ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا۔ وہ سب گورے تھے۔ سروں پر چیتے کی کھال کے شکاری ہیٹ تھے۔ کمر کے ساتھ لمبے چھرے لٹک رہے تھے۔ تقریباً سبھی کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ میرے پاس پستول وغیرہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کارلو نے ریوالور پھینک دیا۔ ہم نے ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ اسی وقت ہمارے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے۔ اور ہمیں جنگل میں ایک طرف دھکیلا جانے لگا۔ کچھ دور تک یہ لوگ ہمیں درختوں میں چلاتے رہے۔ پھر چھوٹے چھوٹے ٹیلے آ گئے۔ یہاں جنگل میں چھوٹی سی پکی سڑک پر ایک جیپ کھڑی تھی۔ ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہمیں جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ جیپ نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ جنگل میں کتنے ہی موڑ گھومنے کے بعد ایک جگہ جیپ رکی تو ہماری آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ میں نے دیکھا کہ جیپ اونچی خاردار دیوار کے سامنے گیٹ کے پاس کھڑی تھی۔ گیٹ بھی خاردار تاروں والا تھا۔ اندر ایک بہت بڑا احاطہ تھا جہاں جگہ جگہ درختوں میں جھونپڑے اور لکڑی کے کیبن بنے ہوئے تھے۔ ان کے باہر کہیں کہیں موٹے موٹے کتے پڑے تھے۔ ہمیں ایک کیبن میں لے جایا گیا جہاں ایک سفاک شکل والا بھاری بھرکم گورا آدمی لکڑی کی میز پر دونوں ٹانگیں رکھے پائپ پی رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی گھنی مونچھیں تھیں۔ اس نے شکاریوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ کمر میں پستول لگا تھا۔ میز پر ایک برین گن رکھی تھی۔ اس نے ہمیں گھور کر سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ہماری تلاشی پہلے ہی لی جا چکی تھی۔ جو تھوڑا بہت اسلحہ اور روپے پیسے ہمارے پاس تھے وہ انہوں نے اپنے قبضے میں کر لئے تھے۔ یہ گورا اس گروہ کا سرغنہ تھا اور اسے وہاں چارلی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ہمیں تین دن تک ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا جہاں اوپر سے رسی کی مدد سے ہمیں کھانے کے لئے ڈبل

روٹی پانی ملتا تھا۔اس کے بعد صبح سے شام تک ایک درخت کے تنے سے باندھ کر رکھا گیا۔ ہمیں پینے کو پانی تک نہ دیا گیا۔اس کے بعد چارلی نے ہمارا الگ الگ انٹرویو کیا۔وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا ہمارے عزیز ایسے لواحقین ہیں جو ہماری رہائی کے عوض تاوان ادا کر سکیں؟ جب چارلی کو پتہ چلا کہ میں ایک مفلوک الحال آوارہ گرد لڑکا ہوں اور کارلو ایک سابق بحری قزاق ہے جو قزاقی سے توبہ کر کے واپس اپنے وطن چین جا کر شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس نے کارلو کو اسی روز درخت سے باندھا اور میری آنکھوں کے سامنے برین گن کا برسٹ مار کر ہلاک کر دیا۔ میں تو سکتے میں آ گیا۔شاید اب میرے ساتھ بھی ایسا سلوک کیا جانے والا تھا۔مگر چارلی کے حکم پر میرے ایک پاؤں میں لوہے کا کڑا یعنی بیڑی ڈال کر مجھے ایک جگہ زمین کھود کر صاف کرنے کے کام پر لگا دیا گیا۔کارلو تو جلدی مر جائے گا یا مارا جائے گا میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔جرائم پیشہ خونی لوگوں میں تنہا بے یارومددگار ہو کر رہ گیا تھا۔جس جگہ ان جرائم پیشہ گوروں نے اپنا اڈہ بنایا ہوا تھا اسکی ایک جانب تو اونچی پہاڑی تھی جس کے اوپر دو مشین گن پوسٹیں بنی تھیں یہاں چوبیس گھنٹے آدمی پہرہ دیتے تھے۔اور باقی تین اطراف کو ایک دریا نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا جس کی سرخ دلدلی ریت پر پندرہ سولہ مگرمچھ ہر وقت لیٹے رہتے تھے۔وہاں کوئی بگلا بھی آ کر بیٹھتا تو مگرمچھ چشم زدن میں اسے ہڑپ کر جاتے۔

احاطے کے اردگرد اونچی خاردار باڑ تھی جس میں ہر وقت بجلی کا کرنٹ جاری رہتا تھا۔ یعنی وہاں سے فرار ناممکن تھا۔صرف دریا کا راستہ کھلا تھا جس پر ان آدم خور مگرمچھوں کا قبضہ تھا۔ سنگ دل چارلی ان مگرمچھوں کے آگے کئی مفرور غلام ڈال کر انہیں آدم خور بنا چکا تھا۔

وہاں دوسرے حبشی غلام بھی کام کرتے تھے۔مگر ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔رات کو مجھے ایک جھونپڑی میں دھکیل کر زنجیر سے باندھ دیا جاتا۔ میں سوچتا کہ یہ کس بری مصیبت میں پھنس گیا ہوں اور جانے اس عذاب سے کب نجات ملے گی۔اسی طرح دو مہینے گذر گئے پھر بارشیں شروع ہو گئیں۔ایسی موسلادھار بارشیں ہوئیں کہ میں نے برما کے جنگلوں میں بھی

ایسی بارشیں نہیں دیکھی تھیں۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ جنگ کی کیا صورت حال ہے۔ایک روز میں چارلی کے کیبن کے باہر کیاریوں میں تازہ مٹی ڈال رہا تھا۔اندر ریڈیو کھلا تھا۔انگریزی میں خبریں ہو رہی تھیں۔ میں نے کان لگا دیئے۔معلوم ہوا کہ ہیروشیما پر امریکہ نے کوئی بڑا زبردست ایٹم بم گرا دیا ہے جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اتحادی فوجیں برلن میں داخل ہو گئی ہیں۔ مجھے ایک اطمینان ہوا کہ اب جاپانی مجھے نہیں پکڑ سکیں گے ان کی قید سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا ہوں۔مگر ان جرائم پیشہ لوگوں کی قید نے میری زندگی کو ایک عذاب میں تبدیل کر دیا تھا۔نہ میں احاطے سے باہر جا سکتا تھا۔نہ کسی سے بات کر سکتا تھا۔فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا صرف ایک دریا رہ گیا تھا جس پر آدم خور مگرمچھوں کی حکمرانی تھی۔اس دریا کی طرف سے ہفتے میں ایک بار ایک بوڑھا حبشی ایک پندرہ سولہ سال کی نیگرو لڑکی کے ساتھ کشتی میں تازہ پھل اور سبزیاں وغیرہ لے کے آتا تھا۔میں وہاں کے قیدی غلاموں میں سب سے کم عمر اور صاف رنگت کا تھا۔ چنانچہ یہ حبشی لڑکی اس کی آنکھوں میں میرے لئے ہمدردی ہوتی تھی۔ایک روز شام کے وقت میں دریا کنارے والی خاردار باڑ کے پاس جنگلی گھاس کاٹ رہا تھا کہ میں نے نیگرو لڑکی کو دیکھا۔اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا خالی تھیلا تھا اور وہ شام کی ہلکی دھند میں تھوڑی دیر بعد پیچھے مڑ کر دیکھ لیتی تھی۔وہ جھاڑیوں کی اوٹ لیتی سیدھی میرے پاس آئی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

"یہاں سے بھاگ گے؟"

میں اسکا منہ تکنے لگا۔پھر اثبات میں سر ہلایا۔وہ یہ کہکر خاردار باڑ کی طرف چل دی۔ کل رات اپنے جھونپڑے میں تیار رہنا۔میں سمجھ نہ سکا کہ یہ اچانک نیکی کا فرشتہ کہاں سے آ گیا۔ میرے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

☆......☆......☆

میرا یہ سفران سیاحتوں کا حصہ ہے جو میں نے ملک ملک کے شہروں، صحراؤں، خطرناک جنگلوں اور سمندروں میں کی۔ یہ میری نوجوانی کا زمانہ تھا اور میرے اندر مصیبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے کی زبردست صلاحیتیں موجود تھیں۔ یہ ایک طرح کی خانہ بدوشی تھی جس نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ زندگی کے گہرے حقائق سے روشناس کیا۔ مجھے ایسے ایسے تجربے حاصل ہوئے جو میں گھر بیٹھ کر کبھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ان تجربوں سے ایک یہ بات بھی مجھ پر واضح ہوئی کہ ایک تو ہماری مادی یعنی جسمانی زندگی ہے مگر ایک روحانی یا غیر مادی زندگی بھی ہے۔ اسے ہم دیکھ تو نہیں سکتے۔ مگر کبھی کبھی اس کے بڑے واضح اشارے بلکہ ثبوت ہمیں ضرور مل جاتے ہیں۔ یہ تمہید میں اس لئے باندھ رہا ہوں کہ میری آپ بیتی میں اب ایک ایسی شخصیت نمودار ہونے والی ہے جسکا ہماری مادی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ ضرور کوئی روح ہی تھی۔ لیکن اتنا مجھے یقین ہے اور اس وقت بھی تھا کہ یہ شخصیت غیر مادی ہے اور ہماری دنیا سے اسکا صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ کبھی کبھی ہم سے رابطہ قائم کر لیتی ہے۔

میں سوچتا کہ یہ لڑکی اور اسکا بوڑھا دادا مجھے اس جگہ سے کیسے باہر نکالیں گے؟ وہ احاطے کے گیٹ سے آتے جاتے تھے جہاں جرائم پیشہ گروہ کے پہریدار لائٹ مشین گنیں لئے ہر

وقت موجود ہوتے تھے۔ اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ میں اپنے جھونپڑے میں جاگتا رہا۔ آدھی رات کے وقت جب جنگل پر سناٹا چھایا تھا آہٹ سی ہوئی۔ میرے جھونپڑے کا دروازہ نہیں تھا۔ باہر ستاروں کی بہت ہی دھیمی غبار کی طرح کی دھندلی روشنی میں مجھے ایک سایہ اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ وہی نیگرو لڑکی تھی۔ "میرے ساتھ آؤ"۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ وہ مجھے احاطے کی جنوبی دیوار کی طرف لے گئی۔ یہاں خاردار باڑھ کے قریب اس نے گھاس کے ایک ڈھیر کو ہٹا دیا۔ پھر جھک کر مٹی ہٹانے لگی۔ نیچے ایک تختہ تھا۔ اس نے تختہ اٹھایا تو وہاں ایک تاریک زینہ دھندلا سا نظر آیا۔ لڑکی مجھے سرنگ میں سے گذار کر دریا کنارے لے آئی جہاں کشتی میں اسکا بوڑھا دادا تیار بیٹھا تھا۔ میں جلدی سے کشتی میں سوار ہو گیا۔ وہ مگر مچھ کنارے سے لپک کر کشتی کی طرف بڑھے بوڑھے نیگرو نے ٹین کے ڈبے میں بھرا ہوا کوئی تیل دریا میں انڈیل دیا جسکی ناگوار تیز بو کی وجہ سے مگر مچھ تیزی سے واپس بھاگ گئے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچے ہی تھے کہ جرائم پیشہ مجرموں کے احاطے میں الارم بج اٹھا۔ ساتھ ہی : دیا پر سرچ لائیٹ کی روشنی پڑی اور پھر دریا میں سٹیمر کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ بوڑھے نیگرو نے کشتی کھینچ کر جھاڑیوں میں چھپا دی اور مجھے کہا۔

"یہاں سے شمال مغرب کی طرف بھاگ جاؤ۔ آگے دو دن کا سفر ہے۔ موریطانیہ کی سرحد آجائے گی۔ وہ مسلمان ملک ہے۔ ہم بھی مسلمان ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم بھی مسلمان ہو۔ اب نکل جاؤ۔ یہ لوگ تمہارا پیچھا کریں گے۔ اب جو خدا کو منظور"

اور میں نے رات کے اندھیرے میں کاندھے تک آئی ہوئی جھاڑیوں میں دوڑ لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد جرائم پیشہ لوگوں کا سٹیمر دریا کے اس کنارے پر آ گیا جس کے ساتھ ساتھ میں جنگل میں بھاگ رہا تھا۔ وہ میرے پیچھے لگ گئے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جنگل کی فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھتی۔ مگر میں رکا نہیں۔ اندھا دھند بھاگتا گیا۔ وہ لوگ جنگل کے چپے چپے سے واقف تھے۔ چنانچہ میرے گرد ان کا گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ دراصل انہوں نے مجھے دریا کنارے

بھاگ کر جنگل میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ دوڑتے دوڑتے میرا سانس پھول گیا۔ جنگل میں میکلوڈ روڈ ایسی کوئی سڑک نہیں ہوتی کہ جس پر آپ کسی اتھلیٹ کی طرح دوڑتے چلے جائیں۔ یہاں قدم قدم پر جھاڑیاں، اونچی گھاس، درخت اور طرح طرح کے جھاڑ جھنکاڑ میرے راستے میں حائل ہو رہے تھے۔ میں سخت تھک گیا۔ اچانک سامنے درختوں کے درمیان ایک چھوٹی سی کھلی جگہ آ گئی جہاں ایک کنواں بھی تھا۔ میں کنوئیں کے پاس بیٹھ کر سانس درست کرنے لگا۔ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ فائرنگ کی آواز ذرا دور سے آتی تھی جسکا مطلب یہ تھا کہ میرا پیچھا کرنے والے خونی مجھ سے کافی فاصلے پر ہیں۔ اردگرد بڑے گھنے درخت تھے۔ کنوئیں کی منڈیر پر ٹین کا ایک ڈبا پڑا تھا جس کے ساتھ باریک رسی بندھی تھی۔ میں نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا۔ مجھے وہاں پانی نظر نہ آیا۔ یہاں اندھیرا اور گہری خاموشی تھی۔

میں نے اللہ کا نام لے کر کنوئیں میں ٹین کا ڈبا ڈال دیا۔ کنوئیں میں پانی موجود تھا۔ پانی نکال کر چکھا۔ وہ تازہ اور خوشگوار تھا۔ جلدی جلدی پانی پیا۔ کچھ سر پر ڈالا۔ وہاں سے بھاگنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک سفید انسانی ہیولا میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ دہشت کے مارے میں وہیں ساکت ہو کر رہ گیا۔ اس انسانی ہیولے کا چہرہ ہاتھ پاؤں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اسکا قد اتنا لمبا تھا کہ سر درختوں کی ٹہنیوں کو چھو رہا تھا۔ میں نے دل میں آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔

"مجھے پانی پلاؤ"

یہ ایک خشک اور گہری انسانی آواز تھی جو اس انسانی ہیولے کی ہو سکتی تھی۔ میں سخت خوف زدہ تھا۔ اس نے پھر آواز دی۔

"مجھے پیاس لگی ہے۔ پانی پلاؤ"

شاید یہ آیت الکرسی کے ورد کا اثر تھا کہ میرے اندر حوصلہ پیدا ہو گیا اور خوف کافی حد تک دور ہو گیا۔ میرے ہاتھ خود بخود ڈبے کی طرف بڑھے اور کنوئیں میں سے پانی نکال کر کنوئیں کی منڈیر پر رکھ دیا۔ انسانی ہیولے نے جھک کر اپنا چہرہ ڈول کے ساتھ لگا دیا۔ ایک سیکنڈ بعد ڈبہ

خالی تھا۔ بولا۔

"اور پانی پلاؤ"

وہ پانی کے بھرے ہوئے پندرہ سولہ ڈبے پی گیا۔ پھر اپنی پراسرار آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم نے میری برسوں کی پیاس بجھائی ہے۔ میں جس کو پانی پلانے کے لئے کہتا وہ یا بے ہوش ہو جاتا یا چیخ مار کر بھاگ جاتا تھا۔ تم بڑے بہادر لڑکے ہو۔ آج سے تم میرے دوست ہو"

اسکی آواز انسانی تھی۔ اگرچہ شکل نظر نہیں آتی تھی۔ میرا کچھ حوصلہ بڑھا۔ اس کے ساتھ ہی جنگل میں فائر کی آواز آئی۔ یہ آواز بڑے قریب سے آئی تھی۔ میں بھاگنے لگا تو انسانی ہیولے نے کہا۔

"خدا حافظ!"

اور وہ غائب ہو گیا۔ مجھے جرائم پیشہ لوگوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ میرے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ دھڑا دھڑ گولیاں چلا رہے تھے۔ جو درختوں کی شاخوں کو توڑتی ہوئی میرے سر کے اوپر سے گذر رہی تھیں۔ سمجھ گیا کہ اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ پھر بھی جان بچانے کے واسطے بھاگتا چلا گیا۔ میرا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا۔ اور میں منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ میری جان کے دشمن، جرائم پیشہ قاتل گولیاں چلاتے میرے سر پر پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنی رائفلوں اور برین گنوں کا رخ میری طرف کر دیا۔

☆......☆......☆

یہ چار جرائم پیشہ قاتل تھے۔ان کی برین گنوں کا رخ میری طرف تھا۔ چہروں پر سنگ دلانہ وحشت تھی۔ایک پیشہ ور قاتل جھاڑیوں میں چلا رہا تھا۔یہ میری خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے مجھے وہیں گولیوں سے چھلنی نہیں کیا۔ان کے لئے یہ ایک معمولی بات تھی اور حالات کا تقاضا بھی یہی تھا۔میں اپنی جان بچ جانے پر خوش ہو رہا تھا اور انہوں نے مجھے وہیں درخت کے ساتھ لٹکا کر پھانسی دینے کا پروگرام بنالیا تھا۔

پانچواں آدمی ان کا سرغنہ تھا۔اس نے آتے ہی مجھے زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے جرمن یا فرانسیسی زبان میں کچھ کہا۔فوراً دوسرے آدمیوں نے ایک درخت کی اونچی شاخ پر رسی پھینکی۔ایک آدمی درخت پر چڑھ گیا۔دیکھتے دیکھتے پھانسی کا پھندا تیار ہو گیا۔ ظاہر ہے یہ ساری خاطر داریاں میرے لئے ہی ہو رہی تھیں۔یوں تو موت کئی بار میرے قریب سے ہو کر گذر گئی تھی۔لیکن اس بار بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔میں نے اپنے آپ کو اللہ کی رضا کے سپرد کر دیا۔اگر خدا نے میری موت اسی طرح لکھی ہے تو مجھے قبول کر لینا چاہیے۔میں دل ہی دل میں کلمہ شریف پڑھنے لگا۔میں نہتا تھا۔وہ پانچ عادی مجرم تھے۔مجھ سے بڑے تھے۔ان کے پاس سٹین گنیں تھیں۔میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھے اور دو آدمیوں نے اٹھا کر مجھے اوپر درخت کی ٹہنی پر بٹھا دیا۔میرے گلے میں پھندا ڈال دیا گیا۔بس

اب مجھے ذرا سا دھکیل کر نیچے گرانے کی دیر تھی کہ ایک زوردار جھٹکا لگتا اور دوسرے لمحے میری لاش جھول رہی ہوتی۔موت کے خوف سے میرا جسم سرد پڑ گیا۔آنکھوں میں سب کی شکلیں گھومنے لگیں۔کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں آنے لگیں۔نیچے سے کسی نے آواز دی۔اس کے ساتھ ہی جو قاتل میرے پاس ٹہنی پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا اس نے مجھے دھکا دے دیا۔میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔

میں درخت کی شاخ سے گر پڑا۔مجھے ایک شدید جھٹکا لگا اور میں جھولنے لگا۔میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔مجھے اپنے نیچے سخت زمین محسوس ہوئی۔میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔میں زمین پر پڑا تھا۔رسی ٹوٹ گئی تھی۔شاید۔پھندا ابھی تک میری گردن میں تھا۔میرے قاتل چیخ چیخ کر اس آدمی کو برا بھلا کہہ رہے تھے جس نے میرے گلے میں پھندا ڈالا تھا اور جو ابھی تک درخت کی شاخ پر ہی بیٹھا تھا۔میں خود حیران تھا کہ بچ کیسے گیا؟ رسی بڑی پکی تھی اور نائیلون کی تھی۔مگر اللہ کو میری زندگی منظور تھی۔وہ مجھے ایک بار پھر اٹھا کر درخت پر چڑھانے لگے۔ اچانک شیر کی خوفناک دھاڑ سے جنگل گونج اٹھا۔شیر کی غضبناک آواز اتنے قریب سے آئی تھی کہ جن آدمیوں نے مجھے پکڑ رکھا تھا وہ مجھے چھوڑ کر بھاگے۔میرے بدن میں پہلے ہی جان نہیں رہی تھی۔اب شیر کی دھاڑ نے مزید جان نکال دی۔پھر بھی میں نے ایک طرف دوڑنے کی کوشش کی مگر میں اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گیا۔

افریقہ کا بہت بڑے سر والا پندرہ فٹ لمبا شیر میرے قریب آ گیا تھا۔جو لوگ زمین پر تھے۔وہ شیر پر گولیاں برسانے لگے۔شیر نے ان کی طرف چھلانگ لگائی اور پھر گھبرا سناٹا چھا گیا۔ صرف شیر کے غصے میں غرانے کی آواز آ رہی تھی۔میں نے دیکھا کہ شیر اپنے بادامی رنگ کے گھنے بالوں والا بھاری بھرکم سر اٹھائے بڑی شان سے میری طرف بڑھ رہا ہے۔میں خوف کے مارے بیٹھ گیا۔شیر نے سر اٹھا کر اوپر درخت کی ٹہنی کو دیکھا۔ٹہنی پر ابھی تک وہ آدمی بیٹھا ہوا تھا جس نے میری گردن میں پھندا ڈالا تھا۔اس کے پاس صرف ایک پستول تھا۔اس نے شیر پر پستول کا فائر کر دیا۔شیر زور سے اچھلا اور اسے پنجہ مار کر نیچے گرا لیا۔اس قاتل کا جبڑا ایک طرف سے اڑ گیا تھا

اور وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ شیر نے اپنی بڑی بڑی زردی مائل سرخ آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور پھر اپنے بدن کو لہکاتا درختوں میں غائب ہو گیا۔ شاید خدا نے اس شیر کو میری جان بچانے کے لئے بھیجا تھا۔ شیر کے جانے کے کچھ دیر بعد تک میں اسی طرح مبہوت سا ہو کر بیٹھا رہا۔ پھر اپنے حواس کو سنبھالا۔ اس طرف گیا جدھر شیر نے چار جرائم پیشہ لوگوں پر چھلانگ لگائی تھی۔ وہ چاروں کے چاروں قاتل اس حالت میں گھاس پر پڑے تھے کہ ان کے دل کی حرکت بند ہو چکی تھی۔ ان کا اسلحہ قریب ہی پڑا تھا۔ شاید وہ شیر کی دہشت سے مر گئے تھے۔ میں یہی نتیجہ نکال سکتا تھا۔ میں نے ایک سٹین گن اٹھالی۔ کچھ میگزین بھی اٹھا لئے۔ پھر گردن میں سے پھندا نکال کر پرے پھینکا۔ جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور وہاں سے نکل کر جتنی تیز چل سکتا تھا ایک طرف چلنے لگا۔

رات ڈھل چکی تھی۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی جنگل میں نمودار ہونے لگی تھی۔ ایک پہاڑی نالہ عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچا تو درختوں کے پیچھے سے ایک لمبے قد والا حبشی نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ اس نے شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی طرح نیلے رنگ کا لبادہ سا پہن رکھا تھا۔ سر پر سفید رنگ کا صافہ بندھا تھا جس کا پلو گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ اسکے حبشیوں جیسے چہرے پر ایک عجیب طرح کی روشنی سی پھیلی تھی اور آنکھوں میں بڑی چمک تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا اور میری زبان یعنی اردو میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

''میرے دوست! اب میں تمہیں اپنا نام بتا دینا چاہتا ہوں۔ میرا نام سوانا عبدالرحمان ہے لوگ مجھے سوانا کہا کرتے تھے۔ میں وہی ہوں جس کو تم نے پانی پلایا تھا۔''

میں کچھ چونکا۔ مگر یقین نہ آیا۔ پھر خیال آیا کہ اس کو کیسے پتہ چلا کہ میں نے کنوئیں پر ایک ماورائی ہستی کو پانی پلایا تھا؟ میں نے سوچا شاید یہ وہیں کسی درخت کے پیچھے چھپا مجھے اس نام نہاد روح کو پانی پلاتے دیکھ رہا ہوگا۔ میں نے اس کی باتوں میں زیادہ دلچسپی نہ لی۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسکی آواز ویسی ہی خشک اور گہری گہری تھی۔ کہنے لگا۔

''تمہیں دوست بنایا ہے تو مصیبت میں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ میں ہی شیر کی شکل میں خدا کے حکم سے تمہاری مدد کو پہنچا تھا۔''

مجھے یہ سب کچھ من گھڑت باتیں لگ رہی تھیں۔ مگر میں خاموشی سے سنتا رہا اور جنگل میں چلتا بھی رہا۔ سوانا کہہ رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مشکل میں تمہارے کام آنا اب خدا کی طرف سے مجھ پر فرض ہو گیا ہے۔''

میں نے اسکی سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

''اگر تم بتا سکتے ہو تو مجھے یہ بتاؤ کہ میں مراکو کی سرحد پر کیسے پہنچ سکتا ہوں۔''

سوانا نے جواب دیا۔

''مراکو یہاں سے کافی دور ہے۔ تم پیدل وہاں تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔ لیکن فکر نہ کرو۔ خدا کے حکم سے تمہارا انتظام ہو جائے گا۔''

ہم تھک کر تھوڑی دیر ستانے کے واسطے ایک چشمے کے پاس بیٹھ گئے۔ سوانا نے اپنی جیب سے میٹھی روٹی نکال کر مجھے دی۔ ایسی خوشبودار میٹھی روٹی میں نے پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔ وہ کچھ نہیں کھا رہا تھا۔ میں نے روٹی کھا کر پانی پیا۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو گیا۔ ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ دوپہر کے وقت جنگل ختم ہو گیا اور سامنے ریت کے ٹیلے نظر آنے لگے۔ سوانا نے بتایا کہ یہاں سے افریقہ کا سب سے بڑا صحرا، صحرائے اعظم شروع ہوتا ہے لیکن تمہیں مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرنا ہوگا اس طرف سرسبز ٹیلے بھی ہیں اور پانی کے چشمے اور جنگلی پھل بھی مل جاتا ہے۔''

اس کے بعد وہ یہ کہہ کر ایک طرف چل دیا کہ میں تمہارے لئے سواری کا بندوبست کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اونٹ بھی تھا۔ وہ بولا۔

''یہ اونٹ تمہیں مراکو کی سرحد پر پہنچا دے گا۔ اچھا دوست۔ پھر ملیں گے۔''

یہ کہا اور سوانا درختوں کی طرف چل دیا۔ میں نے سوچا کہ سوانا روح ہے یا آدمی۔ مجھے کیا۔ کم از کم وہ میرے لئے سواری تو لے آیا ہے۔ میں اونٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کی مہار تھامی تو اونٹ اپنے آپ ایک طرف روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

آج میں سوچتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی کہ اس اونٹ نے مجھے اتنی جلدی کیسے مراکو کی سرحد کے اندر پہنچا دیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ پندرہ دن کا سفر تھا جو سوانا کے اونٹ نے پانچ دنوں میں طے کر لیا۔ بہر حال میں نے مراکو پہنچ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ افریقہ کے خطرناک جنگلوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے گروہ سے نجات ملی۔

جنگ ختم ہو گئی تھی۔ اتحادیوں کی فتح ہوئی تھی۔ مراکو کی سرحد الجزائر سے ملی ہوئی تھی۔ یہ دونوں ملک مسلم اکثریت اور قدیم اسلامی تہذیب و تمدن کے علم بردار تھے۔ انہوں نے اس لئے دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کا ساتھ دیا تھا کہ اتحادیوں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ جنگ ختم ہونے پر انہیں فرانس کی غلامی سے آزاد کر دیا جائے گا۔ مگر اتحادی اپنے وعدے پر قائم نہ رہے اور جنگ کے ختم ہوتے ہی یہ دونوں ملک ایک بار پھر فرانس کے سپرد کر دیئے گئے۔ اس سے دونوں ملکوں میں آزادی کی ایک زبردست تحریک شروع ہو چکی تھی۔ جسکا مقصد مراکش اور الجزائر کو فرانسیسی تسلط سے آزاد کرانا تھا۔

فرانس نے یہاں اپنی فوجیں اتار دی تھیں اور ایک بار پھر سارے علاقے پر قبضہ کر کے ہزاروں حریت پسندوں کو قید میں ڈال دیا تھا۔ کئی ایک شہید ہو گئے تھے۔

فرانس کو اب اتحادیوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔

الجزائر میں مسلمان احمد بن بلا کی قیادت میں آزادی وطن کی جنگ لڑ رہے تھے۔ یہ جنگ زیر زمین رہ کر لڑی جا رہی تھی۔ مراکو میں بھی ایسی ہی صورت حال تھی۔ شہر میں ذرا سی بات پر پکڑ دھکڑ شروع ہو جاتی تھی۔ گولیاں چلنے لگتی تھیں۔ کرفیو لگ جاتا۔ یہ ملک اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک نادر نمونہ تھا۔ یہاں کی خوبصورت مسجدیں، درس گاہیں اور اسلامی تاریخی مقامات اپنی طرف کھینچتے تھے۔ میرا یہاں دل لگ گیا۔ میں ایک برس رباط میں رہا اس دوران میں نے جبرالٹر کے مقام پر وہ جگہ بھی دیکھی جہاں طارق بن زیاد نے اندلس پر چڑھائی کرنے سے پہلے اپنے جہازوں کو آگ لگائی تھی۔ یہاں ایک چٹان پر کھڑے ہو کر میں نے آبنائے جبرالٹر کے نیلے پانیوں کو ساحلی چٹانوں سے ٹکراتے دیکھا تو اقبال کا یہ شعر یاد آ گیا۔

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

واقعی وہ مجاہد، وہ غازی اللہ کے پر اسرار بندے تھے جنہوں نے اندلس کے ساحلوں پر اسلامی پرچم لہرایا اور ایک ایسی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جس نے اپنی سات سو برس کی مدت میں ساری دنیا کو اور خاص طور پر یورپ کو علم و ادب اور سائنس۔ طبعیات۔ تاریخ۔ نباتات۔ حیاتیات۔ جیومیٹری۔ فلکیات اور دیگر سائنسی علوم کے بیش بہا خزانے عطا کئے۔ رباط میں رہ کر میں نے اتنی عربی اور فرانسیسی زبان سیکھ لی تھی کہ میں ان زبانوں میں دوسرے کو اپنا مطلب سمجھا سکتا تھا۔ میں ایک ہارڈ ویئر سٹور میں ملازم ہو گیا تھا اور وہیں مجھے رہنے کو جگہ بھی مل گئی تھی۔ ہمارے سٹور کے ساتھ ہی ایک دکان تھی جہاں اسلحہ فروخت ہوتا تھا۔ ایک روز شام کے وقت میں کام سے چھٹی کرنے کے بعد ایک ریسٹوران میں قہوہ پینے جا رہا تھا کہ اچانک گولیاں چلنے لگیں۔ بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ دو نوجوان دوڑتے ہوئے میرے قریب سے نکل گئے۔ میں بھی وہاں سے دوڑا۔ ایک نوجوان نے پیچھے مڑ کر پستول کے فائر کر دیا۔ ان کے پیچھے مراکشی پولیس لگی تھی۔ گولی لگنے سے

ایک سپاہی گر پڑا۔ اچانک سامنے سے پولیس کی گاڑی نکل آئی میں بھی دوڑتے دوڑتے ان دو نوجوانوں کے قریب آ گیا تھا۔ پولیس کی نفری زیادہ تھی۔ اچانک حملہ کر کے پولیس نے دونوں نوجوانوں کو قابو کر لیا۔ میں پیچھے کو مڑنے لگا تو ایک سپاہی نے مجھے بھی لپک کر پکڑ لیا اور فرانسیسی میں کہا۔

"تم بھاگ نہیں سکتے۔"

میں نے کہا۔ "میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔"

سن کر دوسرے سپاہی نے چلا کر کہا۔

"یہ بھی دہشت گرد ہے۔ لے چلو اسے۔"

میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ساری صورت حال میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ دو نوجوان مراکشی یا الجزائری حریت پسند تھے اور ان کے ساتھ مجھے بھی ان کا ساتھی سمجھ کر پکڑ لیا گیا تھا۔ فرنچ حکومت ان حریت پسندوں پر جو تشدد کرتی تھی اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ میں نے بہت شور مچایا کہ میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے میں ہندوستانی مسلمان ہوں اور سٹور میں نوکری کرتا ہوں مگر وہاں میری کون سنتا تھا۔

ہمیں رباط شہر سے دور ساحل سمندر کی ایک بہت بڑی چٹان پر واقع جیل خانے میں بند کر دیا گیا۔ یہاں میں نے پہلی بار غور سے ان دو نوجوانوں کو دیکھا جن کے ساتھ میں بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان کی عمریں بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھیں۔ رنگ کھلتے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور سیاہ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ وہ عربی فرانسیسی اور انگریزی زبانیں بول سکتے تھے۔ ہم تینوں ایک ہی کوٹھڑی میں بند تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کا تعلق الجیریا کی حریت پسند جماعت سے ہے جو اپنے وطن کو فرانسیسیوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام کریم اور دوسرے کا بسطام تھا۔

وہ میرے پکڑے جانے پر افسوس کا اظہار کرنے لگے۔ یہ جان کر انہیں خوشی ہوئی تھی

کہ میں بھی مسلمان ہوں اور میرا تعلق برصغیر ہندوستان سے ہے۔ کریم کہنے لگا۔

"ہندوستان میں بھی مسلمان اپنے عظیم لیڈر قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ایک الگ اسلامی ملک پاکستان قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہم الجیرین مسلمانوں کی ہمدردیاں آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔"

میں نے ان سے پوچھا کہ وہ الجیریا سے مراکو میں کیسے آ گئے۔ اس کے جواب میں دوسرے نوجوان بسطام نے کہا۔

"ہم دونوں مسلمان ملک ایک ہی کاز کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہاں ہم اسلحہ لینے آئے تھے کہ کسی نے ہماری مخبری کر دی اور ہم پکڑے گئے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے ساتھ تم بھی مشکل میں پھنس گئے ہو۔"

مشکل میں، میں ضرور پھنس گیا تھا مگر اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دو تین دن وہاں کی پولیس ہم پر تشدد کرتی رہی۔ الجزائری حریت پسندوں نے بڑی بہادری سے تشدد برداشت کیا اور کچھ نہ بتایا۔ میں وہی کہتا رہا جو سچ تھا کہ میرا کسی گروپ سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر مجھے بھی سخت اذیت دی گئی۔ چوتھے روز ہمیں اطلاع دے دی گئی کہ آج رات تم تینوں کو فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ بسطام نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر کہا ہم وطن کی آزادی کی خاطر ہزار بار شہید ہونے کو تیار ہیں۔ کریم نے بھی اسی عزم کا اظہار کیا۔ مگر میں ناحق مارا جا رہا تھا۔ دونوں حریت پسند مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ مجھے یہ موت قبول ہے مگر دل میں بے چینی سی لگ گئی۔

ہم جس کوٹھڑی میں بند تھے، وہ جیل کے کونے میں تھی اور کھڑکی کی فولادی سلاخوں کے پیچھے سمندر نظر آتا تھا۔ شام کو ہمیں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ یہ ہماری موت کی تیاریاں تھیں۔ ہم خدا کو یاد کر رہے تھے۔ آدھی رات کے وقت چار مسلح گارڈ ہمیں کوٹھڑی سے نکال کر جیل کے احاطے میں لے آئے۔ یہاں ہمیں شوٹ کیا جانا تھا۔

☆......☆......☆

چار مسلح گارڈ ہمارے ساتھ تھے۔ یہاں ہمارے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے۔ ہماری بیڑیاں اُتار دی گئیں۔ احاطے کی دس فٹ اونچی دیواریں پتھر جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ اسکا صرف ایک محرابی دروازہ تھا جہاں سے ہمیں احاطے میں لایا گیا تھا۔ ہمیں دیوار کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ پتھریلی دیوار میں ایک فٹ کے فاصلے پر لوہے کے کنڈے لگے تھے۔ ایک اور رسی سے ہمیں ان کنڈوں کے ساتھ باندھا گیا۔ چاروں سپاہی کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ رات خاموش تھی۔ الجزائری نوجوان بڑے جوش میں تھے۔ سچی بات ہے میں خوف زدہ تھا۔ کیونکہ میں بے وجہ پھنس گیا تھا۔

اتنے میں ایک باوردی فرانسیسی فوجی افسر احاطے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سفید رومال تھا۔ اس رومال کی جنبش پر ہمارے سینے گولیوں سے چھلنی کیے جانے والے تھے۔ میں جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سامنے کھڑے مسلح سپاہیوں کو تک رہا تھا جن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ فرانسیسی افسر کے آتے ہی گارڈ نے اسے سلیوٹ کیا۔ اور کوئی پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر ہمارے سامنے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ابھی تک انہوں نے رائفلوں سے ہمارا نشانہ نہیں باندھا تھا۔

فرانسیسی افسر ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ موت ہم سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ پھر اچانک ایک ایسا معجزہ ہوا جسکی ہمیں بالکل توقع نہیں تھی۔ جس دیوار کے ساتھ ہمیں کھڑا کیا گیا تھا اس کے اوپر سے برین گن کا ایک بھرپور برسٹ فائر ہوا۔ گولیوں کی بوچھاڑ فائرنگ سکواڈ پر پڑی اور ہمارے دیکھتے دیکھتے چاروں سپاہی خاک و خون میں تڑپ رہے تھے۔ دوسرا برسٹ فرانسیسی افسر پر پڑا جو اپنا پستول نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ہم نے حیرت زدہ ہو کر اوپر کو دیکھا۔ دیوار کے اوپر سے کسی نے نیچے صحن میں چھلانگ لگا دی۔ یہ ایک دراز قد نوجوان تھا۔ جس نے افریقہ کے شکاریوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ احاطے کے نیم اندھیرے میں اسے پہچان نہ سکا۔ جب وہ دوڑ کر ہمارے قریب آیا اور ہماری رسیاں کھولنے لگا تو میں اسے پہچان گیا۔ یہ سوانا تھا۔ وہی نوجوان جس نے افریقہ کے جنگل سے نکلتے وقت میرے لئے اونٹ کا بندوبست کیا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا الجزائری حریت پسند یہی سمجھے کہ یہ مراکش کی تحریک مزاحمت کا کوئی مجاہد ہے۔ سوانا میری رسیاں کھولنے لگا تو آہستہ سے بولا۔

"تم نے میری برسوں کی پیاس بجھائی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مصیبت میں میں تمہیں اکیلا چھوڑ دوں۔"

میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے موت کے منہ سے بچا لیا۔ سوانا نے اپنی شکاری بش شرٹ کی جیب میں سے ایک ایک ریوالور نکال کر ہمیں دیا اور کہا۔

"جلدی سے میرے پیچھے آؤ"

وہ احاطے کے محرابی دروازے سے نکل کر ہمیں ایک نیم روشن راہ داری میں لے آیا جو سنسان پڑی تھی۔ ہم اس کے پیچھے تقریباً دوڑ رہے تھے۔ لگتا تھا اسے اس جیل کے سارے خفیہ راستوں کا علم تھا۔ راہ داری ختم ہوئی تو آگے ایک زینہ آ گیا۔ زینہ چڑھ کر ہم ایک گول سوراخ نما دروازے سے جیل کی چاردیواری کے باہر نکل آئے۔ نیچے ڈھلان میں سمندری لہریں چھوٹی

چھوٹی چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ سوانا ہمیں لئے ان چٹانوں کے پیچھے آیا۔ یہاں اندھیرے میں ایک چٹان کی اوٹ میں ایک موٹر لانچ کھڑی تھی۔

جونہی ہم موٹر لانچ میں سوار ہوئے سوانا نے اسے سٹارٹ کر کے گھمایا اور لانچ تیز رفتاری سے سمندر کی موجوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی۔ ہم سروں کو نیچے کئے تختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لانچ جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی۔ سوانا لانچ کو کنٹرول کئے ہوا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ساحل کی چٹانیں اور جیل خانے کی روشنیاں نظروں سے غائب ہوگئیں۔ اب ہم کھلے سمندر میں تھے اور لانچ اتنی تیز چل رہی تھی کہ ہم جہاں بیٹھے تھے۔ وہیں بیٹھے رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ اگر ہم اٹھے تو ہوا کے طوفانی تھپیڑے ہمیں تنکوں کی طرح اپنے ساتھ اڑا کر لے جائیں گے۔

وقت کا احساس بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ نہ جانے کب تک میرا پراسرار دوست سوانا لانچ کو سمندر میں چلاتا رہا۔ پھر ہمیں اپنی بائیں جانب دور ساحل کی روشنیاں نظر آئیں۔ لانچ کی رفتار اب ہلکی ہوگئی۔ بسطام اور کریم اٹھ کر سوانا کے پاس گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے سوانا سے پوچھا کہ یہ کس بندرگاہ کی روشنیاں ہیں۔ سوانا نے مسکرا کر کہا۔

''تم لوگ اپنے وطن کی روشنیوں کو نہیں پہچانتے؟ یہ الجزائر کی بندرگاہ کی روشنیاں تھیں۔''

دونوں حریت پسند ہکا بکا سا ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے تھوڑے وقت میں وہ سینکڑوں میل کی سمندری مسافت طے کر چکے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سوانا کی ماورائی طاقت کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔ تب انہوں نے سوانا سے پوچھا کہ کیا تمہارا تعلق مراکو حریت پسند مزاحمتی گروپ سے ہے؟ ''تم یہی سمجھ لو'' سوانا نے مسکرا کر جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک تھی۔ مجاہد کریم نے سوانا کو خبردار کیا کہ بندرگاہ پر بھی فرانسیسی پولیس اور فوج ان کی کھوج ہی ہوگی۔ سوانا بولا۔ میں جانتا ہوں فکر نہ کرو۔ میں تمہیں ایسی جگہ ساحل پر لے جاؤں گا جہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔''

سوانا نے ہمیں ساحل سے دور شمال کی طرف ایک محفوظ مقام پر اتار دیا۔ سوانا نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور آہستہ سے بولا۔

''پھر ملیں گے دوست''

اس نے بسطام اور کریم سے کوئی بات نہ کی اور سٹیمر کو سٹارٹ کر کے سمندر میں روانہ ہوگیا۔ اب میں واپس مراکو نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہاں پولیس کے ریکارڈ میں میرا نام بطور حریت پسند کے درج ہو چکا تھا اور میں ان کا مفرور بھی تھا۔ بسطام اور کریم کو اس صورت حال کا احساس تھا۔ انہوں نے مجھے حوصلہ دیا اور کہا کہ میں ان کے ساتھ چلوں۔ وہ میری رہائش اور ملازمت کا کہیں انتظام کر دیں گے۔ میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں ان کے ساتھ ہولیا۔ راتوں رات وہ شہر سے کچھ میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں آ گئے جس کے چھوٹے چھوٹے سفید مکانوں میں کہیں کہیں کھجور کے درخت ستاروں کی دھیمی روشنی میں خواب کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ گاؤں کے باہر ایک جانب کچی چار دیواری کے اندر بہت سے درخت اگے ہوئے تھے۔ احاطے کا دروازہ بند تھا۔ ہم دیوار پھاند کر احاطے کے اندر گئے۔ یہاں اناروں کا ایک چھوٹا سا باغ تھا جس کے کنارے پر دو تین کوٹھڑیاں بنی تھیں۔ باہر برآمدہ تھا۔ جہاں ایک آدمی سو رہا تھا۔ بسطام اور کریم نے اسے جگایا اور آپس میں کوئی بات کی۔ اس آدمی نے جلدی سے ایک کوٹھڑی کھول دی۔ اندر فرش پر پرانا قالین بچھا تھا۔ ہم وہیں پڑ گئے۔ آنکھ کھلی تو دن کافی نکل آیا تھا۔ یہاں دونوں الجزائری مجاہد مجھے اس مکان کے مالک اور مسلمان حریت پسندوں کے ہمدرد ابو ناصر کے حوالے کر کے منہ اندھیرے ہی نامعلوم مقام کی طرف نکل گئے تھے۔ ابو ناصر کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ چہرہ بارعب اور آواز بھاری تھی۔ بڑا شفیق اور خوش مزاج الجزائری بزرگ تھا۔ وہ میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آیا۔ بسطام اور کریم اسے سب کچھ سمجھا گئے تھے۔

ابوناصر نے میرے ساتھ ہی دوپہر کا کھانا کھایا اور مجھے تسلی دی کہ یہاں فرانسیسی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ ابوناصر بڑا پرجوش مجاہد تھا اسکا ایک بیٹا ناصر جنگ آزادی میں شہید ہو چکا تھا۔ اب اسکی اولاد صرف ایک بیٹی رہ گئی تھی جسکا نام ناصرہ تھا۔ یہ نوجوان الجزائری لڑکی بھی اپنے دل میں اسلام اور الجزائر کی آزادی کا جذبہ رکھتی تھی۔ ناصر کی شہادت کے بعد فرانسیسی پولیس نے ابوناصر کو بھی پکڑ لیا تھا مگر کوئی ثبوت نہ ملنے پر اسے رہا کر دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ ابوناصر انڈر گراؤنڈ کام کر رہا تھا اور اس قومی جنگ آزادی میں اس کی بیٹی بھی اس کے ساتھ تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں کچھ روز وہاں رہ کر مصر کی طرف نکل جاؤں گا مگر ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ میرا سارا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا۔

☆......☆......☆

ابوناصر مزاحمتی تحریک کا بڑا سرگرم کارکن تھا مگر اس کی ساری سرگرمیاں زیرزمین تھیں۔ اس جدوجہد میں اسکی بیٹی ناصرہ بھی پورے اسلامی اور قومی جذبے کے ساتھ حصہ لے رہی تھی۔ ابوناصر کا شہر میں ایک چھوٹا سا سٹور تھا جہاں میں کام کرنے لگا تھا۔ فرانسیسی حکام کو مخبروں نے اطلاع کر رکھی تھی کہ ابوناصر کے ہاں دو تین آدمی آکر ٹھہرتے ہیں اور یہاں سے اسلحہ وغیرہ لے کر اپنے مشن کو روانہ ہو جاتے ہیں۔

ایک دن کی بات ہے کہ ابوناصر کسی کام سے دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ پیچھے گھر میں صرف میں اور ناصرہ ہی تھے۔ میں رات کو سٹور بند کر کے آیا تو ناصرہ کھانا پکا رہی تھی۔ عشاء کی نماز ناصرہ نے اپنے چھوٹے سے کمرے میں پڑھی۔ پھر ہم نے کھانا کھایا۔ ناصرہ مجھ سے میرے وطن اور میرے گھر والوں کے بارے میں باتیں سنتی رہی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلی گئی۔

میں ساتھ والی کوٹھڑی میں قالین پر ہی سو جاتا تھا۔ اس رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ کھڑکی میں سے باہر صحرائی نخلستان کا منظر بڑا دلکش لگ رہا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی میں غنودگی کے عالم میں ہی تھا کہ کسی نے باہر سے دروازے پر دستک دی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

بتی میں نے بجھادی تھی۔ کھڑکی میں سے چاندنی اندر آرہی تھی۔ میں نے عربی میں پوچھا کون ہے؟

اس کے ساتھ ہی دھماکے سے دروازہ ٹوٹ گیا اور چھ سات آدمی اندر گھس آئے میں اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ مجھے وہیں دبوچ لیا گیا اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ یہ فرانسیسی پولیس کے آدمی تھے۔ انہوں نے ناصرہ کے کمرے کا دروازہ بھی توڑ دیا اور اندر گھس گئے۔ تھوڑی دیر میں ناصرہ کو بھی یہ لوگ گھسیٹتے ہوئے باہر لا رہے تھے۔ ناصرہ ایک دلیر مجاہدہ تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا پستول موجود تھا۔ اس نے فائر کر دیا۔ ایک سپاہی گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کرتی ایک آدمی نے اس کی گردن پر زور سے مکا مارا اور پستول چھین لیا۔

چاندنی رات میں مجھے ان پولیس والوں کی نیلی وردیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ ان میں فرانسیسی بھی تھے اور وہاں کی مقامی پولیس کے آدمی بھی تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ ہمیں اس میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ ناصرہ گردن پر ضرب لگنے سے نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی۔ یہ لوگ مجھے بھی الجزائری حریت پسند سمجھ کر لئے جا رہے تھے۔ بہرحال اب تو میں بھی ان حریت پسندوں کے ساتھ تھا۔

ٹرک ایک طرف روانہ ہو گیا ٹرک کے اندر ہی ہمارے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے تھے۔ چار مسلح سپاہی ہمارے سامنے رائفلیں لئے بیٹھے تھے۔ ٹرک دیر تک چلتا رہا۔ اس دوران اس نے کئی موڑ گھومے۔ اس کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ اور ایک چکر کاٹ کر رک گیا۔ ہمیں نیچے اتارا گیا۔ ناصرہ اب اپنے حواس میں تھی۔ چاندنی رات میں ہم نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر بتیاں جل رہی تھیں۔ ہمیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ کوئی فوجی ایئر پورٹ ہے۔ وہاں کئی فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اور سامنے گیٹ پر ایک فوجی گارڈ پہرہ دے رہا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔ مسلح گارڈ نے ہمیں گھیرے میں لے رکھا تھا۔ پھر وہ ہمیں تیز تیز چلاتے ایک رن وے پر لے آئے جہاں ایک بہت بڑا فوجی طیارہ کھڑا تھا۔ اس کا رنگ بھورا تھا۔ چاندنی

میں اس پر لکھا ہوا نمبر صاف نظر آرہا تھا۔ ہمیں اس طیارے میں دھکیلنے کے بعد دروازہ بند کر کے سیڑھی ہٹا دی گئی۔ یہ کوئی ٹرانسپورٹ طیارہ تھا اور شاید صرف ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اسکے پروں والے انجن سٹارٹ ہو گئے۔ طیارے کے اندر سامان کے کریٹ لدے ہوئے تھے۔

ہمیں فرش پر ہی بٹھا دیا گیا۔ طیارہ رن وے پر دوڑنے لگا۔ پھر وہ ٹیک آف کر گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ لوگ ہمیں کہاں لئے جا رہے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کافی لمبی پرواز تھی۔ طیارے کی گول کھڑکیوں میں سے صبح کاذب کی ہلکی نیلی روشنی زرد چاندنی میں مل رہی تھی کہ طیارہ نیچے اترنے لگا۔ ہمیں کچھ علم نہیں تھا کہ یہ کونسا ایئر پورٹ ہے ہمیں جہاز سے نکال کر فوجی ٹرک میں بند کر دیا گیا۔ طیارے سے فوجی ٹرک تک جاتے ہوئے روشنیوں سے یہ ضرور اندازہ ہوا کہ کوئی بڑا شہر ہے۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اس لئے بلیک آؤٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ٹرک کافی دیر تک چلنے کے بعد ایک جگہ رکا۔ کسی بڑے گیٹ کے کھلنے کی آواز آئی۔ ٹرک جیسے کسی احاطے میں آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ پھر وہ رک گیا۔ باہر نکلے تو ہم نے دیکھا کہ ہم اونچے مخروطی میناروں والے کسی پرانے یورپی قلعے کے احاطے میں ہیں۔ دن کی روشنی اب چاروں طرف پھیلنے لگی تھی۔ یہاں الجزائر کے مقابلے میں سردی تھی۔ جس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ یورپ کا کوئی ملک ہے۔ چونکہ الجزائر پر فرانس کا تسلط تھا اس لئے یہ فرانس ہی ہو سکتا تھا۔ قلعے کی راہ داریاں نیم روشن اور ٹھنڈی تھیں۔ لوہے کے سلاخ دار دروازے کھلتے چلے گئے، ایک جگہ ناصرہ کو مجھ سے الگ کر دیا۔ مجھے دوسری راہ داری کے کونے والی کوٹھڑی میں بند کر کے باہر لوہے کے سلاخوں والوں دروازے پر تالا ڈال کر سپاہی واپس چلے گئے۔ میرے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے۔ میں نے کوٹھڑی کا جائزہ لیا۔ کونے میں فرش سے دو فٹ اونچا ایک چبوترہ بنا تھا جس پر چار کمبل تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ میں سردی میں ٹھٹھر رہا تھا۔ جلدی سے کمبلوں میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ نیند بالکل غائب تھی۔ سوچ رہا تھا کہاں سے کہاں تقدیر لے آئی ہے۔ آگے کیا ہونیوالا تھا؟ کچھ خبر نہیں تھی۔ مجھے ناصرہ کا خیال آرہا تھا کہ نہ جانے اس پر کیا گذر رہی ہوگی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ یہ لوگ ہمیں فرانس میں کیوں لے آئے ہیں۔ پوچھ گچھ کرنی تھی تو وہ

الجزائر میں بھی کر سکتے تھے۔ اگر موت کے گھاٹ اتارنا تھا تو یہ کام وہ ہماری گرفتاری کے وقت ہی کر سکتے تھے۔ بہر حال میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ وہاں سے فرار ہونا تھا۔ مجھے اپنے ماورائی دوست سوانا کا خیال ضرور آیا مگر یہ حقیقت بھی میرے سامنے تھی کہ سوانا صرف اسی وقت میری مدد کو آتا رہا ہے جب زندگی اور موت کا معاملہ درپیش ہوا اس سے پہلے وہ کسی بھی مشکل کے وقت نہیں آیا تھا۔ مجھے اپنی ہمت اور اللہ کی رحمت پر پورا بھروسہ تھا۔ لیکن وہاں سے فرار ہونے سے پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ناصرہ کو کہاں قید میں رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اسے بھی نکالنا میرا فرض تھا۔ مجھے وہاں سے فرار کی کوئی صورت بظاہر نظر نہیں آ رہی تھی۔ کوٹھری قلعے کا تہہ خانہ تھا جس میں کوئی روشندان بھی نہیں تھا۔ راہ داری میں جو بتی جل رہی تھی صرف اس کی دھیمی کمزور سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ فضا مرطوب اور سرد تھی۔ دو پرانے کمبلوں میں بھی مجھے سردی لگ رہی تھی۔

ایسی خبریں ہم الجزائر میں ہی اخباروں میں پڑھتے رہتے تھے کہ خود فرانس میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو یہ چاہتا ہے کہ فرانس الجزائر پر اپنا ناجائز قبضہ ختم کر دے اور وہاں کے مسلمانوں کو حق خود ارادیت دے۔ ان میں فرانس کے دانشور بھی شامل تھے جن میں مشہور فلسفی ادیب ژاں پال سارتر پیش پیش تھا۔ بہت جلد مجھے اسکا ثبوت بھی مل گیا۔ مجھے اس پرانے فرانسیسی قلعے میں قید ہوئے کئی دن گذر گئے تھے۔ ایک رات ایک دوسرا آدمی میرے لئے پیاز کا سوپ لے کر آیا۔ اسکی فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ سر پر گرم اونی ٹوپی تھی۔ پرانا سا گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ سوپ کا مگ میرے پاس رکھ کر وہ دروازے کی سلاخوں کے پاس گیا۔ راہ داری میں ایک نظر ڈالی پھر میرے پاس آ کر دھیمی آواز میں پوچھا۔ تم فرنچ جانتے ہو؟ "تھوڑی تھوڑی" میں نے جواب دیا۔ وہ بولا۔ سنو۔ کل شام کو تمہیں ڈیول آئی لینڈ لے جانے کے لئے یہاں سے نکالا جائے گا۔۔۔۔۔۔" پھر اس آدمی نے مجھے ساری سکیم سمجھا دی۔ وہ الجزائر کی آزادی کا پرجوش حامی فرانسیسی تھا۔ جب وہ چلا گیا تو مجھے ناصرہ کا خیال آ گیا۔ اس آدمی نے ناصرہ کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

☆......☆......☆

الجزائری مسلمانوں کی تحریک آزادی کے حامی اس فرانسیسی نے اپنا نام رولاں بتایا تھا۔ یہ گویا اللہ نے غیب سے میرے لئے مدد بھیجی تھی۔ یہ انسان دوست فرانسیسی رولاں محض انسانی ہمدردی اور جمہوریت پسندی کی وجہ سے میری مدد کر رہا تھا۔ میں نے اس سے دو بار اپنی ساتھی اور صحیح معنوں میں الجزائری حریت پسند لڑکی ناصرہ کے بارے میں پوچھا مگر اس نے یہی جواب دیا کہ ناصرہ کو اس قلعے سے باہر کسی دوسری جگہ لے جایا گیا ہے جسکی اسے کچھ خبر نہیں ہے۔ بہر حال وہ مجھے ڈیول آئی لینڈ کے عذاب سے بچانا چاہتا تھا۔ ڈیول آئی لینڈ فرنچ گی آنا میں ایک دلدلی جزیرہ تھا جہاں خطرناک مجرموں کو جلا وطن کر دیا جاتا تھا اور پھر وہ وہیں مر جاتے تھے۔ وہاں کے وحشت ناک واقعات سن کر آدمی پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ عین موقع پر اس نے ایک غیبی مدد بھیج دی۔ رولاں کے کہنے کے مطابق اگلے روز شام کے وقت مجھے اس پرانے قلعے سے ایک بند گاڑی میں بٹھا کر بندرگاہ کی طرف روانہ کیا جائے گا۔ میرے فرانسیسی محسن رولاں نے ساری باتیں سمجھا دی تھیں کہ مجھے کیا کیا کرنا ہے۔ بند گاڑی بندرگاہ کے احاطے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے باہر نکالا گیا۔ اس وقت میرے ہاتھ پیچھے بندھے تھے۔ آسمان ابر آلود تھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ فضا سرد اور مرطوب تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ یہ ایک چھوٹی

سی بندرگاہ تھی۔ ایک جانب کچھ کیبن تھے۔ جن میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ سمندر پر دھند چھائی تھی۔ ایک بڑا بحری جہاز ٹیلے کی طرح سمندر میں کچھ فاصلے پر لنگر انداز تھا۔ اسکی بتیاں دھند میں ٹمٹما رہی تھیں۔ جونہی گارڈ مجھے بازو سے پکڑ کر جیٹی کی طرف چلا میں نے رولاں کی بتائی ہوئی سکیم کے مطابق اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور پھر زمین پر گر کر یہ ظاہر کیا کہ میں بے ہوش ہوگیا ہوں۔ گارڈ مجھے جھک کر دیکھنے لگے۔ پھر کسی نے اونچی آواز میں کہا۔ "اسے گھسیٹ کر لے چلو"۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "کیا کر رہے ہو"۔ یہ یہیں مر گیا تو ہماری نوکری چلی جائے گی۔ اسے کلینک ہی لے چلو۔ ڈاکٹر ابھی کوئی ٹیکہ لگا کر اسے ٹھیک کر دے گا۔" میں نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ میرے دوست رولاں کی آواز تھی۔ اسی وقت دو آدمیوں نے مجھے اٹھایا اور قریبی کیبن میں لے جا کر سٹریچر پر لٹا دیا۔ میں کسی کسی وقت ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھ لیتا تھا۔ یہاں رولاں کا ساتھی ڈاکٹر پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھے چیک کیا اور گارڈ سے کہا۔ "یہ مر رہا ہے۔ اسے دل کا دورہ پڑا ہے" ڈاکٹر نے پروگرام کے مطابق مجھے گلوکوز کا انجکشن لگایا اور بولا۔

"اسے یہاں کچھ دیر آرام کرنے دو۔ ہمیں باہر چلے جانا چاہیے۔"

اور ڈاکٹر فرنچ گارڈ کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ گویا اس نے میرے فرار کا راستہ صاف کر دیا تھا۔ رولاں کی سکیم بھی یہی تھی۔ میں اسی سکیم کے مطابق سٹریچر سے اٹھا۔ کھڑکی کے پاس جا کر اس کے پٹ کو ذرا سا دھکیلا۔ وہ پہلے سے کھلی تھی۔ دیوار کی دوسری جانب اندھیرے میں جھاڑیاں اور درخت تھے۔ میں نے چھلانگ لگا دی اور رولاں کی ہدایت کے مطابق جتنی تیزی سے دوڑ سکتا تھا دوڑنے لگا۔ آگے لوہے کا ایک جنگلا آگیا۔ میں نے جنگلہ پار کیا۔ سامنے ایک چھوٹا سا پارک تھا جس میں کہیں کہیں بتی روشن تھی۔ میں پارک کی باڑھ کے ساتھ ساتھ دوڑتا اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں جھاڑیوں میں ایک سائیکل پہلے سے رکھ دی گئی تھی۔ میں نے سائیکل باہر نکالی اور اس پر سوار ہو کر چھوٹی ڈھلانی سڑک پر تیزی سے سائیکل بھگانے لگا۔ یہ سڑک آگے جا کر شہر سے آتی ہوئی بڑی سڑک کے ساتھ مل گئی تھی۔ وہاں ایک طرف اندھیرے میں چھوٹی سی پگ ڈنڈی کھیتوں

میں جاتی تھی۔ میں نے سائیکل وہیں جھاڑی میں چھپا دی اور کھیتوں میں پیدل چل دیا۔ کھیتوں پر دھند چھا رہی تھی۔ اب رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ چار کھیت پار کرنے کے بعد بائیں ہاتھ کو چھوٹے سے ٹیلے کے دامن میں اونچے درختوں کے درمیان وہ گیراج نظر آیا جہاں چھپنے کی مجھے رولاں نے ہدایت کی تھی۔ گیراج کے باہر پرانے ٹائروں کا ڈھیر سا پڑا تھا۔

ایک بوڑھا آدمی گرم جیکٹ کے اوپر گلے میں مفلر لپیٹے، منہ میں پائپ دبائے پہلے سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھکر وہ اندھیرے سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔

"میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ"

گیراج میں سے ایک زینہ نیچے تہہ خانے کو چلا گیا تھا۔ اس تہہ خانے میں دھیمی روشنی والا بلب روشن تھا۔ ایک سٹریچر دیوار کے ساتھ لگا تھا جس پر چار پانچ کمبل پڑے تھے۔ اسکا ایک روشندان اوپر جھاڑیوں میں کھلتا تھا۔ اسی روشندان سے تہہ خانے میں تازہ ہوا آ رہی تھی۔ بوڑھے آدمی نے کہا۔

"تمہیں یہاں ہر شے مل جائے گی۔ باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "ناصرہ کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟"

بوڑھے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتا۔ یہ رولاں ہی تمہیں بتا سکے گا۔ اب تم آرام کرو۔ وہ صبح تمہیں کسی وقت آکر ملے گا۔"

وہ چلا گیا۔ وہاں کافی سردی تھی۔ میں چار پانچ کمبل جسم کے گرد لپیٹ کر سٹریچر پر ہی لیٹ گیا۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ فوراً ہی نیند آگئی۔

اگلے روز رولاں نے آ کر مجھے جگایا تو روشندان میں سے دن کی دھندلی دھندلی روشنی تہہ خانے میں آ رہی تھی۔ رولاں اپنے ساتھ کافی سے بھری ہوئی تھرمس اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ میرے فرار کا سب کو علم ہو گیا ہے۔ پولیس جگہ جگہ تمہیں تلاش کر رہی،

ہے۔ مجھ پر کسی کو شک نہیں ہوا۔ رولاں کی زبانی اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ مارسیلز کا پورٹ سنی تھا۔ میں نے ناصرہ کی بابت پوچھا تو رولاں کپ میں کافی انڈیلتے ہوئے کہنے لگا۔

"پہلے خیال تھا کہ اسے بھی تمہارے ساتھ ہی ڈیول آئی لینڈ میں جلاوطن کیا جائے گا۔ لیکن پھر فرانسیسی حکام نے ارادہ بدل لیا۔ لیکن یہ ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ پولیس حکام اسے کہاں لے گئے ہیں۔ ہمارے آدمی برابر کھوج لگانے میں لگے ہیں۔" اگر تم چاہو تو میں تمہیں الجزائر پہنچانے کا انتظام کر سکتا ہوں۔"

مگر اخلاقی طور پر مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ میں اس شخص کی بیٹی کو ظالموں کے پاس ایسے ہی چھوڑ کر چلا جاؤں جس نے الجزائر میں مجھے پناہ دی تھی۔ میں نے رولاں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا کہ میں ناصرہ کو ساتھ لے کر ہی واپس جاؤں گا۔ وہ بولا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ تم یہاں دو تین دن رہو۔ میں ناصرہ کا پتہ چلا لوں گا۔" "مگر دن کے وقت ہرگز ہرگز گیراج سے باہر مت نکلنا۔"

تین دن میں اس تہہ خانے میں بند رہا۔ چوتھے دن دوپہر کے وقت رولاں آیا تو وہ کچھ پریشان سا تھا۔ میں نے پوچھا ناصرہ کا کچھ پتہ چلا؟ رولاں لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور بوجھل لہجے میں بولا۔

"فرنچ گورنمنٹ نے اس الجزائری حریت پسند خاتون سے بڑا گھناؤنا سلوک کیا ہے۔"

میں رولاں کا منہ تکنے لگا۔ "کیا مطلب؟"

☆......☆......☆

انسان دوست اور الجزائر حریت پسندوں کے ہمدرد اور میرے فرانسیسی محسن رولاں نے مجھے بتایا کہ ابو ناصر کی بیٹی ناصرہ کو فرنچ خفیہ پولیس نے زندہ درگور کر دیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ تھی کہ فرانس کی سنٹرل انٹیلی جنس نے ناصرہ کو ایک ایسے فرنچ کاؤنٹ کے ہاتھ فروخت کر دیا جو الجزائری حریت پسندوں کا جانی دشمن تھا۔ مارسیلز کی بندرگاہ کے جنوب مشرق کی طرف سمندر میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جہاں اس کاؤنٹ کا پرانا قلعہ ہے۔ اس چھوٹے سے جزیرے پر کاؤنٹ کی حکمرانی ہے۔ اس نے چیتے پال رکھے ہیں۔ جن کو ساتھ لے کر وہ جزیرے کے جنگل میں شکار کھیلنے جاتا ہے۔ رولاں کی اطلاع کے مطابق ناصرہ اسی جابر کاؤنٹ کے قلعے میں قید تھی

میں نے کہا۔

"اسے وہاں سے نکالنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟"

رولاں بولا۔ "یہ تقریباً ناممکن ہے۔ کاؤنٹ کی وہاں اپنی ایک چھوٹی سی فوج ہے جو پیشہ ور مجرموں اور سزا یافتہ اجرتی قاتلوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اس آمر کاؤنٹ کے قلعے میں جو قیدی یا کنیز ایک بار داخل ہو جاتی ہے پھر اس کی لاش بھی نہیں ملتی۔"

میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ میں ناصرہ کو جابر کاؤنٹ کی قید سے ضرور نکال لاؤں گا۔

خواہ اس کے لئے مجھے کتنی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ رولاں کو پورا یقین تھا کہ اب میں واپس الجزائر چلے جانے کا پروگرام بناؤں گا۔ کہنے لگا۔

"آج شام میں تمہیں ایک اپنے اعتباری آدمی کے حوالے کر دوں گا۔ وہ تمہیں الجزائر کے ساحل تک خود پہنچا کر آئے گا"

میں نے کہا۔ "کیا تم مجھے کسی طرح کاؤنٹ کے جزیرے تک پہنچا سکتے ہو؟ آگے میں خود سنبھال لوں گا"

رولاں کچھ حیران ہوا۔ اسے مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ "کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ جو جان بوجھ کر موت کے منہ میں جانا چاہتے ہو۔"

میں نے کہا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ حریت پسند مجاہد ناصرہ کو جزیرہ کاؤنٹ کے پنجہ ستم سے نکالے بغیر یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔"

رولاں ہمدردانہ انداز میں کہنے لگا۔

"تم نہیں جانتے تم نے کیا فیصلہ کر لیا ہے۔ فرنچ پولیس کے چنگل سے تم جان بچا کر فرار ہو سکتے ہو مگر ایک بار کاؤنٹ کے خونی جزیرے میں پہنچے تو دوسرے لمحے کاؤنٹ تمہاری لاش اپنے خونخوار درندوں کے آگے ڈال رہا ہو گا۔"

میں نے رولاں کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور بھرپور اعتماد کے ساتھ کہا۔

"رولاں! اگر تمہیں الجزائری حریت پسندوں کی کاز سے ذرا ہمدردی ہے تو مجھے کسی طرح کاؤنٹ کے جزیرے تک پہنچا دو۔ اس سے زیادہ میں تم سے کچھ نہیں چاہتا۔"

رولاں سوچ میں پڑ گیا۔ اسے میرے پختہ عزم کا یقین ہو گیا تھا۔ کہنے لگا۔ "میں کل تمہیں کچھ بتا سکوں گا۔ مجھے صورت حال کا اچھی طرح سے جائزہ لینا ہو گا۔ کیونکہ کاؤنٹ کے جزیرے پر کوئی بھی انسان اس کی مرضی اور اس کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا۔ فرانسیسی انٹیلی جینس نے جب ناصرہ کو اس کے حوالے کیا تھا تو اسے تمہاری فل رپورٹ بھی دے دی تھی کہ تم اس کے ساتھی ہو۔ تمہاری ایک تصویر بھی کاؤنٹ کے پاس پہنچ چکی ہے۔ تمہیں ساحل پر ہی کاؤنٹ کے

آدمی شوٹ کر دیں گے۔ کاؤنٹ کا اپنا کوسٹ گارڈز کا نظام ہے کاؤنٹ نے ان سب گارڈز کو تمہاری تصویر کی کاپی دے دی ہو گی۔

رولاں دوسرے روز آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ میں سارا وقت کاؤنٹ کے خونی جزیرے میں ناصرہ تک پہنچنے اور اسے وہاں سے نکالنے کے منصوبوں پر غور کرتا رہا۔ کیونکہ یہ مجھے یقین تھا کہ میں جزیرے پر ضرور پہنچوں گا خواہ مجھے سمندر میں تیرنا ہی کیوں نہ پڑے

دوسرے روز صبح صبح رولاں میرے پاس گیراج میں آیا۔ ہم نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ دن بھی کافی ٹھنڈا تھا۔ باہر شروع ستمبر کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں سخت گرم کافی پی رہے تھے۔ میں نے رولاں سے اصل موضوع پر گفتگو شروع کی تو وہ بولا۔ میں، شارل اور دو تین۔ ہم تینوں رات گئے تک غور کرتے رہے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ نارمل طریقے سے تمہارا کاؤنٹ کے جزیرے تک پہنچنا ناممکن ہے۔ تم تصور نہیں کر سکتے کہ کاؤنٹ نے لاکھوں ڈالر خرچ کر کے اپنے جزیرے کے دفاعی نظام کو جدید ترین بنا دیا ہوا ہے۔ جزیرے پر کوئی اجنبی کاؤنٹ کی مرضی کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا۔ چونکہ وہ موجود فرنچ گورنمنٹ کا طرفدار ہے۔ اس لئے اسے حکومت کی حمایت بھی حاصل ہے اور بظاہر وہ جزیرے پر غیر قانونی سرگرمیوں میں بھی ملوث نہیں ہے۔ لیکن اندرونی طور پے وہ جس کو چاہتا ہے فرانس کے شہر یا گاؤں سے اغوا کر کے لے جاتا ہے اور پھر اسکا کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

میں نے رولاں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ تم ایسا کرو کہ مجھے کسی ہیلی کاپٹر یا جہاز سے جزیرے پر پیرا شوٹ کی مدد سے گرا دو رولاں ہنس کر بولا اس سے پہلے کہ ہم تمہیں وہاں گرائیں کاؤنٹ کے ساحلی میزائل ہمارے ہیلی کاپٹر یا جہاز کے پرخچے اڑا چکے ہوں گے۔" پھر اس نے مجھے ہمدردانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ واپس الجزائر چلے جاؤ۔ میں تمہیں حفاظت سے وہاں تک پہنچا دوں گا"

میں اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔ میں بحرہ روم میں تیر کر چلا جاؤں گا۔ مجھے تیرنا آتا ہے۔ میں

الجزائر کی امانت واپس لے کر جاؤں گا۔ یہ میرا فرض ہے۔ ناصرہ کو میں ایک جابر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

رولاں ذہن میں ایک سکیم سوچ کر آیا تھا مگر وہ میرے جذبے کی شدت کو پرکھنا چاہتا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں الجزائر الجزائری مجاہدہ کو جزیرے سے نکالنے کا پختہ عزم کر چکا ہوں تو اس نے مجھے اپنی سکیم بتا دی۔ ہر پندرہ دن کے بعد کاونٹ کے جزیرے کو ضروری سامان لے کر ایک سٹیمر جاتا تھا۔ یہ سامان ایک کنٹریکٹر سپلائی کرتا تھا جو رولاں کا دوست تھا اور جس سے رولاں نے بات پکی کر لی تھی۔ سکیم یہ تھی کہ مجھے سامان لے جانے والے لکڑی کے بڑے کھوکھوں یعنی کریٹوں میں سے ایک کریٹ میں چھپا دیا جائے گا۔ یہ کریٹ جزیرے کے ایک گودام میں جا کر سٹور کر دیئے جاتے تھے۔ اس گودام میں پہنچے کے بعد مجھے خود ہی کریٹ سے نکل کر کاونٹ کے قلعے تک رسائی حاصل کرنی تھی۔ وہاں رولاں میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں جذبات کے جوش میں آ کر سکیم پر عمل کرنے پر تیار ہو گیا۔ جذبات کی میں نے ہمیشہ قدر کی ہے۔ جذبات ہی زندگی کا ثبوت ہیں۔ یہی انسان کو زندہ رکھتے ہیں۔ مارسیلز سے کاونٹ کے جزیرے تک سٹیمر نے چار گھنٹوں میں سمندری فاصلہ طے کرنا تھا۔ اور مجھے دو گھنٹے پہلے لکڑی کے کھوکھے میں بند ہو جانا تھا۔

یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو مجھے ساری زندگی یاد رہے گا۔

☆......☆......☆

مجھے چھ گھنٹے لکڑی کے کھوکھے میں بند رہنا تھا۔ دو گھنٹے سمندر میں سفر کرنے سے پہلے اور اس کے بعد چار گھنٹے کا سمندری سفر تھا۔ میرے لئے یہ تجربہ بالکل نیا اور کسی حد تک خطرناک بھی تھا۔ اگرچہ میرے فرانسیسی دوست رولاں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ کھوکھے کی دیواروں میں جگہ جگہ ایسے سوراخ کر دیئے جائیں گے جہاں سے مجھے تازہ ہوا اندر آتی رہے گی لیکن ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ میرا کھوکھا سٹیمر کے گودام میں دوسرے سامان کے بیچ میں دب جائے اور میرا دم گھٹنے لگے۔

جب اس نے اس خدشے کا اظہار کیا تو رولاں کہنے لگا۔

"جس کریٹ میں تم بند کئے جاؤ گے اسے شارل خاص طور پر ایسی جگہ الگ رکھے گا جہاں تمہیں تازہ ہوا ملتی رہے گی۔ موسم سرد ہے۔ اندر تمہیں گرمی کا احساس بھی نہیں ہو گا۔"

بہر حال مجھے اس مرحلے سے گزرنا ہی تھا۔ چنانچہ ایک روز شام کو وقت مقررہ پر مجھے بندرگاہ ایک نیم روشن سرد گودام میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بہت سا سامان پڑا تھا۔ شارل پہلے سے موجود تھا۔ اس نے گودام کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کونے میں لکڑی کا ایک ڈبہ پڑا تھا جو کوئی ڈھائی فٹ اونچا اور چھ فٹ لمبا تھا۔ اس میں تین چار جگہوں پر خفیہ سوراخ رکھے گئے تھے۔ اس

ڈبے کے اندر فوم کا پتلا بستر بچھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے فوم کے تکیے لگے تھے تاکہ کھوکھے کے ادھر ادھر ہونے سے مجھے تکلیف نہ ہو۔

پہلو کی دیواروں پر کیلیں بھی لگی تھیں۔ جنہیں بوقت ضرورت میں پکڑ کر اپنا توازن ٹھیک رکھ سکتا تھا۔ کریٹ کے اندر ہی لوہے کا ایک ڈیڑھ دو فٹ لمبا سریا بھی تھا۔ جسکی مدد سے مجھے کریٹ کا ڈھکنا اکھاڑ کر باہر نکلنا تھا۔ شارل کہنے لگا۔

''میں ڈھکن کو بڑے کیلوں کی بجائے چھوٹے کیلوں سے بند کروں گا تاکہ وہاں تمہیں اسے کھولنے میں آسانی ہو۔''

رولاں نے مجھے ایک بھرا ہوا ریوالور اور کچھ فالتو گولیاں بھی دیں۔ پستول کے آگے سائی لینسر لگا تھا۔ کہنے لگا۔

اسے بغیر ضرورت کے مت چلانا''

شارل نے گھڑی دیکھی اور کہنے لگا۔

''وقت ہو گیا ہے۔ وہ لوگ سامان نکالنے آنے ہی والے ہیں۔ اب تم کریٹ کے اندر لیٹ جاؤ''

مرتا کیا نہ کرتا۔ میں کریٹ کے اندر فوم کے پتلے بستر پر سیدھا لیٹ گیا۔ رولاں نے کہا۔

''اب آگے سب کچھ تمہیں خود ہی سنبھالنا ہے وہاں ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ ہم میں سے کوئی وہاں نہیں جا سکتا۔ ایک بار پھر سوچ لو''

میں ناصرہ کو جابر کاؤنٹ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر واپس الجزائر کیسے جا سکتا تھا۔ ان لوگوں کے مجھ پر بڑے احسان تھے اور پھر یہ بہادر مسلمان حریت پسند لڑکی اسلام اور اپنے وطن کی خاطر ساری مصیبتیں جھیل رہی تھی۔ میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

''میں ضرور جاؤں گا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔''

شارل نے کریٹ کے اوپر ڈھکن رکھ دیا۔ یہ پلائی ووڈ کا ڈھکن تھا۔ باقی کریٹ سخت

لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ ایکدم اندھیرا چھا گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں کسی قبر میں بند ہو گیا ہوں۔

ایک بار تو میرا دل گھبرا گیا اور جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ پھر میں نے اپنے حواس کو درست کیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ کریٹ کے ڈھکن کے کناروں پر چھوٹی کیلیں ٹھونکی جا رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ بند کھوکھے میں میرے سرہانے اور کندھوں کی جانب سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ گودام میں سخت سردی تھی مگر بند کھوکھے کے اندر گرماہٹ تھی۔ اگر گرمیوں کا موسم ہوتا تو میرے لئے شاید بند کھوکھے میں پانچ منٹ گذارنے بھی مشکل ہو جاتے۔

ڈھکن بند کر دیا گیا۔ رولاں نے اوپر آہستہ سے ہاتھ مار کر کہا۔

''خدا حافظ دوست! اگر تم کاؤنٹ کے جزیرے سے کامیاب واپس آ گئے تو سیدھا میرے گیراج میں آ جانا۔ میں تمہیں اور ناصرہ کو الجزائر پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا۔'' میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے ان دونوں کے قدموں کی آواز گودام کے دروازے تک جاتی سنائی دی۔ اس کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آبی پرندوں کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ دور سے کسی سمندری جہاز کا وسل بار بار سنائی دے رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں میرا جسم اکڑ کر لکڑی کی طرح ہو گیا۔ میں اپنے جسم کو ادھر ادھر ہلانے لگا جس سے کچھ سکون محسوس ہوا۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد گودام کا دروازہ کھلا اور کچھ مزدور آپس میں فرانسیسی زبان میں باتیں کرتے اندر داخل ہوئے۔ وہ سامان گھسیٹ کر باہر لے جانے لگے۔ وہ ایک ٹھیلہ بھی ساتھ لائے تھے۔ اس ٹھیلے کو میں نے بائیں جانب والی دیوار کے سوراخ میں سے دیکھا۔

پھر وہ میرے کریٹ کی طرف آئے۔ میں نے دیوار میں لگی لوہے کی کیلوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ انہوں نے کریٹ کو اٹھا کر ٹھیلے پر رکھ دیا۔ پھر کچھ دوسرے بکس میرے اوپر رکھے اور ٹھیلہ چلاتے گودام سے باہر نکل آئے۔ یہاں جیٹی پر روشنی تھی۔ میں نے سوراخ میں سے دیکھا کہ جیٹی کے ساتھ ہی ایک سٹیمر لگا تھا۔ اس پر سامان لادا جا رہا تھا۔ میرے والا کریٹ بھی سٹیمر

پرے جا کر ایک طرف ڈال دیا گیا۔ سوراخوں میں سے سمندر کی ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سٹیمر کاونٹ کے جزیرے کی طرف چل پڑا۔ دو ملاح میرے کھوکھے کے اوپر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں فرانسیسی زبان سمجھنے لگا تھا۔ وہ موسم کی کسی پیش گوئی کا ذکر کر رہے تھے جس میں کہا گیا تھا کہ سمندر میں طوفان آنے والا تھا۔ مگر یہ طوفان رات کو آئے گا۔ چار گھنٹے سٹیمر سمندر میں چلتا رہا۔ سٹیمر کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ میں کھوکھے میں سیدھا لیٹا بالکل پتھر ہو گیا تھا۔ خدا خدا کر کے سٹیمر جزیرے کے ساحل پر جا کر رک گیا۔

☆......☆......☆

جس کریٹ یا لکڑی کے لمبے کھوکھے میں میں بند تھا اسے بھی دوسرے سامان کے ساتھ اٹھا کر جزیرے کے گودام میں کسی جگہ رکھ دیا گیا۔ چھ گھنٹے سے لکڑی کی قبر میں بند تھا۔ میرا برا حال ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا کہ ابھی دم نکل جائے گا۔ سارا بدن پتھر ہو رہا تھا۔ جب کچھ لوگ میرے کھوکھے کو رکھ کر چلے گئے تو میں باہر نکلنے کے واسطے بے تاب ہو گیا۔ مگر یہاں بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ ذرا سی بے احتیاطی مجھے موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ میں ایک سنگ دل ظالم کے جزیرے پر پہنچ چکا تھا اور بالکل اکیلا تھا۔ عین ممکن تھا کہ گودام میں محافظ موجود ہوں۔

میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ گودام میں گہری خاموشی تھی۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس وقت رات کا دو بجے کا عمل ہو گا۔ لوہے کا سریا میرے پاس ہی رکھا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر لیٹے ہی لیٹے سریا اٹھایا اور اسکی مدد سے لکڑی کا اوپر والا تختہ آہستہ آہستہ اکھاڑنے لگا۔ میں بڑی احتیاط سے یہ کام کر رہا تھا۔ تاکہ ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہو۔ پندرہ بیس منٹ کی کوشش کے بعد میں لکڑی کے کریٹ سے باہر آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرا کریٹ کچھ کھوکھوں کے اوپر پڑا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میرے اوپر کوئی کھوکھا نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

یہ ایک اونچی چھت والا کافی کشادہ گودام تھا جو مختلف قسم کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ چھت کے درمیان میں ایک بلب روشن تھا۔ سامنے اونچا دروازہ تھا جو بند تھا۔ وہاں محافظ کوئی نہیں تھا۔ میں دروازے کے پاس گیا۔ دروازہ باہر سے بند تھا اور اتنا مضبوط تھا کہ میں اسے کھول نہیں سکتا تھا۔ ایک طرف کھڑے ہو کر میں نے گودام کا جائزہ لیا۔ ایک طرف دیوار میں چھت کے پاس ساتھ ساتھ بنے ہوئے تین روشندان تھے۔ میں لکڑی کے کھوکھوں پر چڑھ کر روشندان تک پہنچ گیا۔ روشندان ایسا تھا کہ اسکے شیشے والا چوکھٹا اوپر کو اٹھ جاتا تھا۔ میں نے اسے اوپر اٹھایا تو باہر سے سمندری ہوا کا ٹھنڈا جھونکا میری پیشانی سے چھو کر گذر گیا۔ میں نے سر باہر نکال کر دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف رات کی تاریکی میں مجھے سیاہ چٹانوں اور سمندر کی تاریک موجوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ بہرحال مجھے اس روشندان کے نیچے اترنا تھا۔ گودام میں سے مجھے نائیلون کی ایک رسی مل گئی جس کو روشندان کے اوپر والے کنڈے سے میں نے دہرا کر کے نیچے گذار دیا کہ نیچے اترنے کے بعد رسی بھی کھینچ سکوں تاکہ کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ کوئی یہاں سے باہر نکلا ہے۔

تھوڑی دیر بعد میں سمندر کے کنارے چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے درمیان اتر گیا۔ رسی کو کھینچ کر اسکا گچھا بنایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ میں چٹانوں کے درمیان سے گذرتا ہوا گودام سے کچھ دور چڑھائی چڑھ کر اوپر زمین کی سطح پر آگیا جہاں گھاس اگی تھی اور اندھیرے میں کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ نظر آرہے تھے۔ ان کی بائیں جانب ایک اونچی جگہ پر روشنی ہو رہی تھی۔ میں اس روشنی کی طرف چل پڑا۔ سمندری لہریں۔ ساحلی چٹانوں سے ٹکراتیں تو ان کا شور بلند ہوتا جو اب میرے پیچھے رہ گیا تھا۔ میری پوزیشن عجیب و غریب تھی۔ یعنی میں ایک سفاک قاتل کے جزیرے پر تھا جہاں اس کی اپنی حکومت تھی اور اس کے محل سے یا اس کے محل کے قید خانے سے الجزائر کی حریت پسند لڑکی ناصرہ کو نکال کر لے جانے والا تھا۔ میرے پاس صرف وہی ایک بھرا ہوا ریوالور اور کچھ فالتو گولیاں تھیں جو میرے فرانسیسی دوست نے میرے ساتھ رکھ دی تھیں۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ قید خانہ کہاں ہے جہاں ناصرہ قید ہے۔ ابھی تک مجھے کاونٹ کا محل بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔

جس روشنی کی طرف میں جا رہا تھا وہ ایک ٹیلے پر بنے ہوئے چھوٹے سے لائیٹ ہاؤس سے نکل رہی تھی۔ روشنی کا رخ سمندر کی طرف تھا۔ میں اس طرف جانے کی بجائے دوسری طرف مڑ گیا۔ رات کی تاریکی نے مجھے محافظوں کی نظروں سے چھپا رکھا تھا۔ جزیرے میں ادھر ادھر کافی درخت تھے۔ زمین اونچی نیچی تھی۔ میں ایک جگہ چڑھ گیا۔ اوپر پہنچا تو دیکھا دوسری طرف ایک کھلی جگہ کے وسط میں شاندار عمارت کھڑی ہے۔ جس میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی ہے۔ ارد گرد اونچی دیوار ہے جس کے درمیان میں لوہے کا ایک گیٹ تھا جہاں دو گارڈ پہرہ دیتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔

یقیناً یہی کاونٹ کا محل تھا۔ اور ضرور ناصرہ اسی محل میں کسی جگہ قید تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ مجھے کیسے پتہ چلے کہ ناصرہ کہاں پر ہے اور میں خود اندر کس طرح جاؤں؟ رات گذرتی جا رہی تھی۔ صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا صبح ہونے سے پہلے پہلے کرنا تھا۔ دن کی روشنی میرے لئے بہت بڑا خطرہ بن سکتی تھی، میں ٹیلے سے اتر کر کاونٹ کے محل کی اونچی دیوار کے قریب آکر چھپ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک تنگ سی سڑک دور درختوں کی طرف سے محل کے گیٹ کی طرف آتی تھی۔ میں اس سڑک پر آکر پیچھے کی طرف چلنے لگا۔ میں درختوں کے نیچے اندھیرے میں چل رہا تھا۔

اچانک میرے کانوں میں کسی ٹرک کے رینگ رینگ کر چلنے کی آواز آئی۔ میں رک گیا۔ سڑک پر ایک ٹرک کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں۔ ٹرک آہستہ آہستہ محل کے گیٹ کی طرف آرہا تھا۔ اس پر اتنا سامان لدا ہوا تھا کہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ یا شاید محل کے قریب آجانے کی وجہ سے اس کی رفتار ہلکی کر دی گئی تھی۔ جب ٹرک میرے قریب سے گذرا تو میں دوڑ کر اس کے پیچھے چلا گیا۔

یہ ترکیب میں نے اسی وقت سوچی تھی۔ پیچھے سے ٹرک کھلا تھا اور اسکی زنجیر نیچے لٹک رہی تھی۔ میں زنجیر کو پکڑ کر ٹرک کے اوپر چڑھ گیا اور بوریوں اور لکڑی کے چھوٹے بڑے ڈبوں کے درمیان چھپ کر بیٹھ گیا۔ شاید یہ سامان گودام سے لایا جا رہا تھا۔ ٹرک گیٹ پر رک گیا۔ ڈرائیور

نے گارڈز کو ہیلو ہیلو کیا۔ میں بوریوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ گارڈز نے پیچھے آ کر ٹرک کے سامان کا جائزہ لیا اور ڈرائیور کے لئے گیٹ کھول دیا۔ ٹرک اسی طرح رینگتا ہوا محل کے احاطے میں داخل ہوا اور ایک چکر کاٹ کر کسی جگہ رک گیا۔ میں نے بوریوں میں سے سر نکال کر دیکھا۔ یہ محل کا وہی حصہ تھا جہاں اونچے درختوں کے پیچھے بائیں جانب ایک لمبی بارک بنی ہوئی تھی۔ میں نے ٹرک میں سے چھلانگ لگائی اور بارک کی طرف دوڑ پڑا۔

☆......☆......☆

میری زندگی کے ایک ہنگامہ خیز سفر کی کہانی جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے نئے نئے موڑ سامنے آ رہے ہیں۔ تحیر و تجسس کے پر خطر دروازے کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ ہر قدم پر موت قریب سے ہو کر گذر جاتی ہے۔ صحرا ختم ہوتا ہے تو خونخوار درندوں سے بھرا ہوا جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ شہر ایسے آتے ہیں کہ جہاں موت گھات لگائے بیٹھی ہوتی ہے۔ آج پر سکون زندگی کی تنہائی میں بیٹھا جب یہ حیرت میں ڈالنے والی داستان حیات قلم بند کر رہا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ کبھی ایسے خوفناک واقعات سے بھی واسطہ پڑا تھا اور کبھی اس آگ اور خون کے دریا سے بھی گذر گیا تھا۔

یہ واقعات دوسری عالمی جنگ کے بعد کے ہیں جب جرمنی کو شکست ہو چکی تھی۔ ہٹلر اپنی چانسلری میں موت کو گلے لگا چکا تھا اور شرق وسطی اور شرق بعید کے وہ ممالک جن پر یورپی استعمار نے قبضہ کر رکھا تھا۔ غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزاد ہونے کی جدوجہد میں مصروف تھے اور اس جنگ آزادی میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے تھے۔ الجزائر بھی ایسے ہی ممالک میں سے ایک ملک تھا۔ جو فرانس کے جبر و استبداد کے خلاف جہاد کر رہا تھا اور جہاں کے مسلمان حریت پسند کی تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔

ناصرہ بھی انہی حریت پسندوں کی آگ کی ایک بھڑکتی ہوئی چنگاری تھی جسے فرانس کی پولیس نے گرفتار کر کے جنوبی فرانس کے اس چھوٹے سے جزیرے کے مطلق العنان اور ظالم کاونٹ کے حوالے کر دیا تھا۔ فرانس کی حکومت نے اس الجزائری دلیر حریت پسند خاتون کو زندہ درگور کر کے اس سے بڑا بھیانک انتقام لیا تھا۔ اور میں نے اسی عظیم خاتون کو ظلم کے چنگل سے

نکال کر لے جانے کے لئے جزیرے کے جہنم میں چھلانگ لگا دی تھی۔

رات کا اندھیرا۔ فرانس کے سرد موسم کی سرد ویران، اندھیری رات۔ مارسلز کے ساحل سے دور بیچ سمندر کا یہ اذیت ناک جزیرا، جسکی مرطوب فضا میں ہر سانس کے ساتھ موت کی پھنکار سنائی دیتی تھی۔ میں ٹرک سے کود کر ایک بارک کی طرف دوڑا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس بارک میں کیا ہے۔ میرے لئے وہاں زندگی کی پناہ ہے یا موت گھات لگائے بیٹھی ہے۔ یہ بارک کاونٹ کے محل کے احاطے کے اندر تھی۔ یہ یورپ کے دیہاتی طرز کا ایک فارم ہاؤس سا تھا جو خالی پڑا تھا۔ ایک طرف خشک گھاس کے گٹھے پڑے تھے۔ بارک کے دوسرے دروازے کی طرف ایک پتھر کا زینہ اوپر محل کی گیلری کو جاتا تھا۔ میں زینہ چڑھ گیا۔ یہاں کسی جگہ کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ وہاں کسی غیر آدمی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گیلری بھی خالی تھی۔ کونے کی جانب کوئی کمرہ تھا جس کا دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا۔ میں جلدی سے اندھیرے میں ہو گیا۔ یہاں سردی تھی۔ سرد مرطوب ٹھنڈے آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ کمرے میں سے ایک انسانی سایہ باہر نکلا۔ اور گیلری کے نیچے جھانکنے کے بعد واپس کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ دوبارا بند ہو گیا۔ میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر کی جانب دروازے کے اوپر کوئی روشندان نہیں تھا۔ کمرے کے اندر سے ایک عورت اور ایک مرد کے باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھیں۔ میں نے بند دروازے کے ساتھ کان لگا دیئے۔ عورت فرانسیسی زبان میں کہہ رہی تھی۔ ''میں بھی عورت ہوں۔ مجھ سے اس عورت کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔'' مرد نے اسے جھڑک کر کہا۔ ''تم خاموش رہو۔ اگر کاونٹ نے یہ بات سن لی تو وہ تمہارے ساتھ میری بھی گردن اڑا دے گا۔'' عورت بولی۔ ''اس الجزائری لڑکی نے کوئی جرم نہیں کیا۔ وہ اپنے ملک کی آزادی کی خاطر لڑ رہی ہے اور یہ کوئی جرم نہیں۔ تم اتنے بے حس کیوں ہو گئے ہو۔'' مرد نے اس بار عورت کو بری طرح سے جھڑک دیا اور کہا۔ ''آج تو تم اس کے لئے سوپ لے کر چلی جاؤ۔ کل سے میں جایا کروں گا۔ اور خبردار اگر کسی کے سامنے ایسی بات کی۔ جاؤ اب۔''

میں جلدی سے دروازے سے ہٹ گیا۔ اور دبے پاؤں دوڑتا ہوا گیلری کے زینے پر آ گیا۔ کمرے کے دروازے میں سے ایک عورت کا سایہ نمودار ہوا جس نے ہاتھ میں ایک ڈول سا اٹھا رکھا تھا۔ یقیناً یہ ناصرہ کے لئے سوپ لے جا رہی تھی۔ اس عورت کو ناصرہ سے ہمدردی تھی۔ اس عورت سے بڑا کام لیا جا سکتا تھا۔ عورت نے پرانڈی کی طرز کا لمبا گرم کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر اونی ٹوپی میں چھپا تھا۔ وہ گیلری کی دائیں جانب گھوم گئی۔ میں بھی دبے پاؤں اس کے پیچھے لگ گیا۔ گیلری کی دائیں جانب ایک اور زینہ نیچے محل کے باغ میں اترتا تھا۔ عورت اس باغ میں سے گذرتی جہاں باغ ختم ہوتا تھا وہاں پہنچ کر رکی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اندھیرا تھا۔ میں ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ شاید اسے شبہ ہو گیا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو سامنے والے درختوں کے سیاہ جھنڈ میں جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے پیچھے چلا۔ یہ دس بارہ بڑے پرانے درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس کے درمیان میں ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا۔ ٹیلے کے سامنے کی طرف لوہے کا چھوٹا سا دروازہ تھا جس کے باہر دو آدمی پہرہ دے رہے تھے۔ ان کے پاس تھری ناٹ تھری کی رائفلیں تھیں۔ ان میں سے ایک سٹول پر بیٹھا تھا اور دوسرا ٹہل کر پہرہ دے رہا تھا۔ عورت کو دیکھ کر وہ بھی رک گیا اور فرانسیسی زبان میں بولا۔ ''ماریا! آج تم نے کچھ دیر نہیں کر دی؟'' اس عورت کا نام ماریا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ ''ہاں آج کچھ دیر ہو گئی۔'' دوسرے سپاہی نے دروازہ کھول دیا۔ ماریا سوپ لے کر زینہ اتر گئی جو کسی تہہ خانے کو جاتا تھا۔ ناصرہ یقیناً اس تہہ خانے میں قید تھی۔ میں وہیں چھپا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ماریا باہر نکلی تو میں باغ میں سے گذر کر گیلری کی دیوار کے پاس آ کر چھپ گیا۔ ماریا درختوں کے جھنڈ سے گذرتی باغ میں آ گئی تھی۔ اب اس کے ہاتھ میں سوپ کا ڈول نہیں تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گذرنے لگی تو میں بہت بڑا خطرہ مول لیتے ہوئے اچانک اس کے سامنے آ گیا اور فرانسیسی زبان میں اسے کہا۔

''ماریا بہن! میں اس الجزائری لڑکی کا بھائی ہوں جس کو تم ابھی سوپ دے کر آئی ہو''

ماریا کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

☆......☆......☆

اگر میں ماریا کے منہ پر ہاتھ نہ رکھتا تو واقعی دہشت کے مارے اس کی چیخ نکل جاتی اور کچھ فاصلے پر موجود قید خانے کے گارڈز ہوشیار ہو جاتے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس فرانسیسی خاتون کو الجزائری حریت پسند مسلمانوں سے ہمدردی ہے اور وہ ناصرہ پر تہہ خانے میں ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف اندھیرے میں لے گیا۔ ماریا نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔ ''تم ناصرہ کے بھائی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ تم فرانسیسی بولتے ہو۔'' ''سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟ ورنہ میں ابھی شور مچا کر تمہیں گارڈز کے حوالے کر دوں گی۔'' میں نے جلدی جلدی ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں ساری کہانی بیان کر دی۔ ماریا میری باتوں سے بڑی متاثر ہوئی۔ کہنے لگی۔ ''تم نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ثابت کر دیا ہے کہ تم حریت پسندوں کے سچے دوست ہو۔ میں تمہاری ضرور مدد کروں گی۔ مجھے بھی ان بہادر مسلمان حریت پسندوں سے بڑی عقیدت ہے جو فرانس جیسی طاقت کے جبر کے خلاف بے سروسامانی کی حالت میں جنگ کر رہے ہیں۔ ابھی میں تم سے زیادہ گفتگو نہیں کر سکتی۔ اس چار دیواری کے جنوب میں ایک غیر آباد پارک ہے۔ تم وہاں جا کر چھپ جاؤ۔ میں خود تم سے وہاں ملوں گی۔ مگر یاد رہے۔ وہاں سے باہر ہرگز مت نکلنا۔''

یہ کہہ کر ماریا گیلری میں اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔

غیر آباد ویران پارک کا مجھے پتہ تھا۔ میں وہاں آ کر ایک جگہ دیوار کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے ماریا کے تعاون پر پورا بھروسہ تھا۔ نیند انسان کی ایسی دوست ہے کہ آپ اسے نہ بھی بلائیں، وہ جب بھی آپ کے اعصاب کو سکون پہنچانے آ موجود ہو گی۔ چنانچہ مجھے بھی نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو دن کی روشنی پارک کے باہر کاؤنٹ کے قلعے کے سرسبز و شاداب احاطے کے درختوں اور اندلسی طرز کی بنی ہوئی سفید بارہ دریوں میں پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے حواس کو پوری طرح بیدار کیا۔ گرم جیکٹ مجھے بہت حد تک سردی سے بچا رہی تھی۔ میں پارک کے اندر ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے پاس فرش پر بیٹھا کاؤنٹ کے محل کو جاتی روش کو تک رہا تھا۔ بائیں جانب گیلری تھی جس کے ستونوں پر کوئی پھول دار بیل چڑھی ہوئی تھی۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ میں نے ایک درمیانے قد کی عورت کو ہاتھ میں ٹوکری تھامے پارک کی طرف آتے دیکھا۔ یہ ماریا ہی ہو سکتی تھی۔ رات کے اندھیرے میں میں اسکی شکل اچھی طرح سے نہ دیکھ سکا تھا۔ لیکن صرف وہی جانتی تھی کہ میں ویران پارک میں چھپا ہوا ہوں۔ وہ دوسری طرف کے پارک میں داخل ہوئی تھی۔ غیر ارادی طور پر پستول پر میرے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ کیونکہ یہ کوئی دشمن عورت بھی ہو سکتی تھی۔ مگر وہ ماریا ہی تھی۔ جب اس نے مجھے آہستہ سے آواز دی تو میں نے اس کی آواز پہچان لی۔ وہ میرے لئے کچھ کھانے پینے کو لائی تھی۔ وہ دیوار کی اوٹ میں ہو کر میرے قریب بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ ''تم ناصرہ کو یہاں سے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکو گے۔ مجھے اسکا افسوس ہے۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''مگر میں تو اسے اپنے ساتھ لے کر جانے کا عہد کر کے آیا ہوں ماریا بہن!'' ماریا بولی۔ ''تم ایسا اس لئے نہیں کر سکو گے کہ کل شام ناصرہ کو کاؤنٹ کے حکم سے موت کی سزا دے دی جائے گی۔'' میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماریا؟ میں نے افسوس بھرے لہجے سے کہا۔

''رات تم سے یہ بات کرنے کا موقع نہیں تھا۔ کاؤنٹ نے کل ہی یہ حکم جاری کر دیا تھا۔ کل شام سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی اسی تہہ خانے میں جلاد اسکی گردن قلم کر دے گا۔''

میں نے ماریا کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ "ماریا بہن! تمہیں حریت پسندوں کے کاز سے پوری ہمدردی ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ یہ لوگ غیر ملکی سامراج سے اپنے وطن کو آزاد کرانا چاہتے ہیں اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ پھر تم ناصرہ کی موت کو کیسے گوارا کر لو گی؟" ماریا نے ناامیدی کے لہجے میں کہا۔ "مگر میں کیا کر سکتی ہوں؟" میں نے کہا۔ "تم اگر تھوڑی سی کوشش کرو تو اس معصوم لڑکی کی جان بچا سکتی ہو۔" ماریا جیسے سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے اپنی نیلی نیلی چمکدار آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ "ہمارے پاس ناصرہ کی جان بچانے کے لئے صرف آج کا دن اور رات ہے۔ میں صرف اتنا کر سکتی ہوں کہ تمہیں تہہ خانے میں جانے کا ایک خفیہ راستہ بتا دوں۔ آگے سب کچھ تمہیں خود ہی کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "فرض کر لیا میں ناصرہ کو تہہ خانے سے نکال لایا تو مجھے یہاں کچھ دیر اسے چھپائے رکھنے کے لئے کسی جگہ کی ضرورت ہوگی۔" ماریا بولی۔ "اگر تم نے ایسا کر لیا تو پھر ناصرہ کو لے کر اسی پارک میں آ جانا۔" میں تمہیں یہاں سے ایک محفوظ جگہ پر لے جاؤں گی۔" میں نے کہا۔ میرے پاس ایک ریوالور ضرور ہے لیکن اس کے فائر سے دھماکہ پیدا ہوگا اور دوسرے پہرے دار ہوشیار ہو جائیں گے۔ کیا تم مجھے کہیں سے کوئی خنجر لا کر دے سکتی ہو؟" ماریا نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "خنجر تمہیں دھوکا دے سکتا ہے۔ میں تمہیں ایسا پستول لا کر دے سکتی ہوں جس کی نالی کے آگے سائی لنسر لگا ہوا ہے۔ اس کا فائر کرو تو دھماکہ نہیں ہوتا۔" میں بڑا خوش ہوا۔ ایسے حالات میں یہ پستول بے حد کام دے سکتا تھا۔ ماریا چلی گئی۔ میں وہیں پارک میں چھپا رہا۔ دوپہر کے بعد وہ دوبارہ آئی تو ایک رومال میں میرے لئے سینڈوچز اور پانی کی بوتل لائی تھی۔ میں نے پستول کا پوچھا تو اس نے اپنے لمبے گرم کوٹ کی جیب میں سے ایک پستول نکال کر مجھے دیا جس کے آگے سائی لنسر لگا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔ یہ بھرا ہوا ہے۔ چلانے سے پہلے صرف اسکا سیفٹی کیچ ہٹانا پڑے گا۔ اس میں چھ گولیاں ہیں۔" میں نے پستول کے میگزین کو چیک کیا۔ فرانس کا بنا ہوا پستول تھا۔ میں نے اسے جیب میں چھپا کر رکھ لیا اور ماریا سے تہہ خانے کے خفیہ راستے کے بارے میں پوچھا۔ وہ کہنے لگی۔

"جب رات گہری ہو جائے گی تو میں آؤں گی۔ پھر تمہیں اپنے ساتھ اس جگہ لے چلوں گی جہاں سے ایک چھوٹی سی سرنگ تہہ خانے کے اندر جاتی ہے۔ اس دوران میں آج شام تہہ خانے میں ناصرہ کو کسی نہ کسی بہانے وہاں جا کر سارے حالات سے باخبر کر دوں گی تاکہ وہ ہوشیار رہے۔ اب میں چلتی ہوں۔ میرا خاوند بڑا ظالم ہے۔ اس کو ذرا سی بھنک بھی پڑ گئی تو مجھے جان سے مار دے گا۔"

ماریا چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور پستول کا جائزہ لینے لگا۔



رات ہوئی تو آسمان پر بادل چھا گئے اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اس کی وجہ سے سردی بھی بڑھ گئی۔ ماریا مجھے اپنی گرم اونی ٹوپی اور گلوبند دے گئی تھی جس نے مجھے سردی سے بچائے رکھا۔ کاؤنٹ کے محل میں روشنی ہو رہی تھی۔ اور کبھی کبھی کوئی گاڑی محل میں داخل ہوتی یا باہر کی طرف نکل جاتی تھی۔ یہ اسقدر پراسرار محل تھا کہ بہت کم کوئی آواز سنائی دیتی تھی۔ میرے مشن کے لئے یہ بات بڑی مفید تھی۔ میں دل میں دعا مانگنے لگا کہ بارش زیادہ زور سے نہ ہو۔ شدید بارش میں ہمارا مشن ناکام ہو سکتا تھا۔ اور ہمارے مشن کی ناکامی کا مطلب ناصرہ کی موت تھی۔ مگر خدا کا شکر رہا کہ بارش بوندا باندی سے آگے نہ بڑھی۔ میں بے چینی سے ماریا کا انتظار کر رہا تھا۔ کئی بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا۔ جب گھڑی نے رات کے سوا بارہ بجائے تو مجھے تاریکی میں ایک انسانی سایہ پارک کی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ ماریا تھی۔ وہ میرے لئے ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے اور چھوٹی سی تھرمس میں گرم کافی لائی تھی۔ مجھے سردی بھی لگ رہی تھی اور بھوک بھی ____ ڈبل روٹی اور گرم کافی نے مجھے تازہ دم کر دیا۔ ماریا نے ہڈ والی برساتی پہن رکھی تھی۔ کہنے لگی۔ "اب میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میرے اور اپنے درمیان کم از کم پانچ قدموں کا فاصلہ رکھنا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ ہم پارک سے نکلے تو ماریا بائیں ہاتھ کو نیچے ایک ڈھلان اتر گئی۔ آگے

درخت ہی درخت تھے۔ یہاں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے ماریا کا ایک سایہ سا ہی آگے جاتا نظر آ رہا تھا۔ خدا جانے کہاں کہاں سے گزر کر وہ ایک جگہ اونچے ٹیلے کے نشیب میں جھاڑیوں کے پاس جا کر رک گئی۔ میں اس کے قریب آیا تو وہ بیٹھ گئی اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے بھی بیٹھ جانے کو کہا۔ میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ جھاڑیوں کو ادھر اُدھر ہٹانے لگی۔ جھاڑیوں کے پیچھے ایک سرنگ کا منہ نکل آیا جس کے اندر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ماریا نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ سرنگ ناصرہ کے تہہ خانے میں جاتی ہے۔ میں نے ناصرہ کو خبردار کر دیا ہے۔ اگر تم اسے اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو گئے تو سیدھا پارک میں آ جانا۔ وہاں سے میں تمہیں ایک محفوظ پناہ گاہ میں لے چلوں گی۔ مگر زیادہ دیر نہ کرنا۔ اگرچہ میں نے اپنے ظالم خاوند کو نیند کی گولیاں کھلا دی تھیں مگر اسکا کوئی اعتبار نہیں۔ گھبرانا نہیں۔ سرنگ زیادہ لمبی نہیں ہے۔ دروازے پر تین بار ٹھک ٹھک کرنا۔ ناصرہ سمجھ جائے گی۔"

ماریا فوراً وہاں سے اٹھی اور اندھیرے میں جدھر سے آئی تھی ادھر کو غائب ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں اللہ کا نام لے کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔ لگتا تھا کہ ایک مدت سے اس سرنگ میں انسان تو کیا کوئی جانور بھی داخل نہیں ہوا تھا۔ چھت میرے سر سے بمشکل دو چار انچ بلند تھی اور جگہ جگہ جالے لٹک رہے تھے۔ میں دونوں ہاتھوں سے جالوں کو ہٹاتا قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ سرنگ کی فضا حبس کی وجہ سے بوجھل تھی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اندازے سے قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ سرنگ میں ڈھلان آ گئی۔ تھوڑی دور تک نشیب میں اترنے کے بعد سرنگ بائیں جانب خم کھا گئی۔ یہاں موڑ مڑتے ہی میں ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔ ٹٹول کر دیکھا تو یہ دیوار نہیں بلکہ ایک دروازہ تھا جس کو لوہے کے راڈ سے بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے بے حد احتیاط کے ساتھ کافی زور لگا کر لوہے کے راڈ کو اٹھا دیا اور دروازے پر تین بار دستک دی اور پھر

دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی قید خانے میں جلتی لالٹین کی روشنی مجھ پر پڑی۔ میرے سامنے ناصرہ کھڑی تھی۔ وہ خستہ حال جرسی اور پتلون میں ملبوس تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے بولنے سے منع کیا۔ ایک نظر قید خانے کے بند دروازے اور اس کی سلاخ دار چھوٹی سی کھڑکی پر ڈالی اور جلدی سے سرنگ میں اتر آئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے درواز بند کر کے لوہے کا راڈ دوبارہ لگا دیا۔ میں نے ناصرہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اندھیرے میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ سرنگ سے باہر نکلے تو رات سرد اور تاریک تھی۔ بوندا باندی اسی طرح ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا گلوبند ناصرہ کو اوڑھا دیا اور کہا۔ "سب ٹھیک ہے ناصرہ۔ خدا ہماری مدد کر رہا ہے۔" اور میں تاریکی میں اس بارک کی طرف بڑھا جہاں ماریا ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ ماریا ہمیں دیکھ کر بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔ "یہ بڑی اچھی بات ہوئی کہ تم ناصرہ کو موت کے منہ سے نکال لائے ہو۔ پستول چلانے کی ضرورت تو نہیں پڑی؟" میں نے اسے بتایا کہ میرے ہاتھ سے کسی کا خون نہیں ہوا۔ ماریا بولی۔ "یہ بھی بڑی اچھی بات ہوئی ہے۔ اب میرے ساتھ آؤ۔" ناصرہ نے پوچھا۔ "ہم کہاں جائیں گے ماریا؟ کیا ہم سمندر پار کر سکیں گے؟" ماریا نے ناصرہ کو خاموش رہنے کی ہدایت کی اور ہمیں لے کر ایک ایسے گنجان درختوں والے جھنڈ کی طرف چل پڑی جہاں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہم اس جھنڈ سے نکلے تو سامنے سمندر آ گیا۔ یہاں ایک طرف سمندر کے کنارے ایک چھوٹا سٹیمر دھندلا دھندلا سا نظر آیا جو آدھا ریت پر چڑھ آیا ہوا تھا۔ ماریا نے ہمیں بتایا کہ یہ ٹوٹا پھوٹا پرانا سٹیمر ہے جو ایک سمندری طوفان میں ساحل پر چڑھ آیا تھا اور اسے اس جگہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ سٹیمر کے اندر ایک چھوٹا سا کیبن تھا۔ ماریا نے جیب سے موم بتی نکال کر روشن کی تو میں نے دیکھا کہ کیبن کی لکڑی کی دیواریں اور فرش جگہ جگہ سے ٹوٹ چکا تھا۔ کونے میں پٹ سن کی خالی بوریوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ ماریا نے کہا۔ اس طرف کبھی کوئی نہیں آتا۔ کسی کو شک بھی نہیں پڑے گا کہ تم لوگ یہاں چھپے ہوئے ہو۔ ناصرہ نے جواب میں پوچھا۔ لیکن ہمیں یہاں کب تک رہنا ہوگا ماریا

بہن؟" ماریا کہنے لگی۔ "اس سوال کا جواب میں تمہیں کل صبح آ کر دوں گی۔ اس بارے میں مجھے بھی بہت کچھ سوچنا ہوگا۔ آگے وسیع و عریض سمندر ہے۔ یہاں سے نکلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بہر حال تم لوگ دن کے وقت بھی کیبن کے اندر ہی رہنا۔" ماریا کے جانے کے بعد میں نے ناصرہ سے کہا کہ وہ خالی بوریوں میں گھس کر سو جائے۔ میں پہرہ دوں گا۔ ناصرہ نے ایسا ہی کیا۔ میں نے سائلینسر والا پستول ہاتھ میں لیا اور کیبن سے نکل کر ڈیک پر آ کر دیکھنے لگا۔ ایک طرف جزیرے کا گھنا تاریک جنگل تھا اور دوسری طرف حد نظر تک کالا سیاہ سمندر بوندا باندی میں پھیلتا چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

میں اس تباہ شدہ سٹیمر کے ڈیک پر بیٹھا ساری رات پہرہ دیتا رہا۔ اس دوران ناصرہ سوئی رہی۔ اس دلیر الجزائری لڑکی نے بڑے کشٹ اٹھائے تھے میں اسے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانا چاہتا تھا۔ فرانس کے اس دور افتادہ جزیرے کی رات بڑی سرد تھی۔ بوندا باندی رات بھر ہوتی رہی۔ دن نکلا تو جزیرے کے درختوں پر اور دور تک پھیلے ہوئے سمندر پر دھندلی دھندلی روشنی پھیل گئی۔ میری آنکھیں درختوں کے نیچے جمی تھیں جہاں سے ایک پگ ڈنڈی کاؤنٹ کے محل کی طرف جاتی تھی۔ مجھے ماریا کا انتظار تھا۔ اسی نے ناصرہ کو کاؤنٹ کی قید سے نکلوانے میں میری مدد کی تھی اور اب بھی اسی کی مدد سے ہمیں اس خونی جزیرے سے نجات حاصل کرنی تھی۔ میں اس خطرناک حقیقت سے بھی آگاہ تھا کہ آج کا دن کاؤنٹ نے ناصرہ کی موت کا دن مقرر کر رکھا تھا۔ یعنی آج کی رات اسے پھانسی دی جانے والی تھی۔ ظاہر ہے صبح ہونے تک جیل کے محافظوں کو ناصرہ کے فرار کا علم ہو گیا ہو گا اور اب وہ سارے جزیرے میں اس کی تلاش کے واسطے نکل کھڑے ہوں گے۔ وہ لوگ جزیرے کی ناکہ بندی بھی کر لیں گے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہاں سے ہم کیسے نکل پائیں گے۔ ماریا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کاؤنٹ کے سپاہی اگر اس طرف آ گئے تو وہ اس سٹیمر کی ضرور تلاشی لیں گے

جہاں میں اور ناصرہ چھپے ہوئے تھے۔ مجھے کیبن میں آہٹ سنائی دی۔ میں تیزی سے نیچے آ گیا۔ ناصرہ جاگ پڑی تھی اور سٹیمر کے ایک چھوٹے سے دروازے کو زور لگا کر کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کہنے لگی۔ ''میں دیکھنا چاہتی تھی اس کے اندر کیا ہے۔''

میں نے اسے بتایا کہ سٹیمر ایک مدت سے خالی پڑا ہے۔ ''وہ کیبن کی ٹوٹی ہوئی برتھ پر بیٹھ گئی اور ماریا کا پوچھنے لگی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ ابھی تک نہیں آئی۔ ناصرہ نے بھی اس اندیشے کا اظہار کیا کہ تہہ خانے کے محافظوں کو میرے فرار کا علم ہو گیا ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اسے تلاش کرتے ہوئے اس سٹیمر پر بھی آ جائیں۔ ''ہمیں یہاں سے نکل کر کسی دوسری جگہ چھپ جانا چاہیے۔'' میں خود اس بارے میں یہی سوچ رہا تھا۔ ہم نے آپس میں صلاح مشورے کے بعد فوری طور پر فیصلہ کیا کہ ہم سٹیمر سے نکل کر وہاں چلے جاتے ہیں جہاں درختوں کے بے شمار جھنڈ اور ٹیلے ہیں۔ وہاں ہمیں کوئی نہ کوئی چھپنے کی جگہ مل جائے گی۔ ابھی ہم نے اپنے اس فیصلے پر عمل نہیں کیا تھا کہ اوپر سٹیمر کے تختے پر کسی نے جیسے دستک دی۔ میں نے پستول تھام لیا اور دبے پاؤں ٹوٹے ہوئے زینے پر سے ہو کر اوپر گیا تو سامنے ماریا کھڑی تھی۔

''جلدی سے میرے پیچھے آؤ'' اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

میں نے ناصرہ کو آواز دی۔ وہ بھی اوپر آ گئی اور ہم دونوں ماریا کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ ماریا سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ہمارے اور سمندر کے درمیان ریت کا وسیع و عریض کنارہ تھا جس کے درمیان تک سمندر کی لہریں آ کر واپس چلی جاتی تھیں۔ ان لہروں کا ہلکا ہلکا شور اٹھ رہا تھا۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ چلتے چلتے ہم جزیرے کا ایک موڑ گھومے تو آگے چھوٹی بڑی بھوری چٹانوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ ماریا ہمیں لے کر ان بھوری چٹانوں میں آ گئی۔ ان چٹانوں پر کہیں کہیں سبز کائی جمی ہوئی تھی۔ چٹانوں کے درمیان بھی کہیں کہیں سمندر کا پانی چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں جمع ہو گیا ہوا تھا۔

ہم دو چٹانوں کے درمیان سے ہو کر نکلے تو بائیں جانب سمندری گھاس کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ اس کے پیچھے چٹان کے اندر بنے ہوئے ایک قدرتی غار کا دروازہ تھا۔ دروازہ کیا تھا کوئی چار فٹ اونچا سوراخ تھا جہاں سے ہمیں جھک کر داخل ہونا پڑا۔ اس غار میں ہلکی ہلکی گرماہٹ تھی جو اس شدید سرد مرطوب موسم میں ہمیں بہت ہی اچھی لگی۔ مجھے تو یوں محسوس ہو جیسے کسی نے آہستہ سے میرے کاندھوں پر کمبل ڈال دیا ہو۔

قصہ مختصر یوں کہ ماریا نے ہمیں ایک بار پھر اس غار میں چھپا دیا اور کہا۔ "ناصرہ کے فرار کا سب کو پتہ چل گیا ہے۔ کاؤنٹ غصے سے پاگل ہو رہا ہے۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دے دیا ہے کہ مفرور عورت کو جہاں بھی ہو تلاش کرو اور اسے زندہ یا مردہ پیش کرو۔"

ناصرہ نے کہا۔ "میں سمندر میں تیر کر بھی یہاں سے فرار ہو سکتی ہوں۔ مجھے سمندر میں تیرنا آتا ہے۔ میں اب ان سامراجیوں کے ہتھے نہیں چڑھوں گی۔" ماریا نے بتایا کہ اس سمندر میں بڑی خونخوار شارکیں ہر وقت گھومتی رہتی ہیں۔ ویسے بھی سمندر بہت وسیع ہے۔ میں نے ماریا سے پوچھا کہ اس نے کیا منصوبہ بنایا ہے۔ ماریہ نے بڑی معنی خیز نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا اور بولی۔ "تمہارے ساتھ میں بھی اس شیطانی جزیرے سے نکلنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے اب اپنے ظالم اور جابر خاوند کا مزید ظلم برداشت نہیں ہوتا۔ میں مارسیلز میں جا کر اپنی نئی زندگی شروع کرنی چاہتی ہوں۔ میں نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ ہم یہاں سے ایک ہیلی کاپٹر اغوا کر کے بھاگیں گے۔" میں اور ناصرہ ماریا کے اپنی زندگی کے بارے میں نئے انکشاف پر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ کیونکہ ماریا نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے فرار کی خوش خبری سنائی تھی۔

ناصرہ نے کہا۔ "مگر ہیلی کاپٹر کون چلائے گا؟" ماریا کہنے لگی۔ "میں چلاؤں گی۔ مجھے ہیلی کاپٹر چلانا آتا ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ مگر یہ ہیلی کاپٹر ایئرپورٹ کے جنوبی ہینگر میں رکھا ہوا

ہوتا ہے جہاں چاروں طرف ہر وقت پہرہ رہتا ہے۔ تم لوگوں کو اس سلسلے میں میری مدد کرنی ہوگی میں نے کہا۔ "ہم تو یہاں سے فرار کے لئے اپنی جان تک لڑا دینے کو تیار ہیں۔ تو پھر ٹھیک ہے۔ آج رات کو ہی تمہیں یہاں سے آ کر لے جاؤں گی۔ پھر اس نے وہ تھیلا ہمارے حوالے کر دیا جس میں وہ ہمارے لئے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لائی تھی۔ ایک بار پھر اس نے ہمیں غار سے باہر نہ نکلنے کی تاکید کی اور رات کے بارہ بجے آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

رات کافی گہری ہو گئی تھی جب ماریا غار میں نمودار ہوئی۔ میں اور ناصرہ جاگ رہے تھے۔ اس نے گرم جیکٹ اونی ٹوپی اور پتلون پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا بھی تھا۔ گویا وہ اپنی طرف سے جزیرے سے فرار کی پوری تیاری کر کے آئی تھی۔ ہم تو پہلے ہی وہاں تیار بیٹھے تھے۔ ہم غار سے نکلے اور ماریا کی راہ نمائی میں جزیرے کے واحد ائیرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا ائیرپورٹ تھا جہاں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ چونکہ کسی فلائیٹ کا وقت نہیں تھا اس لئے کنٹرول ٹاور میں صرف ایک بتی جل رہی تھی۔ ماریا ہمیں اندھیرے میں سے گزارتے ہوئے ایک اونچی چھت والے بہت بڑے ہینگر کے دروازے کے پاس لے آئی۔ یہاں کوئی پہرہ نہیں تھا۔ مگر ہینگر کے بہت بڑے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ ماریا نے اپنے تھیلے میں سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور ہم نے تالا کھولنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ ایک چابی لگ گئی اور تالا کھل گیا۔ ہینگر میں داخل ہوتے ہی ہم نے بڑے دروازے کو بند کر دیا۔ ہینگر کی چھت درمیان میں بڑے دائرے کی شکل میں کھلی ہوئی تھی۔ اس کے عین نیچے کالے رنگ کا ایک ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ ماریا نے سرگوشی میں کہا۔ "یہاں سے فرار کا ایک ہی آخری ذریعہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اسکی آواز سے گارڈز ہوشیار ہو جائیں گے۔ وہ دوسرے ہیلی کاپٹر یا کسی چھوٹے طیارے پر ہمارا پیچھا کر سکتے

ہیں۔" ماریا نے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت یہاں صرف ایک ہی چھوٹا طیارہ ہے جسے ہم بیکار کر دیں گے۔ یہاں دوسرا کوئی ہیلی کاپٹر بھی نہیں ہے۔ اس لئے ایک بار ہم فضا میں بلند ہو گئے تو پھر ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں، ناصرہ اور ماریا چھوٹے طیارے کے پاس آ گئے۔ ماریا دروازہ کھول کر اس کے کاک پٹ میں بیٹھ گئی اور سامنے لگے پرزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگی اس نے پلاس کی مدد سے کئی پرزوں کو توڑ ڈالا۔ طیارے کی سٹک کو بھی ایک طرف کو موڑ دیا۔ پھر طیارے سے باہر آ کر بولی۔ "اب یہ طیارہ اڑ نہیں سکتا۔ اس کی مرمت پر بھی دس بارہ گھنٹوں سے کم وقت نہیں لگے گا۔ اب ہمارا راستہ صاف ہے۔" ہم دروازہ کھول کر ہیلی کاپٹر میں بیٹھ گئے۔ ماریا ایک ماہر ہوا باز خاتون کی طرح سامنے لگے ڈائیل کے بٹن دبانے لگی۔ ڈائیل روشن ہو گیا۔ اس نے ایک بٹن دبایا تو انجن سٹارٹ ہو گیا اور ہیلی کاپٹر کے پر گردش کرنے لگے۔ ان کی آواز پیدا ہوئی۔ میری نگاہیں ہینگر کے دروازے پر لگی تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ کسی طرف سے گارڈز بیدار ہو کر وہاں دوڑتے ہوئے آ جائیں اور ہم پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ مگر ایسا نہ ہوا اور ہیلی کاپٹر آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر ہینگر کی چھت کے دائرے میں سے نکل کر کھلی فضا میں آ گیا تو ماریا نے ایک طرف سٹک کو جھکا دیا۔ ہیلی کاپٹر نے ہلکا سا جھول کھایا اور پھر تیزی سے اوپر ہی اوپر بلند ہوتا چلا گیا۔ میں اور ناصرہ نیچے دیکھ رہے تھے۔ نیچے کنٹرول ٹاور کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ اور ریڈیو سیٹ پر کسی نے چیخ کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟ اپنی شناخت بتاؤ۔" ماریا نے جواب دینے کے بجائے وائرلیس سیٹ بند کر دیا اور ہیلی کاپٹر کو سمندر کے اوپر لے آئی۔ اب ہم کافی نیچی اڑان بھرتے ہوئے سمندر کے اوپر جا رہے تھے۔ اچانک ہمیں فائرنگ کی آواز سنائی دیں۔ ماریا نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ وہ زمین سے فائر کر رہے ہیں۔ ہم ان کے فائر کی زد سے باہر نکل آئے ہیں۔ وہ ہمارے پیچھے نہیں آ سکتے۔" اور ایسا ہی ہوا۔ کیونکہ ہم ان کا اکلوتا طیارہ ہینگر کے اندر ہی تباہ کر آئے تھے۔ بہت جلد فائرنگ کی آواز پیچھے رہ گئی اور ہم تیزی سے کنارے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ماریا ہیلی کاپٹر کو کافی بلندی پر لے آئی تھی۔ نیچے

اندھیرے میں سمندر کالا سیاہ نظر آ رہا تھا۔اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ناصرہ نے پوچھا۔

''کیا ہم مارسلز کی طرف جا رہے ہیں ماریا؟'' ماریا نے جواب دیا

''پہلے میرا بھی یہی خیال تھا مگر اب میں ادھر نہیں جا رہی۔ کیونکہ مارسلز میں کاؤنٹ کے آدمی ہمیں پکڑ سکتے ہیں؟

''تو پھر ہم کس طرف جا رہے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔ماریا نے ہیلی کاپٹر کے اندر کی بتی بجھا رکھی تھی۔میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ مجھے اس کی آواز سنائی دی۔وہ اونچی آواز میں کہہ رہی تھی۔''میں تمہیں الجزائر کے ساحل تک پہنچا کر واپس جاؤں گی۔'' یہ میرے اور ناصرہ کے لئے ایک بہت بڑی خوش خبری تھی۔ماریا نے ہماری خاطر کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھی اور اس حقیقت سے باخبر تھی کہ فرانس نے الجزائر پر غیر قانونی طور پر قبضہ جما رکھا ہے اور الجزائر کے مسلمان عوام بجا طور پر اپنے حق خود ارادیت کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔وہ الجزائری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے حق میں تھی۔ جس طرح کہ اس زمانے میں فرانس کا سب سے بڑا افسانہ نگار اور فلسفی ژاں پال سارتر بھی الجزائری مسلمانوں کی حمایت میں مضامین لکھتا رہا تھا۔

ہمارا ہیلی کاپٹر کوئی ایک گھنٹے تک رات کے اندھیرے میں سمندر کے اوپر پرواز کرتا رہا۔ پھر دور سے ساحل پر کہیں کہیں جھلملاتی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ماریا نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔''مبارک ہو۔الجزائر کا ساحل سامنے نظر آنے لگا ہے۔''

ماریا اس علاقے سے کافی واقفیت رکھتی تھی۔وہ اپنے خاوند کے ساتھ اکثر یہاں آتی رہتی تھی۔ ہمارا ہیلی کاپٹر سمندر پار کر کے چھوٹے چھوٹے صحرائی ٹیلوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ ستاروں کی روشنی میں یہ ٹیلے دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ناصرہ نے کہا کہ وہ اس کے شہر کی طرف جانے کی کوشش کرے۔جس پر ماریا کہنے لگی۔وہ یہاں سے کافی دور ہے۔ میں تمہیں تلمسان کے شہر کے باہر پہنچا دوں گی۔وہاں سے تم اپنے شہر جا سکتی ہو۔''

رات کے پچھلے پہر ہیلی کاپٹر تلمسان شہر کے باہر ایک ٹیلے کے پیچھے اتر گیا۔الجزائر کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میں نے اور ناصرہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ماریا نے ہم سے باری باری ہاتھ ملایا۔ہمیں ہمارے خرچ کے لئے کچھ نقدی دی اور کہا۔

''میں تمہارے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔ مجھے بھی اپنے گھر پہنچنا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے ہاتھ لہرا کر خدا حافظ کہا اور ہیلی کاپٹر کو فضا میں بلند کر کے سمندر کی طرف نکل گئی۔ناصرہ نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔''اپنے وطن کی فضا کتنی خوشگوار لگتی ہے۔اگرچہ ابھی ہمارا وطن آزاد نہیں ہے۔لیکن ہم بہت جلد اس کی زنجیریں کاٹ دیں گے۔'' میں نے ناصرہ سے مشورہ کیا کہ ہمارا تلمسان جانا مناسب رہے گا یا اس جگہ کہیں باقی کی رات بسر کر لی جائے اور دن کی روشنی میں وہاں سے کسی دوسری طرف نکل جائیں۔ناصرہ نے کہا۔

''تلمسان ہمارا شہر ہے۔الجزائری مسلمانوں کا شہر ہے۔ہمیں وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔یہاں میری ایک سہیلی کا گھر بھی ہے۔ہم آج کا دن اسی شہر میں گزاریں گے''

اور ہم ڈھلتی صحرائی رات کے دھندلکے میں ٹیلے سے نکل کر شہر کی طرف چل پڑے۔

☆......☆......☆

تلمسان الجزائر کا ایک بڑا شہر ہے اور مراکش کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ جس وقت ہم شہر کے مغربی دروازے سے داخل ہوئے تو پرانے اندلسی طرز کے محرابی دروازوں والے بازاروں میں کہیں کہیں عربی لباس پہنے لوگ ابھی تک چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ناصرہ نے کہا۔

"یہ اس شہر کی روایت ہے۔ یہاں کے بازاروں میں رات بھر رونق رہتی ہے اور قہوہ خانوں میں اندلسی موسیقی گونجتی رہتی ہے۔" چنانچہ جب ہم ایک قہوہ خانے کے سامنے سے گزرے تو ہمیں ہسپانوی میوزک کی تیز دھن سنائی دی۔ ناصرہ ایک ایسے بازار میں آ گئی جس کا آدھا حصہ چھت سے ڈھکا ہوا تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ ایک تنگ سی گلی میں وہ ایک مکان کے پرانے محرابی دروازے پر آ کر رک گئی۔ اس نے دروازے پر لگا ہوا بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر بعد کسی مرد کی نیند بھری آواز آئی۔

"کون ہے؟"

ناصرہ نے اپنی سہیلی کا نام لے کر کہا کہ میں لیلیٰ کی سہیلی ہوں ناصرہ ــــ اسی وقت دروازہ کھول دیا گیا۔ ایک بزرگ صورت آدمی لمبا فرغل پہنے سامنے تھا۔ اس نے ناصرہ کو پہچان لیا تھا۔ وہ عربی زبان میں اس کی خیریت پوچھتا ہمیں ایک صحن سے گزار کر ایک کمرے میں لے گیا۔ تھ[illegible] کی سہیلی لیلیٰ بھی آ گئی۔ دونوں سہیلیاں ایک دوسری سے مل کر بہت خوش

ہوئیں۔ ناصرہ نے مختصراً میرا تعارف کروایا۔ لیلیٰ کہنے لگی۔ "تم لوگ تھکے ہوئے ہو۔ اس وقت تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" لیلیٰ اپنی سہیلی کے ساتھ چلی گئی اور میرے لئے اس کمرے میں قالین پر بستر لگا دیا گیا۔

تلمسان الجزائر کا ایک تاریخی شہر ہے۔ سلطنت روما کے زمانے میں اسکا نام پوماریہ تھا۔ بعد میں مولائی ادریس نے رومی کھنڈروں پر یہاں اجادیر کے نام سے ایک نئے اسلامی شہر کی بنیاد رکھی۔ تلمسان بربری زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چشمے کے ہیں۔ یہ شہر قدیم زمانے ہی سے مختلف قافلوں کی گزرگاہ رہا ہے۔ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں جب ہسپانیہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا تو اس وقت مسلمان مہاجرین کی بہت بڑی تعداد اندلس سے نقل وطن کر کے اس شہر میں آ کر آباد ہو گئی۔ مشہور ترک مسلمان امیر البحر خیر الدین باربروس کا بحری بیڑہ ان مسلمان مہاجرین کو ہسپانیہ سے الجزائر منتقل کرتا رہا۔ انہی لوگوں کی وجہ سے یہاں اندلس کی عربی تہذیب آج بھی جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔ گھروں میں قیمتی قالین فرش پر بچھے ہوئے، کھڑکیوں پر خوبصورت ریشمی پردے، گرم سماوار اور قہوے کی نازک پیالیاں، فضا میں بلند ہوتی اندلسی موسیقی، خوشبودار پھول اور سیاہ گلاب ــــ یہ شہر اندلسی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی ہو بہو تصویر ہے ــــ تلمسان کی خواتین پردے کی پابند ہیں۔ وہ اپنا چہرہ چادر سے چھپائے رکھتی ہیں جس میں سے صرف آنکھیں ہی دکھائی دیتی ہیں۔ تاہم دوسرے مشرقی ملکوں کی طرح یہاں بھی مغربی تہذیب کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ تلمسان کے آس پاس بہت سے آثار قدیمہ ہیں۔ اس شہر کی پہاڑیاں صنوبر کے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی ہیں اور ان پہاڑیوں کے قدرتی غار بڑے مشہور ہیں۔ تلمسان میں اسلامی عہد کے آثار قدیمہ اتنی کثرت سے ہیں کہ مورخین اسے افریقہ کا غرناطہ کہتے ہیں۔ ان میں مشوار کا قلعہ بہت مشہور ہے۔ جس کی بنیاد پانچ سو پچاس ہجری میں رکھی گئی تھی۔ اسی شہر میں ساڑھے چھ سو سال پرانا ایک تالاب بھی ہے جسے اسلامی تاریخ کے

عظیم فاتح یوسف بن تاشفین نے بنوایا تھا۔ اس زمانے میں اس تالاب کے پانی سے شہر کے باغات کو سیراب کیا جاتا تھا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ تالاب خشک ہوتا چلا گیا اور آج کل یہاں فٹ بال کھیلنے کا میدان ہے۔ شہر کی ایک جانب چالیس پرانے مقبرے ہیں۔ مسجد کبیر یہاں کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ جس کے اندر جو فانوس لگا ہے اس کے قمقموں کی تعداد تین سو پینسٹھ ہے سال کے دنوں کے برابر۔ یہ عالی شان مسجد پانچویں صدی ہجری میں تعمیر ہوئی تھی۔ ایک دوسری اہم مسجد جامع سیدی بومدین ہے۔ یہ مسجد جامع قرطبہ کی طرز پر بنائی گئی ہے۔ اس کی گل کاری اور نقش و نگار دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تلمسان کی خواتین گھریلو کام کاج بڑے شوق سے کرتی ہیں۔ جب کوئی بچی پندرہ سال کی ہو جاتی ہے تو وہ اپنے جہیز کے کپڑے خود تیار کرنا شروع کر دیتی ہے۔ تلمسان میں جب کوئی بچی پہلی بار رمضان کا روزہ رکھتی ہے تو پورا خاندان خوشی مناتا ہے اور بچی کو خوبصورت لباس پہنا کر رشتے داروں کے گھروں میں لے جایا جاتا ہے جہاں اسکا بڑے احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

تلمسان شہر کے بارے میں یہ ساری معلومات میں نے لیلیٰ کے گھر کی لائبریری میں رکھی ہوئی انگریزی کی ایک کتاب میں سے حاصل کی تھیں جو میں نے آپ کے واسطے یہاں بیان کر دی ہیں۔ اب تو یہ شہر فرانسیسی استعمار سے آزاد ہو چکا ہے اور ایک ترقی یافتہ اسلامی شہر ہے مگر جن دنوں میں ناصرہ کے ساتھ وہاں پہنچا تھا اس وقت یہ شہر فرانس کے قبضے میں تھا اور وہاں کے مسلمان اپنی آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ہر مسلمان آزادی کے جذبے سے سرشار تھا اور حریت پسندوں کے مجاہد تو اپنی اپنی جانوں کی قربانی دے رہے تھے۔

شہر میں فرانس کے جاسوس جگہ جگہ تعینات تھے جو حریت پسندوں کی موجودگی کی فوراً خبر کر دیتے تھے۔ پھر پولیس کے چھاپے پڑتے۔ گولیاں چلتیں۔ حریت پسند یا تو فرار ہو جاتے یا شہید ہو جاتے۔ بہت کم گرفتار ہوتے تھے۔ ناصرہ کو یہ بھی خطرہ تھا کہ اس کے شہر میں پہنچنے کی خبر

فرانس کے جاسوسوں کو نہ ہو گئی ہو۔ لیلیٰ اسے تسلی دیتی کہ فکر نہ کرو۔ ہمارے علاقے میں پولیس کا کوئی جاسوس داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہم وہاں سے نکل کر ناصرہ کے آبائی شہر کی طرف جانا چاہتے تھے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہماری وجہ سے لیلیٰ اور اس کے گھر والے کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔ چنانچہ ناصرہ کی ہدایت کے مطابق میں نے تلمسان میں حریت پسندوں سے رابطہ پیدا کیا۔ ان کا ایک آدمی مجھے شہر کے ایک اندلسی قہوہ خانے میں ملا۔ وہ ایک بلند قامت نیلی آنکھوں والا الجزائری مسلمان تھا جس نے مجھے اپنا نام ہاشم بتایا۔ ظاہر ہے یہ اسکا فرضی نام تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں ناصرہ کو ساتھ لے کر شہر کے مغربی قبرستان میں ابو اسحاق کے پرانے مقبرے میں پہنچ جاؤں۔ وہاں سے وہ ہمیں اونٹوں کے ایک خاص قافلے کے ساتھ ناصرہ کے گاؤں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ میں ناصرہ کو دشمن کی قید سے نکال کر لے آیا تھا۔ ایک طرح سے میرا مشن یہاں ختم ہو گیا تھا۔ میں نے ناصرہ سے کہا کہ میں یہاں سے طرابلس کے شہر کی طرف نکل جانا چاہتا ہوں۔ تاکہ لیبیا ملک کی سیاحت کے بعد مصر کی سیاحت کو چلا جاؤں۔ میں ان سارے قدیم اسلامی تہذیب کے علم بردار ممالک کی سیر و سیاحت کرنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی جنگ ختم ہو چکی تھی اور میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ناصرہ نے مجھے خوشی سے اجازت دے دی۔ چنانچہ اسی رات میں نے ناصرہ کو حریت پسندوں کے محفوظ ہاتھوں میں دیا اور خود اس سے اجازت لے کر واپس لیلیٰ کے گھر میں آ گیا جہاں سے مجھے تیونس سے ہوتے ہوئے لیبیا کی بندرگاہ طرابلس پہنچنا تھا۔ میں نے تلمسان کے شہر میں کچھ روز رہ کر اس قدیم اسلامی ملک کی سیر کی اور پھر ایک دن صبح کے وقت عنابہ کی بندرگاہ سے ایک جہاز میں سوار ہو کر تیونس اور وہاں سے ایک دوسرے بحری جہاز میں بیٹھ کر بحیرہ روم کے نیلے پانیوں میں سفر کرتا طرابلس کی بندرگاہ پر جا اترا۔

اس شہر سے مجھے اس لئے بھی عقیدت تھی کہ ۱۹۱۲ء میں یہاں ایک مسلمان عرب لڑکی فاطمہ بنت عبداللہ طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی شہید ہو گئی تھی جس کے بارے میں

علامہ اقبالؒ نے ایک بڑی پُر درد نظم لکھی تھی۔

فاطمہ ! تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مُشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حُورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

☆......☆......☆

طرابلس سے ایک سٹیمر میں سوار ہو کر میں لیبیا کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتا بن غازی پہنچ گیا۔ بن غازی میں بھی دوسری عالمی جنگ کی تباہی کے اثرات ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ میرا ارادہ سکندریہ سے ہوتے ہوئے۔ بیروت اور وہاں سے ترکیہ کی سیر و سیاحت کا تھا۔ یہ خیال بھی تھا کہ اسکندریہ اتر کر مصر کے قدیم اہرام بھی دیکھوں گا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ مصر میں ایسے رونگٹے کھڑے کر دینے والا حادثات و واقعات میرا انتظار کر رہے ہیں کہ جن کی یاد بھی مجھے حیرت زدہ کر دیا کرے گی۔ لیکن آنے والے واقعات کی تو کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ دنیا کا نظام تو ایسے ہی چل رہا ہے۔ غیب کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کو ہے۔

بہر حال میں اپنے پروگرام کے مطابق کچھ روز بن غازی میں قیام کے بعد اسکندریہ جانے والے بحری جہاز میں بیٹھ گیا۔ آپ ضرور حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں سفر کے اخراجات کیسے پورے کرتا تھا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ان دنوں میں نوجوان تھا اور ایڈونچر کرنے کے واسطے ہر گھڑی تیار رہتا تھا۔ میں ایسا کرتا کہ جس بحری جہاز پر سفر کرتا اس کے کپتان کے سامنے بے دھڑک پیش ہو جاتا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی یا ایسی ہی عربی یا فرانسیسی زبان میں اسے کہتا کہ میں ماڈرن مارکو پولو ہوں اور دنیا کے ملکوں کی سیر و سیاحت کو نکلا ہوں۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

مجھے جہاز پر اپنے ساتھ لے چلیں میں جہاز کے فرش صاف کر دیا کروں گا۔ میرے اعتماد بھرے لہجے اور بے باکی سے لوگ متاثر ہوتے اور یوں میں جہاز پر سفر کرتے ہوئے ساتھ ساتھ جہاز کے فرش بھی صاف کرتا اور کچھ پیسے جمع بھی کر لیتا تھا۔

جہاز اسکندریہ کی بندرگاہ سے لگا تو دن کا وقت تھا۔ مصر کا آسمان روشن اور چمکیلا تھا۔ سفید مرغابیاں فضا میں تیر رہی تھی۔ یہ سب کچھ مجھے بڑا اچھا لگا۔ مصر ہزاروں سال پرانا شہر تھا اور اسکندریہ کے بارے میں میں نے پڑھا تھا کہ اسے سکندر اعظم نے آباد کیا تھا اور یہاں ایک بہت بڑی لائبریری تھی جس میں اس زمانے میں لاکھوں کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ مگر تاریخ کے مطابق وہ قدیم اسکندریہ آج کے اسکندریہ شہر کے جنوب کی طرف کئی میل کے فاصلے پر واقع تھا جہاں اب سوائے ریت کی ڈھیریوں کے اور کچھ باقی نہیں ہے۔

لیکن جدید اسکندریہ بھی بہت بڑا شہر تھا۔ اس شہر میں مشرقی اور مغربی تہذیب آپس میں گھل مل گئی تھی۔ یہاں میں نے جہاز چھوڑ دیا تھا۔ میں نے جہاز پر کام کرتے ہوئے کچھ مصری پونڈ جمع بھی کر لئے تھے جو مصر میں ہفتے بھر کے قیام و طعام کے لئے کافی تھے۔ اسکندریہ سے میں قاہرہ آ گیا جو مصر کا دارالحکومت ہے۔ اس شہر پر مشرقی پراسراریت چھائی ہوئی تھی۔ اسکی اپنی تاریخ بڑی پراسرار اور ہزاروں برس پرانی تھی۔ فرعون اسی سرزمین میں پیدا ہوئے اور اسی سرزمین پر بنے ہوئے اہراموں میں دفن ہو گئے۔ یہاں کا جامع الازہر سب سے بڑی دینی یونیورسٹی تھی اور شہر کے وسط میں بہت بڑی جامع مسجد بھی تھی۔ دریائے نیل شہر کے درمیان سے گزرتا تھا۔ کبھی اس دریا پر مصر کے شاہی خاندان کی شاہزادیاں اور بیگمات شاہی بجروں میں شام کے وقت دریا کی سیر کیا کرتی تھیں مگر آج اس میں ڈیزل والے سٹیمر چلتے تھے جن کی آواز دور سے سنائی دیتی تھی۔ قاہرہ کا شہر تو بڑا ماڈرن تھا مگر دیہات میں لوگ ابھی تک قدیم زمانے ایسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان دیہات کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ ابھی کسی نہ کسی ٹیلے کے پیچھے سے فرعون کی سواری نکل آئے گی۔

جنگ کے بعد قاہرہ میں بھی بڑی مہنگائی ہو گئی تھی۔ میں نے شہر کے ایک پرانے بازار میں ایک ایسا سرائے نما ہوٹل تلاش کر لیا جہاں میں تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے بڑے آرام سے

رہ سکتا تھا۔ یہاں مجھے کوئی کمرہ تو نہیں ملا تھا۔ دالان میں پرانا قالین بچھا تھا بس وہیں میں رات کو پڑ کر سو جاتا تھا۔ سارا دن شہر کی گشت لگاتا رہتا۔ ایک دن میں اہرام مصر کی سیر کو چل پڑا۔ یہ اہرام قاہرہ سے چند میل دور وادی غزہ کے ریتلے میدان میں اونچے تکونی ٹیلوں کی شکل میں واقع ہیں۔ پہلے ابوالہول کا مجسمہ آتا ہے جس کے پاؤں کے درمیان سیاحوں کے واسطے ایک ماڈرن ریستوران بنا ہوا ہے جہاں سیاح مصر کی شدید گرمی میں تھوڑی دیر سکون سے بیٹھ کر ٹھنڈے مشروبات سے دل بہلاتے ہیں۔

وادی غزہ میں سب سے بڑا اہرام مصر کے فرعون اخناطون کا ہے۔ یہ فرعون دوسرے فرعونوں کی طرح بت پرست نہیں تھا بلکہ ایک خدا کو مانتا تھا۔ اس نے معبدوں کے سارے بت تڑوا دیئے تھے۔ مگر وہ درباری سازشوں کا شکار ہو کر جوانی میں ہی مارا گیا۔ نفرتیتی اس کی ملکہ تھی جو بڑی رحم دل خاتون تھی۔ ان دونوں کے حنوط شدہ جسم لندن کے عجائب گھر میں محفوظ پڑے ہیں۔ اب تو اہراموں کے اندر سیاحوں کے واسطے باقاعدہ راستے بنا دیئے گئے ہیں اور روشنی کا بھی معقول انتظام ہے مگر جب یہ اہرام دریافت ہوئے تو اندر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہ ہزاروں سال پرانا اندھیرا تھا۔ جگہ جگہ خفیہ طور پر گہرے کنوئیں کھدے ہوئے تھے جس میں گر کر کوئی زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ جب پہلا اہرام 1923ء میں کھولا گیا تو اہرام کے اندر فرعون کے تابوت کے آس پاس دالان کی ریت پر کئی انسانی ڈھانچے بھی ملے جن کے بارے میں بعد میں تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ ان مصری غلاموں اور کنیزوں کے ڈھانچے تھے جنہیں فرعون کی لاش کے ساتھ اس خیال سے زندہ دفن کر دیا گیا تھا کہ وہ موت کے بعد اگلی دنیا میں فرعون کی خدمت کریں گے۔ ریت پر ان غلاموں اور کنیزوں کے پاؤں کے نشان بھی ہزاروں برس کے ویسے ہی محفوظ تھے۔

جن دنوں میں اہرام کی سیر و سیاحت کو گیا ان دنوں وہاں ایک فرانسیسی ٹیم ایک نئے دریافت شدہ اہرام کی کھدائی کر رہی تھی۔ یہی وہ اہرام تھا جو میری زندگی کے سب سے حیرت انگیز اور ہولناک تجربے کا باعث بنا۔

☆......☆......☆

آج بھی جب ان واقعات کو یاد کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ گزر رہا تھا۔ فرانسیسی ماہرین آثار قدیمہ کی جو ٹیم نئے اہرام کی کھدائی کر رہی تھی اس نے اہرام کے قریب ہی اپنے رہائشی خیمے لگا رکھے تھے۔ ان کی گاڑیاں بھی وہیں کھڑی رہتیں۔ یہ ٹیم پندرہ بیس آدمیوں پر مشتمل تھی جس میں ایک نوجوان خاتون بھی تھی جو ٹیم کے سربراہ مسٹر شارل کی بیوی تھی۔ دونوں نوجوان تھے اور اہرام مصر کے راز معلوم کرنے کا شوق انہیں پیرس سے مصر لے آیا تھا۔ ٹیم کے دوسرے اراکین کا تعلق بھی فرانس ہی سے تھا۔ اس کے علاوہ مقامی مصری لوگ تھے جو کھدائی اور چیزیں اٹھانے لے جانے میں ان کی مدد کرتے تھے۔

میں چونکہ عربی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان بھی اچھی طرح سے اب بولنے اور سمجھنے لگا تھا اس وجہ سے مجھے مسٹر شارل نے اپنی ٹیم میں شامل کر لیا۔ انہیں ایک ایسے نوجوان کی ضرورت تھی جو مزدوروں کو عربی زبان میں بات سمجھا سکے۔ میری ضرورت یہ تھی کہ مجھے مصر میں رہنے کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی۔ میں قاہرہ سے روزانہ صبح بس میں سوار ہو کر سائیٹ پر، یعنی اس جگہ پہنچ جاتا جہاں اہرام کی کھدائی ہو رہی تھی۔ میرا کام مصری مزدوروں کی نگرانی کرنا، ان کے اوور ٹائم کا حساب کتاب رکھنا اور مسٹر شارل سے فرانسیسی میں احکامات سن کر انہیں عربی میں سمجھانا تھا۔ یہ کوئی مشکل

کام نہیں تھا۔ چنانچہ میں بڑا خوش تھا اور اپنے شوق کی خاطر اور قدیم فرعونوں کی ہزاروں برس پرانی ممیاں اور ان کی پرانی چیزیں دیکھنے کے لئے وہاں ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد بھی اکثر موجود رہتا اور مسٹر شارل اور اس کی فرانسیسی بیوی جولیانہ سے مصری دیومالا اور کاہنوں کے طلسم کے بارے میں گفتگو کیا کرتا۔

مسٹر شارل نے مجھے بتایا کہ فرعونوں کے یہ اہرام چار پانچ ہزار برس سے یہاں موجود ہیں اور تب سے لے کر اب تک ان اہراموں کو لٹیروں اور ڈاکوؤں نے کئی بار لوٹا ہے۔ صرف دو یا تین اہرام ایسے تھے کہ جن کے اندر ڈاکوؤں کو داخل ہونے کا راستہ نہ مل سکا تھا اور ان اہراموں کے نوادرات اور سونے چاندی کے برتن، ہیرے جواہرات محفوظ رہ گئے جو اب قاہرہ، پیرس اور لندن کے عجائب گھروں کی زینت ہیں۔

میں نے اس سے پوچھا۔

"تم جس اہرام کی کھدائی کر رہے ہو کیا یہ اہرام بھی لٹیروں سے محفوظ رہا ہے۔"

اس کے جواب میں مسٹر شارل نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اہرام کے اندر جا کر ہی معلوم ہوگا۔ ابھی تو ہم اس کے پہلے دالان تک بھی نہیں پہنچے۔"

مجھے معلوم تھا کہ مصر کے توہم پرست لوگوں میں یہ بات بڑی مشہور ہے کہ جو کوئی فرعون کے تابوت کو کھولتا ہے اسے فرعون کی بددعا ضرور لگتی ہے اور بڑی اذیت کی موت مرتا ہے۔ جب میں نے مسٹر شارل سے فرعون کی بددعا کا تذکرہ کیا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ فرعونوں کو مرے ہزاروں برس ہو چکے ہیں۔ وہ کسی کو بددعا نہیں دے سکتے۔ پھر یہ سائنس کا زمانہ ہے۔ سائنس ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔"

وہاں کے جو مقامی لوگ وہاں کام کر رہے تھے ان میں ایک مصری مزدوروں کا میٹ تھا جس کا نام

بصری تھا۔ بصری کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی مگر جسم بڑا تنومند تھا۔ میرا اس کے ذریعے دوسرے مصری مزدوروں سے رابطہ تھا۔ باتوں ہی باتوں میں بصری ایک روز کہنے لگا۔

''اس اہرام کو کھول کر یہ لوگ اچھا نہیں کر رہے تم دیکھ لینا یہ فرانسیسی لوگ یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکیں گے۔ یہ سب فرعون کی بددعا کا شکار ہوں گے۔ آج سے دس برس پہلے ایک انگریز یہاں آیا تھا۔ اس نے مغربی اہرام کو کھولا تھا اور فرعون کا سونے کا تاج ولائیت لے گیا تھا۔ جانتے ہو اس کا کیا انجام ہوا؟ اس کے دماغ میں ایک خنجر گھس گیا تھا اور بڑی اذیت کی موت مرا۔''

میں نے بصری کی باتوں کا ذکر شارل سے نہ کیا۔ کیونکہ وہ ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ مگر میں اس سے پہلے فرعونوں کی بددعا کے بارے میں بہت سی باتیں کتابوں میں پڑھ چکا تھا اور مصر کے قدامت پسند گھرانوں میں یہ وہم یقین کی حد تک پایا جاتا تھا کہ جس کسی نے بھی فرعون کا مقبرہ کھولا ہے اس کا انجام بڑا عبرت ناک ہوا۔ اس سلسلے میں ایک دو مثالیں بھی سامنے آ چکی تھیں۔ لیکن یہ جدید سائنس کا زمانہ تھا۔ یورپ کے لوگ ان باتوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتے تھے۔

اہرام کی کھدائی کا کام بڑے زور شور سے ہو رہا تھا۔ میں اپنے سرائے نما ہوٹل سے صبح سائیٹ پر آ جاتا۔ سارا دن مزدوروں سے کام کرواتا اور شام ہوتے ہی واپس آ جاتا۔ مجھے وہاں صرف اس شوق نے روکے رکھا تھا کہ اہرام کو کھلتا اور اگر اندر کسی فرعون کی ممی ہو تو اسے دیکھوں۔ اس دوران میں نے مصری مزدوروں سے فرعونوں کی لاشوں اور ان کی بددعا کے بارے میں مختلف قسم کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں سنیں۔ میرا چونکہ دعا اور بددعا پر اعتقاد تھا اس لئے بڑا محتاط ہو گیا تھا۔ اہرام کی کھدائی جاری تھی۔ ایک رات ایسا ہوا کہ اچانک شارل کی بیوی جولیانہ چیخ مار کر خیمے سے باہر نکل آئی اور زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے اپنے خاوند شارل کو بتایا کہ ایک سرخ آنکھوں والا کاہن اس کے خیمے میں آیا تھا۔ اس نے جولیانہ کا گلا دبا کر اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر شارل نے اسے محض وہم قرار دیا اور اپنی بیوی جولیانہ کو

قاہرہ والے فلیٹ میں بھجوا دیا۔ اس روز مصری میٹ mate بصری نے اپنی پراسرار آواز میں مجھے کہا۔

''بہت جلد کچھ ہونے والا ہے''

اس کے اگلے روز دیوار بھی گرا دی گئی جو اہرام کے آخری دالان اور فرعون کے مقبرے کے درمیان بنی ہوئی تھی۔ اس وقت میں بھی شارل کے ساتھ تھا۔ مقبرے کے درمیان ایک تابوت پڑا تھا۔ جس پر پیتل کا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ شارل ٹارچ روشن کر کے اندر داخل ہو گیا۔

☆......☆......☆

فرعون کا تابوت ایک چبوترے پر رکھا تھا۔ تابوت کے اوپر سانپ کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ شارل نے اس پر تارچ کی روشنی ڈالی۔ سانپ کی آنکھوں کے سرخ نگینے شعاعیں دینے لگے۔ شارل نے تابوت کا ڈھکنا اٹھا دیا۔ اندر تارچ کی روشنی میں فرعون کی لاش دکھائی دی جس کے سارے بدن پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ صرف چہرہ کھلا تھا۔ لاش کے سر پر سونے کا تاج تھا جس میں بڑے قیمتی ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے۔ تارچ کی روشنی میں ان جواہرات میں سے رنگ برنگی کرنیں پھوٹنے لگی تھیں۔ فرانسیسی ماہر آثار قدیمہ مسٹر شارل بڑا خوش تھا۔ مجھے کہنے لگا۔

''ہم نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس مشہور فرعون کی لاش ہمیں صحیح حالت میں مل گئی۔''

اس نے فرعون کا تاج نکال کر تابوت بند کر دیا اور بولا۔

''اس فرعون کا خزانہ بھی یہیں کہیں ہوگا۔ یہ لوگ بادشاہوں کو دفن کرتے وقت ان کا خزانہ بھی ساتھ دفن کر دیا کرتے تھے۔''

تھوڑی سی تلاش کے بعد ستونوں کے پیچھے ایک صندوق بھی مل گیا۔ صندوق میں سونے کے برتن بھرے ہوئے تھے۔ یہ ساری چیزیں اہرام سے نکال کر باہر کیمپ میں لائی گئیں۔ شارل اور اس کے ساتھیوں نے ان بغور معائنہ کیا۔ ان کی فہرست بنائی۔ مصری حکومت کا ایک

افسر بھی وہاں موجود تھا۔ مصری حکومت سے کئے گئے معاہدے کے مطابق شارل نے تاج اپنے پاس رکھا اور باقی سارا خزانہ حکومت کے حوالے کر دیا۔ یہ تاج وہ پیرس کے میوزیم میں لے جا کر رکھنا چاہتا تھا۔

بصری نے مجھے کہا۔

''یاد رکھنا۔ اس فرانسیسی کی بدقسمتی کے دن شروع ہو گئے ہیں۔ اس نے فرعون کا خزانہ چرایا ہے۔ یہ فرعون کی بددعا سے نہیں بچ سکے گا۔''

میں نے بصری کو کوئی جواب نہ دیا اور مزدوروں کے کام کی نگرانی کرتا رہا۔ شارل کی بیوی جولیانہ ابھی تک قاہرہ کے ہسپتال میں تھی۔ اسے ایک روز پہلے خواب میں کوئی مصری کاہن دکھائی دیا تھا جس سے ڈر کر وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور اسے ہسپتال پہنچانا پڑا تھا۔ شارل نے فرعون کا قیمتی تاج قاہرہ کے ایک بینک کے لاکر میں رکھوا دیا۔ اسکی بیوی کی بیماری نے تشویش ناک صورت اختیار کر لی۔ ڈاکٹر اس کے مرض کی کوئی تشخیص نہ کر سکے تھے۔ جب جولیانہ کی حالت زیادہ خوفناک ہو گئی تو شارل اسے لے کر پیرس جانے کے واسطے ایئرپورٹ کی طرف اپنی چھوٹی سی گاڑی میں جا رہا تھا کہ اس کی گاڑی پل کے جنگلے سے ٹکرا کر دریائے نیل میں گر پڑی۔ گاڑی کے دروازے جام ہو گئے تھے جس کے نتیجے میں وہ دونوں گاڑی کے اندر ہی ڈوب کر بے بسی کے عالم میں ہلاک ہو گئے۔ جب ان کی موت کی خبر کیمپ میں پہنچی تو بصری دوڑا دوڑا میرے پاس آیا۔ کہنے لگا۔

''فرعون کی بددعا کا اثر شروع ہو گیا ہے۔ تم دیکھ لینا فرعون کی روح اس کے سارے خاندان سے اپنی بے حرمتی کا بدلہ لے گی۔''

مگر میں نے اس کی بات کا یقین نہ کیا۔ کیونکہ یہ ایک حادثہ تھا۔ پل پر سامنے سے ایک ٹرک آ رہا تھا جس سے بچنے کے لئے شارل نے اپنی گاڑی ایک طرف کی تو اتفاق سے اس کی گاڑی پل کے جنگلے سے ٹکرا کر دریا میں گر پڑی۔ اس سے زیادہ میں نے اس حادثے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ شارل کی جگہ پیرس سے ایک دوسرا آدمی آ گیا۔ جس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ فرعون کا مقبرہ مکمل چکا

تھا۔ اس میں رکھے ہوئے چار ہزار سال پرانے نوادرات نکالے جا رہے تھے اور انہیں مصری اور فرانسیسی حکومتوں کے مابین تقسیم کیا جا رہا تھا۔ فرعون کا تاج ابھی تک قاہرہ کے سرکاری بینک کے لاکر میں ہی تھا۔ شارل کی جگہ جو افسر پیرس سے آیا تھا اس کا نام کرسٹوفر تھا۔ یہ درمیانی عمر کا بڑا اکھڑ مزاج، بے دین شخص تھا جو مزدوروں کے ساتھ بھی بڑی سختی سے پیش آتا۔ لاکر کی چابی کرسٹوفر کے پاس ہی تھی۔ میرے ساتھ وہ اس لئے نرمی سے بات کرتا کہ میں اس کے اور مزدوروں کے درمیان ایک واسطے کی حیثیت رکھتا تھا اور کرسٹوفر کو جو بات سمجھانی ہوتی تھی وہ میرے ذریعے ہی مزدوروں اور دوسرے اہلکاروں کو سمجھاتا تھا۔

ایک روز اس نے کہا کہ میں بینک جا رہا ہوں۔ آج فرعون کا قیمتی تاج پیرس بھجوانا ہے۔ وہ چلا گیا۔ وہ ایک بند گاڑی میں گیا تھا۔ مسلح گارڈ اس کے ساتھ تھے۔ بصری اس روز بڑا پریشان تھا۔ مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا۔

"یہ مصر کی دولت ہے جو لوٹی جا رہی ہے۔ ہماری حکومت کو ان لوگوں کے ساتھ ایسا معاہدہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ٹھیک ہے یہ لوگ کھدائی کے اخراجات برداشت کر رہے ہیں لیکن آخر یہ ساری دولت اور نوادرات ہمارے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو حکومتوں کے فیصلے ہیں۔ ہم اس میں دخل نہیں دے سکتے۔"

بصری غصے میں آ گیا۔ بولا۔

"تم دیکھ لینا۔ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ فرعون کا تاج یہاں سے کوئی نہیں لے جا سکے گا۔"

میں نے حسب عادت بصری کی باتوں پر زیادہ توجہ نہ دی۔ اس بات کو بمشکل پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ اچانک سے مصری پولیس کی تین گاڑیاں وہاں آ کر رکیں۔ پولیس کے آدمیوں نے سارے اہرام اور کیمپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ بصری میری طرف دیکھنے لگا۔

"کچھ ہو گیا ہے۔"

مصری پولیس کے سپاہی بندوقوں سے مسلح تھے۔ وہ ہر طرف پہرے پر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے انسپکٹر نے

مزدوروں اور دوسرے کام کرنے والوں کو صرف اتنا ہی کہا تھا کہ کوئی یہاں سے باہر نہ جائے۔

اتنے میں کرسٹوفر کی گاڑی بھی آ گئی۔ وہ سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔ پتہ چلا کہ بینک کے لاکر سے فرعون کا قیمتی تاج غائب ہو گیا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ شہر کی ساری پولیس کو چوکس کر دیا گیا۔ کرسٹوفر کے آنے پر سارے کیمپ کی تلاشی لی گئی۔ جس بینک کے لاکر سے یہ قیمتی تاج غائب ہوا تھا اس کے منیجر کو گرفتار کر لیا گیا۔ ابھی اس کی تفتیش جاری تھی کہ اسی اہرام کا ایک دوسرا دالان کھولا گیا۔ اس وقت بھی میں کرسٹوفر کے ساتھ تھا۔ اس دالان میں بارہ ستون تھے۔ دیوار کے ساتھ ایک ممی کا تابوت لگا ہوا تھا۔ کرسٹوفر نے اس تابوت کو کھلوایا تو اندر ایک عورت کی حنوط شدہ لاش تھی جو شکل و شباہت سے قدیم مصر کے شاہی خاندان کی شہزادی لگتی تھی۔ اس کے گلے میں سونے کا ایک لاکٹ تھا جس پر بڑا ہی قیمتی زمرد جڑا ہوا تھا۔ شہزادی کی لاش کی آنکھیں ذرا ذرا کھلی تھیں۔ لگتا تھا وہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔

کرسٹوفر نے مجھے کہا کہ تم دوسرے ستونوں کے پاس جا کر دیکھو وہاں کوئی نوادرات کا بکس وغیرہ تو نہیں رکھا ہوا۔ مجھے کرسٹوفر پر کچھ شبہ سا ہوا۔ دالان میں اندھیرا تھا۔ صرف اتنی ہی روشنی ہو رہی تھی جتنی کرسٹوفر کی ٹارچ سے پیدا ہو سکتی تھی۔ میں نے ایک ستون کے پیچھے آتے ہی مڑ کر دیکھا اس وقت کرسٹوفر شہزادی کی لاش کے گلے سے لاکٹ اتار کر اپنی جیب میں رکھ رہا تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ وہ اسے بھی نوادرات کی سرکاری فہرست میں شامل کر لے گا۔ مگر کیمپ میں آ کر جب اس نے فہرست تیار کی تو اس میں زمرد کے لاکٹ کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کرسٹوفر نے بددیانتی کی ہے اور یہ قیمتی لاکٹ اپنے پاس ہی رکھ لیا ہے۔ یہ بات مجھے اچھی نہ لگی۔ مگر پھر سوچا مجھے ان معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو محض قدیم اہرام اور ان کے نوادرات کو دیکھنے کے شوق کی خاطر اس ٹیم میں شامل ہوا تھا۔ ان کے اخلاق سدھارنے وہاں نہیں آیا تھا۔

لیکن اس رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اس رات مجھے کیمپ میں ہی دیر ہو گئی اور میں کھانا کھا کر دیر تک کیمپ کے باہر ستاروں کی روشنی میں کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ آدھی رات کے وقت اچانک

میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے کندھے کو آہستہ سے ہلا کر مجھے جگایا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے ایک لاش اپنے سامنے کھڑی دکھائی دی جس کے سارے جسم پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ صرف چہرہ خالی تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ اسی شہزادی کی لاش تھی جس کے گلے سے کرسٹوز نے قیمتی زمرد اتارا تھا۔ میرے کانوں میں اس کی دھیمی سی آواز آئی وہ مجھ سے میری اپنی زبان میں کہہ رہی تھی۔ "میرے ساتھ آؤ"۔

☆......☆......☆

مجھ پر ایک سحر سا طاری ہو گیا تھا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اگر چہ وہ ایک حنوط کی ہوئی لاش تھی۔ اس کے سارے بدن پر پٹیاں تھیں۔ مگر مجھے اس سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ تین ہزار سال پرانے مصر کے ایک شاہی خاندان کی شہزادی کی لاش تھی۔ اور مصر کی قدیم تاریخ کے لئے میرے دل میں شروع ہی سے گہری وابستگی کے جذبات تھے اور یہی شوق مجھے الجزائر سے قاہرہ کی طرف کھینچ کر لے آیا تھا۔

وہ مجھے اہرام کے اس دالان میں لے آئی جہاں اسکا خالی تابوت پڑا تھا۔ تابوت کے قریب ایک پرانے زمانے کا شمعدان روشن تھا۔ یہ شمع دان پہلے وہاں نہیں تھا۔ اسکی نیم اور دھندلی روشنی میں مجھ سے چار قدم کے فاصلے پر کھڑی شہزادی کی لاش کا سایہ تابوت پر پڑ رہا تھا۔ یہاں پہلی بار مجھے خوف سا محسوس ہوا کہ یہ مجھے اس جگہ کیوں لے آئی ہے۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک بار پھر شہزادی کی دھیمی آواز سنائی دی۔ یہاں میں یہ ضرور بتاتا چلوں کہ جب مجھے اس کی آواز آتی تھی تو اس کے ہونٹ بند ہوتے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"ڈرو نہیں۔ میں تمہیں وہاں لے جا رہی ہوں جہاں آج تک کوئی زندہ انسان نہیں جا سکا۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"مگر میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔"

اس کی آواز آئی۔

"تم مرو گے نہیں۔ تم وہ پہلے خوش قسمت آدمی ہو گے جو آج سے ساڑھے تین ہزار سال پہلے کے زمانے کو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دو۔"

میں اس قسم کے خطرناک تجربے سے گذرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر خدا جانے مجھ پر اس عورت کے طلسم کا اثر تھا یا میرے دل میں اس زمانے کو دیکھنے، اس کے ماحول میں سانس لینے کی کوئی دبی ہوئی خواہش تھی کہ جس کے زیر اثر، میرے ہاتھ اپنے آپ اپنی آنکھوں کی طرف اٹھ گئے۔ جونہی میں نے آنکھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس لاش کا ہاتھ میرے کاندھے کو چھو رہا ہے۔ اتنے عرصے کے بعد اپنی زندگی کے ایک انوکھے، ناقابل یقین اور حیرت انگیز واقعے کو بیان کرتے ہوئے مجھ پر اس وقت بھی وہی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ بس مجھے ایک چکر سا آ گیا تھا اور پھر جیسے میرے پاؤں کے نیچے سے کسی نے زمین ایک تختے کی طرح کھینچ لی اور میں نیچے گرا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

میں اس ماورائی واقعے کو بیان تو کر رہا ہوں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اس واقعے کی سچائی پر ضرور شک کریں گے۔ شبہ اس وقت بھی مجھے تھا اور آج بھی ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ سب کچھ میرے ساتھ خواب کے عالم میں گذرا ہو۔ لیکن خواب میں آدمی اتنا بیدار نہیں ہوتا جتنا میں بیدار تھا اور سب کچھ پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ بہر حال وہ جو کچھ بھی تھا میں اس کی پوری تفصیل آپ کے سامنے بیان کرنا ایک ادیب کی حیثیت سے اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ آپ کو یقین نہ آئے تو بے شک یقین مت کیجئے گا۔ یقین مجھے بھی نہیں آ رہا۔ مگر اتنا ضرور ذہن میں رکھیں کہ اس حقیقت اور سائنس کی دنیا میں کبھی کبھی کہیں نہ کہیں کوئی ایسا مافوق الفطرت واقعہ ضرور رونما ہو جاتا ہے کہ جس کے آگے سائنس بے بس اور دم بخود ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں جہاں روح اور مادے کی

بحث نہیں چھیڑنا چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ مشرق کے فلاسفروں کے علاوہ قدیم و جدید یورپ کے جس فلسفی اور ہیئت دان نے بھی مادے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی وہ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ مادے کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی روح رکھتا ہے اور جن فلسفیوں نے کائنات کے نظام اور اس کے مزاج کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی وہ بے اختیار پکار اٹھے کہ اس دنیا کے بعد بھی ایک دنیا ہے۔ جو روحانی دنیا ہے۔ اور جہاں انسان کے اعمال کا خاتمہ ہوتا ہے اور اسے جزا اور سزا کے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔

میں چونکہ روح کے وجود اور جزا و سزا پر ایمان رکھتا ہوں اس لئے اپنے جس تجربے سے گذرا اسے ایک روحانی تجربہ ہی کہوں گا جو مجھے عالم خواب میں پیش آیا۔ مگر یہ عالم خواب ____ عین عالم بیداری جیسا تھا۔ اب میں آپ کو اصل واقعہ سناتا ہوں۔

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ مصری شہزادی کی لاش نے جونہی میرے کاندھے سے اپنا ہاتھ لگایا مجھ پر ایک غنودگی سی طاری ہو گئی اور میں جیسے بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سنگ مرمر کے اونچے اونچے ستونوں والا ایک کمرہ ہے جس کی دیواروں پر سرخ اور نیلے مخمل کے پردے لٹک رہے ہیں۔ محرابی کھڑکی میں سے نیلے آسمان پر چمکتا چاند صاف دکھائی دے رہا ہے۔ کمرے میں شمع دان روشن ہیں۔ فرش دبیز ریشمی قالینوں میں چھپا ہوا ہے۔ سنگ مرمر کی نیچی میز پر چاندی کے گلدان میں کنول کے سفید پھول سج رہے ہیں۔ سامنے آبنوسی دیوان پر وہی شہزادی جس کی لاش مجھے اپنے ساتھ اہرام میں لائی تھی، گاؤ تکیے کا سہارا لئے بڑے سکون سے بیٹھی ہے۔ اس کا لباس بڑا شاہانہ ہے مگر سر پر تاج نہیں ہے۔ ایک سیاہ فام کنیز ذرا پیچھے ادب سے کھڑی آہستہ آہستہ مورچھل ہلا رہی ہے۔ اس پراسرار فضا میں عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ مصری شہزادی نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میرے قریب ہی ایک پرانی طرز کی سیاہ کرسی پڑی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ ایک کنیز میرے واسطے زمرد کے گلاس میں شربت لے آئی۔ ایسا میٹھا اور پاکیزہ شربت میں نے پہلے بھی

نہیں پیا تھا۔ اس میں سے کنول کے پھولوں کی بڑی ہی لطیف خوشبو آ رہی تھی۔ تب شہزادی نے زبان کھولی اور کہا۔

"سنو! میں تمہیں یہاں اس لئے لے آئی ہوں کہ تم ہماری قدیم تاریخ سے محبت رکھتے ہو۔ اس وقت تم تین ہزار برس قدیم مصر کے خدا پرست بادشاہ اخناتون کی سب سے چھوٹی بیٹی کے محل میں ہو۔ میرا باپ ایک خدا کو مانتا تھا۔ تم نے اپنے زمانے میں لکھی ہوئی کتابوں میں بھی میرے بادشاہ باپ اخناتون کے بارے میں ضرور پڑھا ہوگا کہ یہ واحد فرعون تھا جو صرف ایک خدا اور ایک قادر مطلق کی ہستی پر ایمان رکھتا تھا اور جس نے تمام بت کدوں کو گروا دیا تھا تمام بتوں کو تڑوا دیا تھا اور بتوں کی پوجا کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ میرے باپ کا انجام کیا ہوا؟ تم ان باتوں کو رہنے دو۔ بہرحال میں اپنے خاندان کی سب سے چھوٹی اور واحد شہزادی ہوں۔ جو زندہ ہوں۔

میرے باپ کی نشانی ایک تاج تھا جو میرے مرنے کے بعد میرے ساتھ ہی تابوت میں دفن کر دیا گیا تھا۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ تاج تابوت کے اندر میرے سر پر سجا رہا۔ لیکن تمہارے زمانے میں یورپ کے لوگوں کو قدیم تہذیبوں کی کھدائیوں کا بڑا شوق ہے۔ زیادہ قدیم خزانے حاصل کرنے کی وجہ سے اور بہت کم ہمارے زمانے کی تہذیب و ثقافت سے روشناس ہونے کے لئے۔

اب میری وہ بات غور سے سنو جو میں تمہیں سنانے لگی ہوں اور جس کے واسطے میں تمہیں یہاں لائی ہوں۔"

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ محرابی کھڑکی میں سے چاند صاف نظر آ رہا تھا اور ایک ایسی ہوا آ رہی تھی جس میں تین ہزار برس پرانی ٹھنڈی ستاروں بھری صحرائی رات کی خنکی اور مہک تھی۔

☆......☆......☆

مصری شہزادی کی آواز میں ایک پراسرار ماورائیت تھی۔

وہ سارے کا سارا ماحول ہی ماورائی تھا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ اس وقت مجھے ایک لمحے کے لئے بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ صرف یہی ایک احساس تھا کہ میں کسی ان جانے حادثے یا ذریعے سے ہزاروں برس پرانی مصری تہذیب کے زمانے میں پہنچ گیا ہوں اور مصری شہزادی سے جو اپنے آپ کو ایک خدا پرست بادشاہ مصر اخناتون کی چھوٹی بیٹی ظاہر کرتی ہے ہمکلام ہوں۔

جب اس شہزادی نے یہ کہا کہ میں تمہیں ایک اہم بات بتانے والی ہوں تو میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے ذرا آگے جھک گئی اور بولی۔

"جس طرح ہماری دنیا میں تم لوگوں کا کوئی عمل دخل نہیں رہتا۔ اسی طرح ہم بھی تمہاری دنیا میں دخل نہیں دے سکتے۔ میں نے تمہیں اس واسطے یہاں بلایا ہے بلکہ تمہیں اپنے ساتھ لائی ہوں کہ تم پر اپنے بیان کی سچائی ثابت کر سکوں اور تم یہ نہ سمجھو کہ میں غلط بیانی سے کام لے رہی ہوں۔ تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ میرا رتبہ کیا ہے اور یہ کہ میرا سر اس شاہی تاج سے خالی ہے۔ جو میرے نیک سیرت، توحید پرست درویش صفت بادشاہ باپ کی بڑی قیمتی نشانی

تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ نشانی اور میری امانت مجھے واپس دلانے میں تم میری مدد کرو۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے کہا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر تم مجھے تین ہزار سال آگے کے زمانے سے اپنے زمانے میں لا سکتی ہو تو پھر اپنا تاج کیوں نہیں لا سکتیں۔"

شہزادی کے چہرے پر بڑا نورانی سا تبسم نمودار ہوا۔ اس نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں جس باپ کی بیٹی ہوں۔ وہ ایک رحم دل اور دوسروں سے محبت کرنے والا فرعون تھا۔ وہ طلسم اور جادو کے بھی خلاف تھا۔ میں بھی اسی کے نقش قدم پر چل رہی ہوں۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ میری خواب گاہ میں کسی جانور یا دیوتا کا بت نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں بھی اپنے باپ کی طرح ایک قادر مطلق کو مانتی ہوں اور کسی بت کی پوجا نہیں کرتی۔ اس طرح میں جادو ٹونے پر بھی ایمان نہیں رکھتی اور تمہاری دنیا کے ضابطوں کا احترام کرتی ہوں۔"

میں نے سوال کیا کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟۔ وہ بولی۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم میرا شاہی تاج واپس دلانے میں میری مدد کرو۔"

میں نے کہا۔

"مگر مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں کہ تمہارا شاہی تاج کس کے پاس ہے۔ وہ تو قاہرہ کے بینک کے لاکر سے غائب ہو چکا ہے اور پولیس اس کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔"

شہزادی مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"اگر میں تمہیں بتا دوں کہ شاہی تاج کس کے پاس ہے تو کیا تم وہاں سے لے آؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے وہاں سے تاج لانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے"

شہزادی بولی۔ "تو سنو! شاہی تاج فرانسیسی پروفیسر کرسٹوفر نے قاہرہ کے ایک یہودی شارون کے پاس فروخت کر دیا ہے جو قاہرہ کے سب سے مہنگے اور جدید ترین ہوٹل ہے را میں مقیم ہے۔"

"کیا شاہی تاج بھی اس کے پاس ہی ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" شہزادی نے کہا۔ "وہ یہ قیمتی تاج اپنے ملک میں سمگل کرنے کی کوشش میں ہے۔ اس نے ایک یہودی جاسوس شبت کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ یہ تاج اسی یہودی جاسوس کے پاس ہے۔ جو اس وقت اسکندریہ میں ایک گھڑی ساز کی حیثیت سے معمولی سی دکان لگائے بیٹھا ہے۔ تمہیں یہ تاج اس سے واپس لانا ہو گا۔ کیا تم یہ کام کر سکو گے؟ اس کے لئے بڑی ہوشیاری اور جرأت کی ضرورت ہو گی۔"

میں نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور شہزادی سے کہا کہ میں تمہاری امانت تم تک پہنچانے کے لئے پوری کوشش کروں گا۔ لیکن میں اس یہودی جاسوس شبت کو کیسے پہچانوں گا؟ اس پر شہزادی نے مجھے سنگ مرمر کی میز کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا۔ جونہی میں نے میز کی سطح پر نگاہ ڈالی تو وہاں ایک بازار کا منظر ابھر آیا۔ یہ ایک تنگ سا چھتا ہوا بازار تھا جس کی ایک دکان پر ایک درمیانی عمر کا گھڑی ساز بیٹھا گھڑی مرمت کر رہا تھا۔ شہزادی نے کہا۔

"یہی وہ یہودی جاسوس شبت ہے۔ میرا قیمتی تاج اس کے پاس ہے۔ اس بات کا سراغ تمہیں ہی لگانا ہو گا کہ اس نے تاج کہاں چھپا رکھا ہے۔" یہ شخص بڑا تجربہ کار یہودی جاسوس ہے اور کئی زبانیں بول لیتا ہے۔ عربی زبان یہ مصری اور شامی لہجے میں بڑی روانی سے بولتا ہے۔ یہاں اس نے اپنا نام ساعد شامی مشہور کر رکھا ہے۔ یہ اپنے ملک کے لئے عربوں کے خلاف جاسوسی بھی کرتا ہے۔ اس عرب دشمن جاسوس کو کیفر کردار تک پہنچانا ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہارا فرض ہے۔"

اس کے بعد شہزادی نے مجھے سیاہ دھات کی بنی ہوئی ایک انگوٹھی دے کر کہا۔ "میں ایک خدا پرست بادشاہ کی بیٹی ہونے کے ناطے تمہیں کہتی ہوں کہ اصل طاقت کا سرچشمہ قادر مطلق کی ذات ہی ہے۔ مگر اسکی مرضی سے اسکی کچھ تخلیقات میں کوئی خاص صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو قادر مطلق کے کرم کا مظہر ہوتی ہیں۔ اس طرح اس انگوٹھی میں بھی یہ صفت پیدا ہو گئی ہے کہ جب تم

اسے پہنو گے تو تمہارے اردگرد نظر نہ آنے والی ایک ایسی دیوار بن جائے گی جو تمہیں دنیا کے کسی بھی مہلک ہتھیار سے بچالے گی۔ لو۔ اسے پہن لو۔

میں نے انگوٹھی پہن لی۔ شہزادی اپنے دیوان سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ میرے قریب آئی۔ اس نے آہستہ سے میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

''اگر تم ہمارا خاندانی تاج واپس لے آئے تو میرے دل سے تمہارے لئے ہمیشہ دعا نکلے گی اور میں تمہارا یہ احسان کبھی فراموش نہ کر سکوں گی۔ اب جاؤ۔ سکندریہ کا بازار اور اس کی ایک دکان میں بیٹھا خطرناک یہودی جاسوس تمہارا منتظر ہے۔ اور ہاں جب تک یہ انگوٹھی تمہارے پاس ہے جیب میں پیسے کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ تمہاری جیب میں اس ملک کی کرنسی موجود رہے گی جس ملک میں تم رو رہے ہوگے۔ خدا تمہاری حفاظت کرے۔''

اس کے ساتھ ہی مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور میری آنکھیں اپنے آپ بند ہوگئیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کتنا وقت گذرا۔ لیکن جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں ماڈرن اسکندریہ کے چھتے ہوئے بازار میں ایک طرف موجود تھا اور سامنے وہی دکان تھی جس کے اڈے پر یہودی جاسوس شبت بیٹھا ایک آنکھ پر گول شیشہ چڑھائے گھڑی مرمت کر رہا تھا۔ میں دکان کی طرف بڑھا۔

☆......☆......☆

میں نے یہودی جاسوس شبت کامل کو پہچان لیا تھا۔ یہی وہ خطرناک جاسوس تھا جس کی مدد سے شاردن، مصری شہزادی کے قیمتی تاریخی تاج کو مصر سے باہر سمگل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں شبت کامل کی دکان میں داخل ہوا تو عین اسی وقت وہاں ایک دوسرا گاہک بھی آ گیا۔ اس نے عربی زبان میں اپنی مرمت شدہ گھڑی کے بارے میں دریافت کیا۔ شبت جاسوس نے الماری میں سے ایک سنہری زنجیر والی گھڑی نکال کر اسے دے دی اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسکندریہ کا یہ بازار بڑا معروف کاروباری بازار تھا۔ وہاں ہر قسم کی دکانیں تھیں۔ بازار سے ایسی خواتین بھی گذر رہی تھیں جنہوں نے سیاہ نقاب اوڑھ رکھے تھے۔ مجھے اندرون شہر لاہور کے بازار یاد آ گئے۔ یہ اسکندریہ کا قدیم علاقہ تھا۔ جدید اسکندریہ کے علاقے میں اونچی اونچی عالی شان عمارتیں، شاپنگ پلازا اور بڑے بڑے ہوٹل تھے۔ کشادہ سڑکوں پر ہر وقت ٹریفک رواں رہتا تھا۔ اس شہر کو جب کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں سکندر اعظم نے آباد کیا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس مقام پر سکندر نے یہ شہر آباد کیا تھا وہ یہ مقام نہیں ہے۔ بلکہ پرانا اسکندریہ وہاں سے چند کوس کے فاصلے پر آباد ہوا کرتا تھا۔ مگر وقت نے اس شہر کے تمام آثار مٹا دیئے ہیں اور اب

وہاں سوائے ریت کی اونچی نیچی ڈھیریوں کے اور کچھ نہیں ہے۔

گاہک چلا گیا تو یہودی جاسوس میری طرف متوجہ ہوا۔ اس نے عربی سے بڑے اخلاق کے ساتھ مجھ سے پوچھا کہ مجھے کیا چاہیے؟ مصری شہزادی کی دی ہوئی انگوٹھی میری انگلی میں تھی۔ میں نے دکان میں داخل ہونے سے پہلے اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر دیکھ لیا تھا کہ دونوں جیبوں میں مصری پاؤنڈ کے کافی نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ مصری شہزادی کی پیش گوئی پوری ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے ذہن میں سوچ لیا تھا کہ اس یہودی جاسوس کے ساتھ کیا بات کرنی ہے۔ چنانچہ اس کے پوچھنے پر کہ میں کس لئے وہاں آیا ہوں۔ میں نے بڑے اعتماد اور بڑی راز داری اس کی طرف جھک کر اسرائیلی زبان میں کہا۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

مصری شہزادی نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ جب تک انگوٹھی میرے ہاتھ میں رہے گی میں دنیا کی جس زبان میں چاہے روانی سے بات کر سکوں گا۔ یہودی جاسوس نے مجھے اپنی زبان میں بات کرتے سن کر میری طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی تیز چمک تھی۔ مگر آدمی بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہ دی اور صرف اتنا کہا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

اور پھر گھڑی کی مرمت میں مصروف ہوگیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں ہماری قوم اور ہم دونوں کا بھی فائدہ ہے۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر کہنے لگا۔ "ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"اسی لئے کہ جو کام میں کرنا چاہتا ہوں وہ تمہاری مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔" وہ مسکرایا۔ ابھی تک وہ اپنے کام میں ہی لگا تھا اور میری طرف بالکل نہیں دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "بھائی میں تو ایک معمولی گھڑی ساز ہوں۔ سارا دن دکان پر گھڑیوں کی مرمت کرتا ہوں۔ تب جا کر کہیں چار پیسے ملتے ہیں۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تم کسی دوسری دکان پر جاؤ۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میرے بھائی میں تمہارا ہم قوم ہوں۔ مجھ سے کچھ مت چھپاؤ میں جانتا ہوں تم ہماری قوم کے واسطے یہاں ایک خفیہ مشن پر ہو۔"

یہودی جاسوس اتنا تجربہ کار اور چالاک تھا کہ میرے اس جملے پر بھی اس نے کسی قسم کی حیرانی کا اظہار نہ کیا اور بدستور کام میں لگا رہا۔ صرف مسکرایا اور بولا۔

"بھائی! اگر تم مصری خفیہ پولیس کے آدمی ہو تو بڑے اناڑی ہو اور غلط آدمی کے پاس آگئے ہو۔ میں چھ برس سے یہاں دکان کر رہا ہوں۔ میں یہودی ضرور ہوں مگر مصر کا باشندہ ہوں اور اس ملک کی بھلائی اور بہتری میرا پہلا فرض رہا ہے۔ تم مجھے کوئی پاگل لگتے ہو۔ اپنا راستہ لو۔ میرا وقت ضائع نہ کرو۔"

میں نے اس کے انتہائی خفیہ کوڈ کا نمبر بول دیا جو مجھے مصری شہزادی نے بتا دیا تھا۔ یہودی جاسوس ثبت کامل کا چھوٹا سا پیچ کس گھڑی کے کسی پیچ پر چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے آنکھ پر لگا ہوا گول شیشہ اتار دیا۔ ایک نظر بازار پر ڈالی۔ اور میری طرف دیکھے بغیر آہستہ سے بولا۔

"اندر کمرے میں چلے جاؤ۔ میں آتا ہوں۔"

دکان کے اندر ایک تنگ و تاریک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں صرف روشندان میں سے ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ کمرے میں ایک پلنگ، دو پرانی کرسیاں اور دوسرا سامان بکھرا پڑا تھا۔ میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ یہودی جاسوس ثبت کامل بھی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے اپنے پیچھے کمرہ بند کر دیا اور وہیں کھڑے کھڑے پستول کا رخ میری طرف کئے بولا۔ "تمہیں کس نے بھیجا ہے؟" مجھے پستول کا کوئی خطرہ تو تھا نہیں۔ میرے ہاتھ کی انگوٹھی میری حفاظت کر رہی تھی۔ میں نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تو اس نے فائر کر دیا۔ گولی میری گردن کے قریب سے نکل گئی۔ قدرتی طور پر میں جان بچانے کی کوشش کرتے ہوئے اس پر جھپٹا۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ مگر وہ ٹرینڈ جاسوس تھا اور اسے کمانڈو کی ٹریننگ بھی ملی ہوئی تھی۔ اس نے میری گردن پر ایسا ہاتھ مارا کہ میں پیچھے کو گرا۔ اس نے فوراً مجھے دبوچ لیا اور میری گردن میں نائیلون کی رسی ڈالی اور پوری طاقت سے مجھے چھ سات جھٹکے دیئے اور پھر اتنی زور سے رسی کو بل دیئے کہ اگر اتنا تو ن

کی بیٹی نے مجھے اپنی کراماتی انگوٹھی نہ دے رکھی ہوتی تو میرا زندہ رہنا ناممکن تھا۔

عام حالات میں میرے سانس کو رک جانا چاہیے تھا۔ مگر ایسا بالکل نہیں ہوا تھا۔ میرا سانس بڑی آسانی سے چل رہا تھا۔ میری گردن کی رگیں جیسے ایک دوسری سے مل گئی تھیں مگر مجھے سانس لینے میں ذرا سی بھی دشواری نہ ہو رہی تھی۔ میں نے موقع غنیمت جان کر اپنے آپ کو یوں ظاہر کیا جیسے میں مر گیا ہوں۔

میں نے حلق میں سے غرغراہٹ کی مصنوعی آواز پیدا کی اور آنکھیں بند کر کے ہاتھ پاؤں یوں ڈھیلے چھوڑ دیئے جیسے میری روح پرواز کر گئی ہے۔ میری یہ حالت دیکھکر یہودی جاسوس نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ میں نے گردن کو ایک طرف لٹکا دیا تھا۔ یہودی جاسوس نے میرے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ میں انکھیوں سے اسے تک رہا تھا۔ شاید اسے میرے دل کی دھڑکن بند محسوس ہوئی تھی۔ کیونکہ اس نے اطمینان سے سر کو آہستہ سے ہلایا اور پھر میری لاش کو پلنگ پر سے گھسیٹ کر کمرے کے کونے میں ڈالا اور اوپر ایک کمبل ڈال دیا۔ مجھے اس کے کمرے سے باہر جانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آہستہ سے کمبل ایک طرف ہٹا کر دیکھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ اندر آ گیا۔ میں نے کمبل چہرے کے اوپر کر لیا۔ اس نے پلنگ کے نیچے سے کوئی بکس گھسیٹ کر باہر نکالا اور پھر وائرلیس پر کسی سے کوڈ الفاظ میں باتیں کرنے لگا۔ میں کراماتی انگوٹھی کی وجہ سے وہ کوڈ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”یہاں کی خفیہ ایجنسی کو ہمارے خصوصی کوڈ کا علم ہو گیا ہے۔ ہاں۔ ان کا ایک ایجنٹ مجھ سے ہلاک ہو گیا ہے۔ تم جتنی جلدی ہو سکے یہاں آ جاؤ۔ پھر تم سے پوری بات ہو گیا۔

وہ بکس بند کر کے باہر چلا گیا۔ مجھے باہر سے کمرے پر تالا ڈالنے کی آواز سنائی دی۔ میں لاش کی شکل میں کمرے کے کونے میں پڑا تھا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس یہودی کا دوست کون ہے؟

☆......☆......☆

میں آپ کو اپنی آپ بیتی سنا رہا ہوں اور آپ اپنے دل میں ضرور سوچتے ہوں گے کہ یہ واقعات من گھڑت ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ ایسا سوچنے میں بالکل حق بجانب ہیں۔ جب یہ واقعات میرے ساتھ گذر رہے تھے تو مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ حقیقت میں ہو رہا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی میری گردن میں رسی ڈال کر اسے پوری طاقت کے ساتھ دبائے رکھے اور کم از کم ایک منٹ تک میری گردن کو اس پھندے میں جکڑے رکھے اور مجھ پر اسکا کوئی اثر نہ ہو۔ میرا سانس چلتا رہے۔ مجھے سانس لینے میں ذرا سی بھی دقت نہ ہو۔ ٹھیک ہے مجھے اخناتون کی بیٹی مصری شہزادی نے اپنی انگوٹھی ضرور دے رکھی تھی مگر یہ انگوٹھی مجھے رسی کے پھندے سے کیسے بچا سکتی تھی۔ لیکن ایسا ہو گیا تھا۔ یہودی جاسوس نے میرے دل پر بھی ہاتھ رکھ کر دیکھا تھا۔ یقیناً اس وقت میرے دل کی دھڑکن بھی اسے ساکت محسوس ہوئی تھی۔ تب ہی اس نے مجھے مردہ سمجھ کر میری لاش ایک طرف ڈال دی تھی اور اسکندریہ میں اپنے ساتھی اسرائیلی ایجنٹ کو وائرلیس پر خفیہ کوڈ میں میری موت کی خبر دی تھی اور اسے فوراً بلایا تھا۔ آج میں ان واقعات کو یاد کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سارے واقعات میرے ساتھ خواب میں گذرے ہوں۔ لیکن تب ایسا ایک لمحے کے لئے بھی مجھے محسوس نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ضرور محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے مجھ پر کوئی عمل پڑھ

رکھا ہے کیونکہ مجھے اپنا جسم پہلے کے مقابلے میں ہلکا محسوس ہونے لگا تھا۔

بہرحال میں آپ سے اتنا ضرور کہوں گا کہ میری کہانی سنتے ہوئے اس کے ہر واقعے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ ہماری ترقی یافتہ سائنس کی دنیا میں آج بھی کبھی کبھی ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر عقل بھی حیران پریشان رہ جاتی ہے اور جن کا عقل کے پاس کوئی جواز نہیں ہوتا۔

اب میں اپنی آپ بیتی آگے شروع کرتا ہوں۔

یہودی ایجنٹ جو اسکندریہ میں مصری باشندے کی حیثیت سے گھڑیوں کی مرمت کی دکان کرتا تھا اپنی طرف سے مجھے ہلاک کر چکا تھا۔ دکان کی پچھلی کوٹھڑی میں میری لاش پڑی تھی جس پر اس نے کمبل سا ڈال دیا تھا۔ دروازے پر باہر سے تالا لگا دیا گیا تھا۔ یہودی ایجنٹ عبت کامل کو اپنے ساتھی جاسوس یا ایجنٹ کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی آ گیا۔ دونوں میرے اوپر جھک گئے۔ وہ میری لاش کا معائنہ کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھول رکھی تھیں جس طرح بعض لاشوں کی کھلی ہوتی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ مجھے بھی اپنا جسم سخت سخت سا لگنے لگا تھا۔ دوسرے ایجنٹ کی چھوٹی چھوٹی سنہری مونچھیں تھیں اور اس نے آنکھوں پر گولڈن فریم والی عینک چڑھا رکھی تھی۔ وہ آپس میں عبرانی زبان میں باتیں کرنے لگے۔

گھڑی ساز یہودی نے کہا۔

''مصری خفیہ ایجنسی کو ہمارے کوڈ کا علم کیسے ہو گیا؟'' ہمیں فوراً ہیڈ کوارٹر کو اطلاع کرنی ہو گی۔''

دوسرا یہودی ایجنٹ بولا۔

''میں نے اطلاع کر دی ہے۔ کوڈ بدل دیا گیا ہے۔ لیکن تشویش کی بات یہ ہے کہ اگر یہاں کی خفیہ ایجنسی کو ہمارے کوڈ کا علم ہو گیا ہے تو یقیناً اسے ہمارے خفیہ ٹھکانوں اور ان ایجنٹوں کا بھی علم ہو گیا ہو گا جو اسرائیل کے لئے یہاں کام کر رہے ہیں۔ ان تک ابھی ہمارا تبدیل شدہ کوڈ نہیں پہنچا اور موجود خفیہ کوڈ میں ہم انہیں خبردار نہیں کر سکتے۔ خاص طور پر ہمارا جو ایجنٹ رابی شام میں دمشق کی بلند پہاڑی پر واقع بڑی توپوں کے خطرناک مورچوں کو تباہ کرنے کے اہم مشن پر کام

کر رہا ہے اس کو نئے کوڈ کی اطلاع دینے ہمیں خود جانا ہو گا۔''

کامل گھڑی ساز فوراً جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ دوسرا ایجنٹ کہنے لگا۔

''کل صبح کی فلائیٹ سے ہی تم دمشق روانہ ہو جاؤ اور اب تمہیں یہ اڈہ بھی بند کرنا ہو گا۔ یہاں کسی بھی وقت چھاپہ پڑ سکتا ہے اور تم پکڑے جا سکتے ہو۔''

''میں ابھی یہ جگہ چھوڑ دوں گا۔'' گھڑی ساز یہودی نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کہ شارون کے مصری کراؤن کا کیا بنے گا۔ وہ ابھی تک اسرائیل کے عجائب گھر میں نہیں پہنچا۔''

گھڑی ساز کہنے لگا۔

''وہ تو میں نے اپنے ماسٹر سپائی کے ہاتھوں دمشق میں رابی کے پاس ہی پہنچا دیا تھا۔''

دوسرے ایجنٹ نے کہا۔

''ٹھیک ہے رابی خود اسے تل ابیب پہنچانے کا انتظام کر لے گا۔ اب تم نئے خفیہ کوڈ کے نمبر کاغذ پر لکھ کر اپنے پاس رکھ لو۔ یہ تمہیں دمشق میں رابی کو پہنچانے ہوں گے۔''

کامل گھڑی ساز بولا۔ ''مگر میں نے رابی کو ابھی تک دیکھا نہیں ہے، ایجنٹ نے اسے رابی کا حلیہ بتاتے ہوئے کہا۔

''وہ نارمل سا آدمی ہے۔ درمیانہ قد ہے۔ گول چہرہ ہے۔ رنگ گندمی۔ سر کے درمیان میں بال نہیں ہیں۔ عمر پچاس کے قریب ہے۔ وہ تمہیں دمشق کے کریسنٹ کلب کے کافی لاؤنج میں بیرے کی وردی میں ملے گا۔ اس کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کے بائیں کان میں سوراخ ہے جس میں وہ چاندی کا تنکا ڈالے رکھتا ہے۔ اسے اپنا نمبر بتانا۔ پھر نیا کوڈ اس کے حوالے کر دینا۔ علاقے کے دوسرے ایجنٹوں کو وہ خود ہی خبر کر دے گا۔''

''اس لاش کو کہاں لے جائیں؟'' گھڑی ساز نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ہمارے کسی کام کی نہیں۔ اسے یہیں پڑی رہنے دو۔ میں پہلے جاتا ہوں۔ میرے بعد تم بھی یہاں سے نکل جانا۔ کل صبح کی فلائیٹ پر تمہیں دمشق چلے جانا ہو گا۔ میں تمہیں وہاں نہیں

ملوں گا۔ رابی کو میں خبر کر دوں گا کہ تم پہنچ رہے ہو۔"

یہ کہہ کر وہ کوٹھڑی سے تیزی سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد گھڑی ساز یہودی ایجنٹ باہر دکان پر گیا۔ وہ جلدی جلدی چیزیں ادھر ادھر سمیٹ رہا تھا۔ مجھے الماریوں کے دروازے اور دراز کھلنے بند ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر اندر آ کر اس نے پلنگ کے نیچے سے چھوٹے وائرلیس سیٹ کو بکس سے نکال کر کپڑے میں لپیٹا اور چلا گیا۔ باہر سے مجھے دکان کا دروازہ بند کرنے کی آواز آئی تو میں کمبل ہٹا کر اٹھ بیٹھا۔ تیزی سے کوٹھڑی سے نکلا۔ دکان میں باہر سے تالا لگا تھا۔ میں دکان میں بند ہو گیا تھا۔ مصری شہزادی یعنی اخناتون کی بیٹی کے تاج کا سراغ تو مجھے مل گیا تھا لیکن اب مجھے دمشق کی مضافاتی پہاڑی کے ان گن پوسٹوں یعنی توپوں کے مورچوں کی فکر تھی۔ جو ایک اسلامی ملک کی سلامتی کی ضامن تھیں اور جنہیں اسرائیلی ایجنٹ تباہ کرنے کا ناپاک منصوبہ بنا چکے تھے میں نے اس ناپاک منصوبے کو ناکام بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک مسلمان اور برادر اسلامی ملک کا خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے یہ میرا فرض بھی تھا۔ میں نے دل میں ایک پروگرام طے کر لیا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ میں گھڑی ساز یہودی ایجنٹ سے پہلے دمشق کے کریسنٹ کلب میں جا کر خطرناک یہودی جاسوس رابی سے ملوں۔ اس کے آگے اپنے آپ کو گھڑی ساز ایجنٹ ظاہر کروں۔ اسے نیا خفیہ کوڈ بتا دوں جو مجھے ازبر ہو گیا تھا اور اس سے قدیم مصری تاج حاصل کر لوں اور اس کے بعد یہ پتہ چلانے کی کوشش کروں کہ اسلام دشمن یہودی ایجنٹوں نے اسلامی ملک کے سب سے اہم توپ خانے کے مورچوں کو نقصان پہنچانے کی کیا سکیم تیار کر رکھی ہے۔ بازار میں لوگ آ جا رہے تھے۔ میں کسی کو خبر ہوئے بغیر وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ دکان کا دروازہ لوہے کا تھا۔ میں واپس کوٹھڑی میں آ گیا۔ پلنگ کے اوپر کرسی رکھ کر روشندان تک پہنچا۔ جھانک کر دیکھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا احاطہ تھا جہاں کھجور کے ایک درخت کے نیچے دو اونٹ بیٹھے تھے۔ میں نے اسی روشندان سے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا اور نیچے اتر کر کوئی رسی تلاش کرنے لگا۔

☆......☆......☆

تھوڑی سی کوشش کے بعد میں روشندان میں سے دوسری طرف احاطے میں اترنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے وہاں اترتے صرف ان دو اونٹوں نے ہی دیکھا جو کھجور کے نیچے بیٹھے بڑے اطمینان سے جگالی کر رہے تھے۔ اخناتون کی بیٹی کی دی ہوئی حیرت کے کمالات دکھانے والی انگوٹھی میری انگلی میں پڑی تھی۔ اسکا ایک کمال تو یہ تھا کہ میری جیکٹ کی جیب میں مصری پاؤنڈ کافی تعداد میں محفوظ تھے۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور سیدھا ایئر پورٹ پہنچ گیا۔ ایئر پورٹ کی عمارت کے سامنے والے بلاک میں ٹریول ایجنسیوں کے دفتر تھے۔ وہاں سے مجھے دو گھنٹے بعد قاہرہ سے دمشق روانہ ہونے والی فلائیٹ میں جگہ مل گئی۔ یہ وقت میں نے ایئر پورٹ کے کیفے میں گزارا۔ وقت مقررہ پر فلائیٹ پکڑی اور دمشق کی جانب روانہ ہو گیا۔

یہ شہر دیکھنے کا مجھے پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بغداد کے بعد دمشق کا شمار بھی الف لیلوی شہروں میں ہوتا ہے۔ اس شہر کی تاریخ بھی ہزاروں برس پرانی ہے۔ اس شہر نے قوموں اور تہذیبوں کے کتنے ہی عروج و زوال دیکھے ہیں۔ اب تو یہ بڑا ماڈرن شہر بن چکا ہے۔ پھر بھی اسلامی ثقافت کا رنگ غالب تھا۔ ایئر پورٹ کی عمارت اسلامی طرز تعمیر کا دیدہ زیب نمونہ تھی۔ میرے پاس سامان تو تھا نہیں انگوٹھی کے اثر سے میں وہاں کی عربی زبان شامی لہجے میں بڑی خوبی سے بولتا

تھا۔ چنانچہ مجھے وہاں کسی قسم کی اجنبیت یا پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ ائیرپورٹ کے سامنے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ایک کمرہ میں نے فرضی نام سے لے لیا۔ ایک گھنٹے بعد اپنے کمرے سے تازہ دم ہو کر نکلا اور ٹیکسی ڈرائیور کو کریسنٹ کلب چلنے کو کہا۔ یہ کوئی مشہور کلب تھا۔ کیونکہ ٹیکسی ڈرائیور نے آگے سے کوئی سوال نہ کیا اور ٹیکسی وہاں سے نکال کر ایک کشادہ سڑک پر ڈال دی جس کی دونوں جانب بلند عمارتیں اور درمیان میں کہیں کہیں سبزہ زار اور درخت تھے۔

گھڑی ساز یہودی ایجنٹ کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ کل کسی وقت وہاں پہنچے گا۔ اس کے آنے سے پہلے پہلے میں اپنا کام پورا کر لینا چاہتا تھا۔ پہلا کام تو کریسنٹ کلب میں ہیڈ رابی سے مصری تاج کے بارے میں پتہ کرنا تھا کہ وہ اس نے کہاں رکھا ہوا ہے۔ اسے اپنے قبضے میں لینا تھا۔ اس کے بعد شامی پہاڑی مورچوں کے خلاف یہودی انٹیلی جنس کے ناپاک منصوبے کے متعلق معلومات حاصل کرنی تھیں۔ صرف ایک ہی بات میرے حق میں جاتی تھی اور یہودی ایجنٹ رابی کا پورا اعتماد حاصل کرنے میں میری مددگار تھی کہ مجھے ان کا نیا خفیہ کوڈ معلوم تھا اور اسکندریہ سے اسے میرے بارے میں خفیہ پیغام بھی مل چکا تھا۔ اگرچہ یہ پیغام گھڑی ساز یہودی ایجنٹ شبت کامل کے بارے میں تھا لیکن اس کی جگہ میں وہاں پہنچ رہا تھا۔

ٹیکسی کریسنٹ کلب کے باہر جا کر رک گئی۔

باہر کچھ دوسری گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ میں شیشے کے دروازے میں سے گزر کر کلب کے ہال میں پہنچ گیا۔ یہاں ادھر ادھر صوفے لگے تھے اور باوردی ویٹر ہاتھوں میں ٹرے لئے چل پھر رہے تھے۔ دیواروں پر بھی قالین لٹکے ہوئے تھے۔ ایک طرف زینہ نیچے جاتا تھا۔ میں نیچے تہہ خانے میں آ گیا۔ یہ جگہ الف لیلے کا کوئی کمرہ لگتا تھا۔ شیشے کی ٹکیوں والے پردے لٹک رہے تھے۔ پرانی وضع کی کرسیاں اور تانبے کی میزیں بچھی تھیں۔ عورتیں اور مرد بیٹھے کافی پی رہے تھے اور دھیمی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ یہاں روشنی بھی ہلکی تھی۔ میری آنکھیں درمیانے قد کے گندمی رنگت والے ویٹر رابی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں ایک خالی میز کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک ویٹر دوسری

جانب سے میری طرف آیا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ یہودی ایجنٹ رابی تھا۔ اس کے ایک کان میں چاندی کا تنکا پڑا تھا۔ اس نے مجھ سے آرڈر لینا چاہا تو میں نے ایک کاغذ پر اسرائیلی انٹیلی جنس کا پہلے والا کوڈ لکھا اور کاغذ اس کے آگے کر دیا۔

کاغذ پر نظر ڈالتے ہی وہ ایکدم چوکس ہو گیا اور کاغذ کو جلدی سے اپنی جیب میں ڈالنے کے بعد میز پر رومال پھیرتے ہوئے عبرانی زبان میں بولا۔ "تمہیں تو کل صبح آنا تھا۔" میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"ہمارا خفیہ کوڈ بدل گیا ہے۔ اس لئے مجھے فوراً آنا پڑا۔ نیا کوڈ میرے پاس موجود ہے۔ لیکن میں تمہیں اور تم مجھے پہلی بار دیکھ رہے ہو۔ میں نے اپنی شناخت کرا دی ہے۔ تم بھی اپنی شناخت کراؤ اور کاغذ پر یہاں اپنا کوڈ نمبر اور نام لکھ دو۔"

اس کے ہاتھ میں آرڈر لینے والی چھوٹی سی کاپی تھی۔ اس نے کاپی پر کچھ لکھا اور کاغذ پھاڑ کر میرے آگے رکھ دیا۔ کاغذ پر اس کا خفیہ نام رابی اور خفیہ کوڈ نمبر لکھا تھا۔ میں نے کاغذ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور کافی کا آرڈر دیا۔ وہ چلا گیا۔ بس مجھے ایک ہی فکر لگی تھی کہ کہیں اس دوران اسکندریہ سے اصلی یہودی ایجنٹ شبت کا اسے ٹیلی فون نہ آ جائے کہ میں کل صبح تمہارے پاس دمشق پہنچ رہا ہوں۔ رابی فوراً میرے لئے کافی لے آیا اور میز پر کپ وغیرہ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"دس منٹ میں تم کافی ختم کر کے باہر آ جانا۔ کلب کے مین گیٹ سے دس قدم کے فاصلے پر تمہیں ایک سیاہ رنگ کی پرانی گاڑی کھڑی ملے گی۔ ڈرائیور نے سرخ پی کیپ پہنی ہو گی۔ اس گاڑی میں سوار ہو جانا۔ وہ تمہیں میرے پاس پہنچا دے گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں کافی بنانے لگا۔ دس منٹ میں میں نے کافی ختم کی اور وہیں بل کے پیسے رکھ کر اٹھا اور کریسٹ کلب کے باہر آ گیا۔ میں نے سڑک پر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ایک کالے رنگ کی فیٹ گاڑی کھڑی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ ڈرائیور نے سرخ پی کیپ پہن رکھی تھی۔ میں دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی گاڑی سڑک پر چل

پڑی۔ کئی بارونق بازار گذر گئے۔ گاڑی شہر سے باہر کھلے علاقے میں آ گئی تھی۔ یہاں اس نے نہر کا پل عبور کیا اور اس کے بائیں جانب اونچے اونچے درختوں کے ساتھ چھوٹی سڑک پر چلنے لگی۔ کچھ دور مجھے بے آباد جگہ پر ایک کچی چاردیواری میں کچھ درخت نظر آئے۔ گاڑی اس کچے احاطے میں جا کر رک گئی۔ میں گاڑی سے نکل آیا۔ سامنے ایک پرانا اک منزلہ مکان تھا جس کے محرابی دروازے پر کوئی پھول دار بیل چڑھی ہوئی تھی۔ یہاں مجھے رابی دکھائی دیا۔ وہ عام شامی عربوں کے لباس میں تھا۔ وہ مجھے راہداری سے گذار کر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آیا جہاں فرش پر قالین بچھا تھا اور ایک پرانا صوفہ بھی پڑا تھا۔ رابی نے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ابھی پستول نکال کر میری طرف مڑے گا اور کہے گا۔ میں جانتا ہوں تم ثبت کامل نہیں ہو۔ اسکندریہ سے نمبر ٹو نے فون پر بتا دیا ہے کہ ثبت کل صبح آئے گا۔ اور پھر وہ مجھ پر فائر کر دے گا۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ اس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایک الماری کا تالا کھول کر چمڑے کا تھیلا نکال لایا۔ اس میں سے نیلے رنگ کی ایک چھوٹی نوٹ بک نکالی اور میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ہیڈ کوارٹر نے نیا کوڈ کونسا دیا ہے؟ مجھے لکھوا دو اور اسکندریہ والی تمہاری دکان کا کیا بنا؟ تم مصری پولیس سے کیسے بچ کر نکل آئے؟"

میں نے کہا۔

"بس قسمت اچھی تھی۔ عین وقت پر نکل آیا۔ یہ کہانی بعد میں سنا دوں گا۔ تم کوڈ لکھو"

اور میں نے اسے نئے خفیہ کوڈ کے وہ سارے الفاظ لکھا دیئے جو یہودی ایجنٹ نے اسکندریہ والی دکان کی کوٹھڑی میں ثبت کامل کو بتائے تھے اور جنہیں میں نے اسی وقت یاد کر لیا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انگوٹھی کے اثر کی وجہ سے از خود مجھے یاد ہو گئے تھے۔ کوڈ نوٹ بک میں درج کر لینے کے بعد رابی نے ایک بار اسے غور سے پڑھا۔ پھر چمڑے کے تھیلے میں بند کر کے تھیلے کو الماری کے نچلے خانے میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ نوکر ہمارے لئے کافی لے آیا۔ میں نے رابی سے کہا کہ شارون نے جو مصری کراؤن اسرائیل بھجوانے کے لئے دیا تھا تمہارے پاس موجود ہے کیا؟

رابی بولا۔ "ہاں۔ وہ تو اسی الماری میں پڑا ہے۔ ابھی اسے تل ابیب پہنچانا مشکل ہے۔ ایک تو چیکنگ زیادہ ہو گئی ہے دوسرے ہمارا پرانا کوڈ اوپن ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے پاس ایک آدمی ہے جو اسے اسرائیل لے جائے گا۔" رابی نے کہا۔ "ٹھیک ہے وہ تم ابھی لے جاؤ۔" مگر میں مصری تاج کے سلسلے میں زیادہ بے تابی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے شامی پہاڑی والی توپوں کی پوسٹوں کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ ان مورچوں کے بارے میں اسرائیلی انٹیلی جنس کے ناپاک منصوبوں کی میں زیادہ سے زیادہ جلد از جلد تفصیل معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اتنے میں ساتھ والے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رابی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں پریشان ہو گیا۔ کہیں بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اور رابی کو معلوم نہ ہو جائے کہ میں اصلی یہودی ایجنٹ نہیں ہوں۔ چار پانچ منٹ بعد وہ پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔ میرے پاؤں تلے سے جیسے زمین کھسک گئی۔ کیا اسے میرے بارے میں پتہ چل گیا ہے؟



یہودی ایجنٹ رابی میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

یقیناً اسے پتہ چل گیا تھا کہ میں دشمن کا بھیجا ہوا آدمی ہوں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولا۔ ”تم بڑے صحیح وقت پر آئے ہو۔ ابھی ایجنٹ نمبر سات کا فون آیا ہے۔ وہ ہمارا ماسٹر سپائی ہے۔ وہ تھوڑی دیر بعد دمشق میں کام کرنے والے سارے اسرائیلی ایجنٹوں کو شامی گن بوسٹوں کے سیکرٹ مشن کے بارے میں بڑے اہم احکامات دینے والا تھا۔ اسے نئے کوڈ کا بالکل علم نہیں تھا۔ اگر وہ پرانے کوڈ کو استعمال کرتا تو شامی انٹیلی جینس کو فوراً خبر ہو جاتی اور صبح تک ہم سب کو پھانسی مل چکی ہوتی۔ میں اسے نیا کوڈ فون پر نہیں بتا سکتا۔ تم فوراً اس کے پاس پہنچو اور نیا خفیہ کوڈ اسے بتا دو۔“ میں نے سکون کا سانس لیا کہ کم از کم میرا راز نہیں کھلا تھا۔ میں نے کہا۔

”مگر میں نے نمبر سات کی شکل نہیں دیکھی۔

اس نے میری طرف مشتبہ انداز میں دیکھا اور بولا۔

”تم کیسے ایجنٹ ہو کہ تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ ہم سارے ایک دوسرے کے نمبر جانتے ہیں شکل اتفاقاً دیکھتے ہیں۔“

میں نے فوراً سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو مجھے معلوم ہے مگر یہ خفیہ کوڈ کا معاملہ ہے۔“

رابی نے میرے کندھے کو آہستہ سے تھپتھپا کر کہا۔ ”تم اسے اپنا خفیہ کوڈ نمبر بتا دینا۔ پھر اس کا کوڈ نمبر پوچھنا۔ وہ تمہیں جنوبی دمشق میں واقع القاسم شاپنگ پلازہ میں ملے گا۔ وہاں اسکا الجمال سٹور ہے۔ وہ کریم شامی کے نام سے مشہور ہے۔ میں نے بھی اسے صرف ایک ہی مرتبہ دیکھا ہے۔ میں تمہیں اسکا تھوڑا سا حلیہ بتائے دیتا ہوں۔“

رابی نے مجھے کریم شامی کا حلیہ بتایا اور پھر وہاں سے نکل جانے کو کہا۔ مگر میں مصری شہزادی کا تاج بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے رابی سے کہا کہ شارون والا تاج مجھے دے دو تاکہ میں اسے اپنے اعتماد والے آدمی کے ہاتھ اسرائیل پہنچا دوں۔ رابی مجھے اپنا ہی آدمی سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے کوئی اعتراض نہ کیا اور تاج میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اسے سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیا اور وہاں سے چل دیا۔ القاسم شاپنگ پلازہ تک پہنچنے میں مجھے کوئی دقت نہ ہوئی۔ یہ بڑی بارونق اور ماڈرن قسم کی مارکیٹ تھی جہاں ہر قسم کی دکانیں اور سٹور موجود تھے۔ میں الجمال سٹور پر پہنچ گیا۔ رابی نے مجھے یہودی ماسٹر ایجنٹ کا جو حلیہ بتایا تھا اس حلیے کا ایک درمیانی عمر اور درمیانے قد کا بھاری جسم والا آدمی عربی لباس میں ملبوس کاؤنٹر کے پاس آرام کرسی پر بیٹھا بڑے اطمینان کے ساتھ قہوہ پی رہا تھا۔ میں نے اپنا خفیہ کوڈ نمبر پہلے ہی سے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھ رکھا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے خاموشی سے کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ شامی نے جلدی سے کاغذ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور میری طرف دیکھا۔ میں نے عربی میں کہا۔

”اس کاغذ کی دوسری طرف اب تمہیں اپنا کوڈ نمبر لکھنا ہے۔ میں تمہارے لئے ایک خاص پیغام لایا ہوں۔“

اسے رابی کا ٹیلی فون پہنچ چکا تھا۔ شیخ شامی نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر کاغذ کی دوسری طرف اپنا کوڈ نمبر لکھ کر کاغذ مجھے دے دیا۔ یہی وہ خطرناک یہودی ماسٹر سپائی تھا۔ جو وہاں شیخ شامی کے فرضی نام سے کاروبار چلا رہا تھا اور یہودی ملک کے لئے جاسوسی کرتا تھا۔ وہ مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں لے گیا جو سٹور کے اوپر تھا۔ یہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ میں اس خطرناک یہودی

جاسوس سے جتنی جلدی ہو سکے شامی گن پوسٹوں کے منصوبے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ دن ڈھلنے لگا تھا اور شام کی فلائیٹ سے اسکندریہ کے یہودی ایجنٹ کامل کو جیا کوڈ لے کر وہاں پہنچ جانا تھا اور یوں میرا راز طشت از بام ہونے کا لمحہ قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے اس ایجنٹ نمبر سات کو نیا کوڈ بتایا اور پھر فوراً ہی کہا کہ اسرائیلی ہیڈ کوارٹر کی طرف سے شامی گن پوسٹوں کے منصوبے میں یہاں کی سیاسی صورت حال کے مطابق کچھ ترمیم اور اضافے کئے گئے ہیں۔ مجھے ماسٹر پلان دکھاؤ تاکہ میں ان میں ترمیم و اضافہ کر سکوں۔

اس یہودی کو میرے اسرائیلی ایجنٹ ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے کتابوں کے شیلف میں سے دو چار کتابیں باہر نکال کر کسی جگہ کوئی بٹن دبایا۔ شیلف ایک طرف کھسک گیا۔ اس کے پیچھے لوہے کی چھوٹی سی الماری دیوار میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس الماری میں سے اس نے شامی گن پوسٹوں کو تباہ کرنے کا خفیہ اسرائیلی منصوبہ نکال لیا جو ایک نیلے تہہ کئے ہوئے کاغذ کی شکل میں تھا۔ ماسٹر پلان اس نے میرے سامنے کھول کر رکھ دیا اور بولا۔

''اس میں جو ترمیم و اضافے کرنے ہیں۔ مجھے بتا دو۔''

نیلے کاغذ پر گن پوسٹوں کا پورا نقشہ بنا ہوا تھا اور ان جگہوں کی بھی نشان دہی کی گئی تھی جہاں سے یہودی ایجنٹوں نے اپنی تخریبی کاروائیاں شروع کرنی تھیں۔ میں خوش بھی ہوا اور حیران بھی کہ یہودی انٹیلی جنس نے برادر اسلامی ملک شام کے خلاف کس قدر گھناؤنی سازش تیار کر رکھی تھی۔ میں اس نقشے کو کسی حالت میں بھی وہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ میں ابھی اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ اس نقشے کو کس طریقے سے قابو میں کروں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

شیخ شامی نے ریسیور اٹھا کر بڑی خوش اخلاقی سے اپنا نام بتایا۔ اس کے ساتھ ہی اسکا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ مگر دوسرے لمحے یہ سنجیدگی بھی غائب ہو گئی۔ وہ ہنس ہنس کر کسی سے عربی میں باتیں کرنے لگا۔ اس نے تین چار بار کہا۔ ٹھیک ہے۔ تم اوپر آ جاؤ۔ سب اچھا ہے۔ میں نے خیال

کیا کہ یہ بھی کوئی یہودی ایجنٹ ہی ہو گا۔ شیخ شامی نے فون بند کر دیا۔ کہنے لگا۔ ''اپنا ہی آدمی ہے۔'' پھر اچانک اس نے اپنے لبادے کے اندر ہاتھ ڈالا اور دوسرے لمحے پستول تان لیا۔

''جہاں بیٹھے ہو وہیں بیٹھے رہو۔ تمہاری حقیقت کھل گئی ہے۔ تم اسکندریہ کے کامل شبت نہیں ہو۔ اور یہاں سے تم زندہ بچ کر نہیں جاؤ گے۔''

دوسرے لمحے دروازہ کھلا اور سامنے اسکندریہ والا گھڑی ساز اسرائیلی ایجنٹ شبت کامل ہاتھ میں پستول لئے کھڑا تھا۔ میری طرف دیکھتے ہی چیخ کر کہا۔

''اسے تو ہم نے گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔ یہ زندہ کیسے بچ گیا؟''

شیخ شامی بولا۔

''تمہیں اسکی گردن کاٹنی چاہئے تھی۔''

''اب کاٹ دیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر شبت کامل نے اپنے سائی لینسر والے پستول میں سے اوپر تلے دو گولیاں فائر کر دیں۔ اب مجھے مرجانے کی اداکاری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مجھے وہاں سے شامی گن پوسٹوں کے پلان کو اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ دونوں گولیاں میرے جسم میں سے گذر گئیں مگر مجھے ذرا سی بھی خبر نہ ہوئی۔ نہ درد ہوا نہ خون نکلا اور نہ جسم پر کسی جگہ گولیوں کا نشان ہی بنا۔ میں اپنی جگہ پر ویسے ہی بیٹھا رہا۔ دوسرا یہودی ایجنٹ یہ سمجھا کہ شاید شبت کامل کا نشانہ خطا ہو گیا ہے۔ اب اس نے اپنے سائی لینسر والے پستول سے مجھ پر دھڑا دھڑ چار گولیاں چلا دیں۔ یہ گولیاں بھی میری گردن اور سینے سے نکل گئیں۔ اور مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب تو دونوں گھبرا سے گئے۔ پہلا ایجنٹ چلایا۔

''اس نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی ہے۔''

اور اس کے ساتھ ہی وہ مجھے دبوچ کر ہلاک کرنے کی نیت سے میری طرف بڑھے۔ یہ سارا کرشمہ اخناتون کی بیٹی کی دی ہوئی انگوٹھی کا تھا کہ مجھ پر چلائی گئی گولیاں بے اثر رہی تھیں۔ اس انگوٹھی کی وجہ سے میری طاقت میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب میں نے ان

دونوں کو گردنوں سے پکڑ کر پیچھے کو دھکیلا تو وہ یوں دیوار سے ٹکرائے جیسے کسی نے انہیں پوری طاقت سے دیوار کے ساتھ پٹخ دیا ہو۔ وہ منہ کے بل فرش پر بے ہوش پڑے تھے۔ میں ان اسلام دشمن ایجنٹوں کو زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ سب سے پہلے میں نے نقشے کو اپنے قبضے میں کیا اور پھر ان دونوں تخریب کاروں کو ختم کر دیا۔

مصری تاج پہلے ہی میرے پاس تھا۔ اب نہایت اہم دستاویز وہ نقشہ بھی میرے پاس تھا جسے مجھے حکومت شام کے حوالے کرنا تھا۔ شاپنگ پلازہ سے باہر آ کر میں نے ٹیکسی پکڑی اور قریبی پولیس سٹیشن کا رخ کیا۔

☆......☆......☆

پولیس سٹیشن پہنچ کر جب میں نے انسپکٹر پولیس سے شامی انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انسپکٹر پولیس نے پہلے تو مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"تمہیں ان سے کیا کام ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ کام میں صرف انہیں ہی بتانا چاہتا ہوں۔"

انسپکٹر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ گورنمنٹ سیکریٹریٹ چلے جائیں۔" "میں آپ کی بس یہی مدد کر سکتا ہوں۔"

وہ معذرت کرنے میں حق بجانب تھا۔ ڈائریکٹر انٹیلی جنس کا عہدہ بڑا احساس عہدہ ہوتا ہے۔ میں وہاں سے نکل کر پبلک کال آفس میں آ گیا۔ وہاں ڈائریکٹری سے ڈائریکٹر انٹیلی جنس کا فون نمبر معلوم کیا اور اسکے آفس میں فون کر دیا۔ سیکرٹری نے جواب دیا کہ وہ میٹنگ میں ہیں۔ پتہ نہیں کب فارغ ہوں گے۔ یہ مجھے ٹالنے کے لئے تھا۔ تب میں سیدھا سیکرٹریٹ پہنچ گیا۔ یہاں بھی مجھے ڈائریکٹر انٹیلی جنس کو ملنے سے روک دیا گیا۔ مجھ سے بار بار یہی پوچھا جاتا کہ میں مسٹر

جواد تھی سے کیوں ملنا چاہتا ہوں۔ اس زمانے کے شامی انٹیلی جنس کے سربراہ کا یہی نام تھا۔ میری مشکل یہ تھی کہ میں سوائے مسٹر جواد تھی کے دوسرے کسی شخص کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ مصری کراؤن میری کوٹ کی ایک جیب میں تھا اور دوسری جیب میں شامی توپوں کے مورچے کا وہ نقشہ تھا جسے یہودی تخریب کاروں نے بنایا تھا اور جس میں ان جگہوں کی بھی نشان دہی کر دی گئی تھی جہاں جہاں تخریب کاروں نے بڑے طاقتور بم لگا رکھے تھے۔ ان بموں کو ایک خاص وقت پر بیک وقت پھٹ کر ان مورچوں کو تباہ کر دینا تھا۔

میرا شامی خفیہ ایجنسی کے سربراہ سے ملنا بہت ضروری تھا اور وہ لوگ سیکورٹی کے پیش نظر مجھے اندر نہیں گھسنے دے رہے تھے۔ آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آ گئی۔ میں نے سیکورٹی آفیسر سے کہا۔

''میں جواد تھی کا بڑا قریبی رشتے دار ہوں اور مجھے ان کو ایک بڑا ضروری گھریلو پیغام دینا ہے۔ میری ان سے فون پر ہی بات کرا دیجئے۔''

سیکورٹی آفیسر نے جواد تھی کے آفس کا نمبر گھمایا۔ اسکا سیکرٹری ہی بولا۔ سیکورٹی آفیسر نے اسے میری بات بتا کر کہا۔

''چیف سے اس کی دو سیکنڈ کے واسطے بات کرا دو۔ کوئی بڑا اہم گھریلو معاملہ لگتا ہے۔''

دوسرے لمحے سیکورٹی چیف نے رسیور میری طرف بڑھا دیا اور کہا۔

''چیف ابھی بولیں گے۔ تم خود ہی جلدی سے انہیں پیغام دے دو۔''

میں نے رسیور کان سے لگایا ہی تھا کہ دوسری طرف سے کسی مرد کی بھاری آواز سنائی دی۔

''کون ہو تم؟ کیا پیغام لے کر آئے ہو؟''

میں نے فوراً کہا۔

''سر! میں دمشق کی پہاڑی والی گن پوسٹوں کے سلسلے میں ایک بڑی اہم دستاویز لایا ہوں یہ ملک کی سیکورٹی کا معاملہ ہے۔''

دوسری طرف ایک پل کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر چیف کی آواز آئی۔ ''فون سیکورٹی آفیسر کو دو'' میں نے جلدی سے رسیور سیکورٹی آفیسر کے حوالے کر دیا۔ اس نے بڑے ادب سے پوچھا۔ ''کیا حکم ہے سر؟''۔ جی۔ ٹھیک ہے سر!۔''

رسیور رکھتے ہوئے سیکورٹی آفیسر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

''میرے ساتھ آؤ''

وہ مجھے نہ جانے کن کن راہ داریوں اور آفس بلاکوں سے گزارتا ہوا ایک پرانی سی عمارت میں لے آیا جس کے بند گیٹ پر دو فوجی رائفلیں لئے کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ ایک فوجی آفیسر بند دروازے کی دوسری جانب بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ہمیں آتا دیکھ کر اس نے گیٹ کھولنے کا اشارہ کیا۔ وہاں میری تلاشی لی گئی۔ میری ایک جیب سے مصری تاج اور دوسری جیب سے دستاویز نکلی۔ میں نے کہا۔

''یہ دونوں چیزیں مجھے چیف کو پیش کرنی ہیں۔''

دونوں چیزیں میرے پاس ہی رہنے دی گئیں۔ پھر مجھے ایک بڑے کمرے میں داخل کر دیا گیا جس کی دیوار پر شامی صدر کی قد آدم تصویر لگی تھی۔ تصویر کے آگے بہت بڑی میز لگائے ایک لحیم، شحیم آدمی انگریزی سوٹ پہنے بیٹھا فائل میں کچھ لکھ رہا تھا۔ میں کرسی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا یہ شامی انٹیلی جنس کا چیف جواد تھی تھا۔ اس نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھی اور میری طرف دیکھا۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھ سے شامی توپوں کی پوزیشنوں کے بارے میں کچھ پوچھتا مجھے حیرت کے عالم میں تکتا ہی چلا جا رہا تھا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آیا۔ ہاتھ سے میری ٹھوڑی کو اوپر اٹھا کر میرے چہرے کو غور سے دیکھا اور تعجب سے بولا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا ڈراما کر رہا ہے۔ آخر میں نے پوچھ ہی لیا کہ بات کیا ہے جناب؟ آپ مجھے اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

وہ تیزی سے اپنی کرسی کی طرف مڑا۔ دراز میں سے ایک فائل نکال کر اسے کھولا اور اس میں سے ایک تصویر اٹھا کر میرے سامنے رکھ دی۔

''اسے دیکھو۔ کیا یہ تمہاری تصویر نہیں ہے؟''

تصویر بلیک اینڈ وائٹ تھی۔ پہلی نظر دیکھنے سے وہ مجھے اپنی تصویر لگی۔ مگر اس کے نیچے دایان ابراہام لکھا ہوا تھا۔ لیکن میری شکل کے ساتھ غضب کی مشابہت تھی۔ یہ نوجوان سیاہ جرسی پہنے تھا اور کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ میری اور اس کی شکل میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف مونچھوں کا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں جبکہ میری مونچھیں نہیں تھیں۔ چیف جواد نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور انٹرکام پر کسی کو کافی لانے کو کہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ ''پہلے تم اپنا تعارف کراؤ اور یہ بتاؤ کہ تم ہماری پہاڑی والی گن پوزیشنوں کے بارے میں کیا بات کرنے آئے ہو؟''

میں نے اسے شروع سے آخر تک اپنی کہانی سنا ڈالی اور پھر جیب سے اسرائیلی ایجنٹوں سے حاصل کیا ہوا نقشہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ نقشے کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ میں نے اسے ان یہودی ایجنٹوں کے ٹھکانے بھی بتا دیئے جو شام میں رہ کر تخریب کاری کر رہے تھے۔ چیف جواد نے فوراً فون پر کسی متعلقہ شخص کو میرے بتائے ہوئے ٹھکانوں کا پتہ بتا کر حکم دیا کہ ان جگہوں پر فوراً چھاپے مار کر دشمن کے ایجنٹوں کو گرفتار کیا جائے۔ ساتھ ہی اس نے ڈیفنس کے محکمے کے کسی افسر کو سیکرٹ لائین پر بتا دیا کہ دشمن نے پہاڑی والی گن پوزیشنوں پر کہاں کہاں ڈائنامائٹ لگا رکھا ہے۔ اتنے میں کافی آ گئی۔ چیف نے ریسیور رکھا اور میرے لئے کافی بناتے ہوئے بولا۔

''تم نے یہ اطلاعات بروقت پہنچا کر ہمیں ایک بہت بڑی تباہی سے بچا لیا ہے۔''

میں نے کہا۔

''ایک برادر اسلامی ملک کو دشمن کی تخریب کاریوں سے بچانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔''

چیف نے میرے ہم شکل کی تصویر کو میرے آگے کھسکاتے ہوئے کہا۔

''تم نے خود دیکھ لیا ہوگا کہ اس شخص کی شکل تم سے کس قدر حیرت انگیز طور پر ملتی ہے۔''

''مگر یہ کون ہے۔ یہ میں نہیں ہوں۔''

اس پر چیف نے تصویر اپنی طرف کر لی اور بولا۔

''یہ ایک بڑا ہی خطرناک اسرائیلی جاسوس دایان ابراہام ہے جس کو ہم نے آج صبح ہی گرفتار کیا تھا مگر اس سے پہلے کہ ہم پوچھ گچھ کرتے اس نے اپنے منہ میں چھپا کر رکھا ہوا زہریلا کیپسول نگل کر خودکشی کر لی۔ اس کی لاش اس وقت بھی سردخانے میں پڑی ہے۔ یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہم نے ابھی تک اس خطرناک اسرائیلی ایجنٹ کی گرفتاری کا سرکاری طور پر اعلان نہیں کیا تھا۔ ورنہ اب جو منصوبہ میں نے تیار کیا ہے وہ دھرے کا دھرا رہ جاتا۔ ابھی تک اسرائیلی حکومت کو یہی معلوم ہے کہ ان کا ایجنٹ دایان ابراہام زندہ ہے۔''

میں نے اپنے اس ہم شکل میں کوئی دلچسپی نہ لی اور جب کافی کی پیالی خالی کر کے اجازت لینے لگا تو چیف جواد کرسی چھوڑ کر میرے پاس آ گیا۔ میرے سامنے والی کرسی آگے کر کے اس پر بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بولا۔

''تم نے برادر اسلامی ملک کے لئے جو کام کیا ہے ہم اس کے لئے تمہارے بے حد مشکور ہیں مگر ہم پر تمہیں ایک احسان کرنا ہوگا۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔ چیف جواد نے دھیمے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''تمہیں دایان ابراہام کے روپ میں اسرائیل جانا ہوگا۔''

میں نے چونک کر چیف جواد کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ''یہ ایک برادر اسلامی ملک کی سالمیت اور بقا کا مسئلہ ہے۔'' میں چپ ہو گیا۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ اس نے مجھے کرسی سے اٹھا کر اپنے گلے لگا لیا اور کہنے لگا۔ ''میرے ساتھ آؤ میں تمہیں تمہارے ہم شکل کی لاش دکھاتا ہوں۔''

☆......☆......☆

شامی ڈائریکٹر انٹیلی جنس جوادفہمی مجھے پولیس سٹیشن کے ایک خاص کمرے میں لے گیا جو بے حد ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ یہاں سٹریچر پر سفید چادر سے ڈھکی ہوئی اسرائیلی ایجنٹ دایان کی لاش پڑی تھی۔ فہمی نے لاش کے منہ پر سے چادر ہٹائی تو سب سے پہلے مجھے جو حیرت انگیز احساس ہوا وہ یہ تھا کہ میں مر چکا ہوں اور یہ میری اپنی لاش ہے۔ فرق بس اتنا ہی تھا جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ لاش کی مونچھیں تھیں جبکہ میری مونچھیں نہیں تھیں۔ باقی تمام مماثلت حیرت میں ڈالنے والی تھی۔ ناک نقشہ ہو بہو میرے جیسا تھا۔ فہمی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ تم ایک برادر اسلامی ملک کی سالمیت کے واسطے کتنا اہم کردار ادا کر سکتے ہو۔"

اس نے لاش کا منہ چادر سے ڈھانپ دیا۔ ہم ایک دوسرے کمرے میں آ گئے جہاں فہمی نے مجھے اسرائیلی ایجنٹ کی آواز کی ٹیپ سنائی۔ اس کی اور میری آواز میں تھوڑا فرق ضرور تھا۔ اسکی آواز ذرا بھاری تھی۔ فہمی بولا۔

"اسکا علاج ہمارے پاس ہے۔ ہم تمہاری آواز میں بھاری پن پیدا کر دیں گے۔ مگر سب سے پہلے تمہیں اپنی خوشنودی اور مرضی کا اعلان کرنا ہوگا کہ تم اس مشن کے لئے تیار ہو۔ کیونکہ

یہ بہر حال ایک خطرناک مشن ہوگا۔ ابھی ہمیں تمہیں اسرائیلی زبان بھی سکھانی ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "اس زبان پر مجھے پورا عبور حاصل ہے۔"

اس پر جوادفہمی خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے مجھے گلے لگا لیا اور کہنے لگا۔

"اس سے زیادہ ہماری خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ بس اب ہماری اور ایک مسلمان ملک کے جائز مفادات کی خاطر ہاں کہہ دو۔"

میں نے کہا۔ "جب معاملہ ایک مسلمان ملک کا درپیش ہو تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔"

یہ سنتے ہی شامی سیکرٹ سروس کے انچارج نے میرا ماتھا چوم لیا اور مرحبا مرحبا کہنے لگا۔

ہم اس کے کمرہ خاص میں آ گئے۔ پہلی بات اس نے مجھے یہ کہا کہ آج کے بعد میں اپنی مونچھیں بڑھانا شروع کر دوں تاکہ اسے اسرائیلی ایجنٹ کی مونچھوں کے مطابق بنایا جائے۔ پھر اس نے ایجنٹ دایان کی پوری فائل کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔ اس فائل میں اس شخص کا پورا شناخت نامہ یعنی بائیو ڈیٹا درج تھا۔ وہ کہاں پیدا ہوا۔ کہاں کہاں اس نے تعلیم حاصل کی۔ کہاں کہاں ملازمت کی۔ پھر کس طرح اسرائیلی سیکرٹ سروس میں آیا۔ اس کی منگیتر کا کیا نام ہے۔ اس کی منگنی ہوئے کتنی دیر ہو چکی ہے۔ پھر اس کی ایک وڈیو فلم بھی مجھے دکھائی گئی۔ مجھے اس کے چلنے پھرنے، بات چیت کرنے اور اٹھنے بیٹھنے کے انداز کو کاپی کرنا تھا۔ فہمی کہنے لگا۔

"یہ سارا ریکارڈ ہم نے اس لئے جمع کر لیا تھا کہ یہ اسرائیل کا ماسٹر سپائی تھا۔ ہمیں کسی بھی وقت اسکی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ لیکن اس عیار نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خودکشی کر لی اور ہمیں علم نہ ہو سکا کہ ایک خفیہ زہریلا کیپسول اس نے اپنی ایک ڈاڑھ کے نیچے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ بہر حال اب صورت حال کچھ یوں ہے کہ تمہیں ایک خاص مقام پر لے جایا جائے گا۔ جہاں کم از کم ایک ماہ تک تم اس اسرائیلی ایجنٹ دایان کی وڈیو فلم دیکھ کر اس کی نقل و حرکت کو کاپی کرنے کی مشق کرو گے۔ وہیں تمہاری آواز کو ایک معمولی سے آپریشن کے بعد دایان کی آواز کے مشابہہ بنایا جائے گا۔ ہمیں اسرائیلی سیکرٹ ایجنسی کا کوڈ معلوم ہے تم اس کوڈ کی مدد سے تل ابیب کے سیکرٹ

سروس کے ہیڈ کوارٹر میں اپنی گرفتاری اور پھر فرار کا سگنل دو گے۔ اس سے پہلے ہم یہاں کے اخباروں میں یہ خبر چھپوا دیں گے کہ اسرائیل کا ایک خطرناک جاسوس ہماری قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کے بعد تمہارا اصل مشن شروع ہوگا۔ کیا تم اس سارے خطرناک منصوبے کے واسطے اپنے آپ کو تیار پاتے ہو؟"

میں اب اسے انکار کیسے کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک برادر مسلمان ملک کی سالمیت کا مسئلہ تھا اور میں اس منصوبے پر دل وجان سے عمل کرنے اور اپنی زندگی تک خطرے میں ڈالنے کو تیار ہو چکا تھا۔ میرے جواب پر فہمی بڑا خوش ہوا۔ مگر مجھے سب سے پہلے ایک کام کرنا تھا۔ اخناتون کی بیٹی کی امانت یعنی اسکا تاج میرے پاس تھا اور وہ مجھے ہر حالت میں اس تک پہنچانا تھا۔ میں نے شامی سیکرٹ سروس کے انچارج فہمی سے کہا کہ مجھے صرف دو دن کی چھٹی دی جائے۔ میرے پاس کسی کی امانت ہے۔ میں مصر جا کر اس تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا۔

"ضرور جاؤ۔ لیکن کوشش کرنا کہ دو روز میں واپس آ جانا۔ اتنی دیر میں ہم دایان کے فرار ہو جانے کی خبر اخباروں میں شائع کرا دیں گے۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ جس روز میں تاج لے کر قاہرہ پہنچا اس روز شام کے اخباروں میں یہ خبر چھپ گئی کہ ایک اسرائیلی جاسوس دایان ابراہام دمشق کی جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ شامی پولیس اس کی تلاش کے لئے سر توڑ کوشش کر رہی ہے۔ سورج غروب ہو چکا تھا جب میں سونے کے جڑاؤ تاج کو لفافے میں ڈالے اہرام میں داخل ہوا۔ اس اہرام کو کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ کیونکہ اس میں سے تمام قیمتی نوادرات نکال لئے گئے تھے۔ میں اہرام کی بھول بھلیوں سے گذرتا تہہ خانے میں اتر کر اس دالان میں پہنچ گیا جہاں اخناتون کی بیٹی کا تابوت موجود تھا۔ مگر اس کی حنوط شدہ لاش وہاں سے اٹھا دی گئی تھی۔ میں نے ٹارچ روشن کر رکھی تھی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کہ دالان کے کونے میں ہلکی نیلی روشنی سی ہوئی اور دوسرے لمحے اخناتون کی بیٹی ستون کے پیچھے سے نکل کر میرے سامنے آ گئی۔ اس نے شہزادیوں جیسا شاہانہ لباس پہن رکھا تھا

اور پورے جاہ وجلال میں تھی۔ میں نے اسکی امانت اسکا قیمتی تاج اس کی طرف بڑھایا تو وہ خوش ہو کر بولی۔

"تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔"

میں نے جواب میں کہا۔ "یہ میرا فرض تھا جسے میں نے پورا کیا۔ اور اب یہ انگوٹھی بھی میں تمہیں واپس کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ بھی تمہاری امانت ہے۔"

اس پر مصری شہزادی مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"اب تو تمہیں اسکی زیادہ ضرورت پڑے گی۔ کیونکہ تم اسرائیل میں جس مشن پر جا رہے ہو۔ وہاں قدم قدم پر تمہیں موت کا سامنا ہوگا۔"

اس بات پر مجھے زیادہ حیرت نہ ہوئی کہ مصری شہزادی کو میرے مشن کا پورا علم ہو چکا تھا۔ وہ ایک روح تھی اور روح کو ساری باتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ کہنے لگی۔

"اسے تم اپنے پاس ہی رکھو۔ تم یہ بات بھول گئے تھے کہ یہ انگوٹھی واپس کر دینے کے بعد تم نہ عربی اتنی روانی سے بول سکتے ہو نہ عبرانی۔"

تب مجھے احساس ہوا کہ اس انگوٹھی کا میرے پاس رہنا کسقدر ضروری تھا۔ مصری شہزادی سے رخصت لے کر میں واپس دمشق کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

جس وقت میں دمشق پہنچا تو اخبارات میں خطرناک اسرائیلی ماسٹر سپائی دایان ابراہام کے جیل سے فرار ہونے کی فرضی خبر نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع ہو چکی تھی۔ یہ میرے بطور اسرائیلی ایجنٹ دایان ابراہام کے اسرائیل کے ملک میں داخل ہونے کی پیش بندی تھی۔ میرا راستہ ہموار کر دیا گیا تھا۔ میں شامی سیکرٹ سروس کے انچارج جواد فہمی سے ملا تو اس نے اخبارات کھول کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ سگار سلگاتے ہوئے بولا۔

"تمام اخبارات نے تمہارے فرار کی خبر کو بڑا نمایاں کر کے چھاپا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میری شکل اسرائیلی ایجنٹ دایان سے اتنی ملتی ہے کہ اب اگر میں باہر نکلا تو خود تمہاری پولیس مجھے گرفتار کر لے گی۔ بلکہ ہو سکتا ہے مجھے خطرناک دشمن کے طور پر گولی بھی مار دی جائے۔"

فہمی مسکرایا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی اب ہم تمہیں لوگوں کے سامنے نہیں جانے دیں گے۔ کیونکہ یہاں بھی اسرائیل کے خفیہ ایجنٹ اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ اگر تمہیں کسی نے دیکھ لیا تو ہمارا سارا منصوبہ فلاپ ہو سکتا ہے۔ آج سے تمہیں تمہاری خفیہ کیمپ گاہ میں رکھا جائے گا۔ جہاں اپنے آئندہ مشن کے واسطے پوری طرح تیار کیا جائے گا۔"

یہ خفیہ کیمپ گاہ شہر سے باہر پہاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹا سا دو کمروں والا مکان تھا

جس کے نیچے ایک تہہ خانہ بھی تھا۔ اس تہہ خانے میں الیکٹرانکس کا وہ تمام ساز و سامان موجود تھا جسکی ضرورت تھی۔ جواد فہمی اور اس کے دو نائب افسر وہاں میرے ساتھ تھے۔ یہاں مجھے اس یہودی ماسٹر سپائی یعنی دایان ابراہام کی وڈیو فلم دن میں چار مرتبہ دکھائی جاتی جس کا بھیس بدل کر مجھے اسرائیل میں داخل ہونا تھا۔ اس فلم کی مدد سے میں دایان کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے، مسکرانے، سنجیدہ رہنے اور ہاتھوں کی حرکات کو کاپی کرنے کی مشق کرتا۔ اسی جگہ میرا گلے کا ایک چھوٹا سا آپریشن کیا گیا جس کے بعد میری آواز قدرے بھاری ہو گئی۔ اب میں بولتا تو میری اور یہودی جاسوس دایان کی آواز میں بہت ہی کم فرق محسوس ہوتا۔ مجھے تل ابیب سیکرٹ سروس کے ان تمام یہودی افسروں کی تصویریں دکھائی گئیں اور ان کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئیں جن کے ساتھ مجھے واسطہ پڑنے والا تھا۔ حسن اتفاق سے دایان ابراہام کے ماں باپ مر چکے تھے۔ اس کی صرف ایک بڑی بہن تھی جو کسی دوسرے شہر کے اکیلے مکان میں بیوگی کے دن گذار رہی تھی۔ جس لڑکی سے دایان جاسوس کی منگنی ہو چکی تھی اسکا نام نادیا تھا اور وہ تل ابیب کے ایک سکول میں استانی تھی مجھے نادیا کی تصویر دکھائی گئی اور اس لڑکی کے بارے میں جو ضروری باتیں شامی انٹیلی جنس کو معلوم ہو سکی تھیں مجھے بتا دی گئیں۔ اسرائیل سیکرٹ سروس کا ایک خفیہ کوڈ تھا جسے شامی انٹیلی جنس والوں نے کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیا ہوا تھا۔ مجھے اس خفیہ کوڈ سے بھی آگاہ کیا گیا۔

غرض کہ اس دور افتادہ پہاڑی کیمپ گاہ میں مجھے ایک مہینہ رکھا گیا اور بڑی سخت ٹریننگ دی گئی۔ ٹریننگ یہی تھی کہ میں زیادہ سے زیادہ کامیابی اور مہارت کے ساتھ اس یہودی جاسوس دایان کی حرکات و سکنات کی نقل اتار سکوں جسکی لاش جدید ترین کیمیکلز کے ذریعے ختم کر دی گئی تھی اور اس کی جگہ مجھے دایان ابراہام کے روپ میں تیار کیا جا رہا تھا۔ مجھے یہ ساری ہمت شکن ٹریننگ اس لئے دی جا رہی تھی کہ میں بطور یہودی ماسٹر سپائی دایان کے اپنا نقلی کردار بالکل اصلی طریقے سے ادا کر سکوں۔ کیونکہ میری ذرا سی بھی غلطی، معمولی سی بھول چوک مجھے فائرنگ سکواڈ کے سامنے

کھڑا کر سکتی تھی اور دشمن کی گولیوں سے پھر مجھے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

اس دوران میری مونچھیں بھی بڑھ آئی تھیں اور انہیں تراش کر مردہ دایان کی مونچھوں کی طرز کا بنا دیا گیا تھا۔ ایک مہینے کی کڑی مشقوں سے گذرنے کے بعد ایک دن شامی سیکرٹ سروس کے کچھ افسر وہاں آئے۔ ان میں جواد فہمی بھی تھا۔ ان لوگوں کے سامنے مجھے بطور یہودی سپائی دایان اپنی کامیاب اداکاری کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ سب سے پہلے سیکرٹ پر دایان کی دومنٹ کی فلم دکھائی گئی جس میں اسے جیل کی کوٹھڑی کے اندر ٹہلتے اور اٹھتے بیٹھتے اور پھر ایک شامی افسر سے گفتگو کرتے، اس کے سوالوں کے جواب دیتے دکھایا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے ان افسروں کے سامنے دایان کی پوری اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ مجھ سے ویسے ہی انداز میں جواد فہمی نے عبرانی زبان میں پوچھ گچھ کی۔ میں امتحان میں پاس ہوگیا۔ سب نے میری اداکاری اور کامیابی سے دایان کا بہروپ بھرنے کی تعریف کی اور مجھے مبارک باد دی۔

اب میں ایک مفرور اسرائیلی جاسوس کی حیثیت سے یہودیوں کے ملک اسرائیل میں داخل ہونے کے لئے بالکل تیار تھا۔ اب میرے خطرناک مشن کا اصل مرحلہ شروع ہوا یعنی مجھے اس مشن کی بریفنگ کی گئی جس پر میں اپنی جان کی بازی لگا کر صرف دین اسلام اور اپنے برادر اسلامی ملک کی خاطر روانہ ہونے والا تھا۔ مجھے دشمن کا وہ خفیہ کوڈ معلوم کرنا تھا جس کے معلوم ہو جانے کے بعد ان تمام اسرائیلی نیوکلر وار ہیڈ والے میزائیلوں کو تباہ کیا جا سکتا تھا جو دشمن نے قاہرہ دمشق اور بغداد میں گرانے کے لئے فکس کر رکھے تھے۔ یہ انتہائی خفیہ کوڈ تھا اور اسے کوڈ نمبر 2 کا نام دیا گیا تھا۔ یہ خفیہ کوڈ انتہائی اونچی سطح کے صرف چھ سات اسرائیلی افسروں کو ہی معلوم تھا۔ اسے کمپیوٹر میں فیڈ کر دیا گیا تھا اور اس کی مدد سے صرف ایک سرخ بٹن دبا کر اسلامی ملکوں کے بڑے بڑے شہروں پر دشمن نیوکلر میزائل گرا کر وہاں قیامت کی تباہی مچا سکتا تھا۔ جواد فہمی کہنے لگا۔

"انتہائی کوشش کے باوجود ہم یہ کوڈ نمبر 2 کا ابتدائی سراغ بھی نہیں لگا سکے۔ دایان کی

موت اور پھر تمہارے اس کے ہم شکل ہونے کی وجہ سے ہمیں پہلی بار یہ کوڈ معلوم کرنے کا سنہری موقع ملا ہے۔ اگر یہ کوڈ ہم تک پہنچ گیا تو ہمارے اسلامی ملک یہودیوں کی لائی ہوئی بھیانک تباہی سے محفوظ ہو جائیں گے۔ کیونکہ پھر ہم ان تمام میزائیلوں کو ان کے ٹھکانوں پر ہی بھسم کر سکیں گے۔"

میں نے کہا۔ "انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔ میں اپنے مسلمان بھائیوں کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دوں گا۔"

فہمی نے فوراً کہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ جان قربان کرنے کی نوبت آئے۔ تمہیں انتہائی ہوش مندی کے ساتھ زندہ رہ کر اپنے مشن کو مکمل کرنا اور ہمارے پاس زندہ سلامت واپس آنا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہم حق پر ہیں۔ خدا ہماری مدد کرے گا۔"

سٹیج تیار تھا۔ پردہ اٹھ گیا تھا اور وہ خطرناک ڈراما شروع ہونے والا تھا جس میں مجھے ایک ہم شکل یہودی جاسوس کا اہم ترین فرضی کردار ادا کرنا تھا۔ میرے اس فرضی کردار کی ناکامی نہ صرف میری اذیت ناک موت بلکہ تین برادر اسلامی ملکوں کے ناقابل تلافی نقصان پر ختم ہوسکتی تھی۔ اب وہ تاریخی رات آگئی جس کی تاریکی میں مجھے دشمن کی سرحد کے اندر داخل کیا جانا تھا۔ مجھے وہی کپڑے پہنا دیئے گئے جو یہودی ایجنٹ اور ماسٹر سپائی دایان نے گرفتاری کے وقت پہن رکھے تھے۔ وہ خط بھی میری جیب میں تھا جو دایان کی منگیتر نادیا نے ایک ماہ پہلے اسے لکھا تھا جو گرفتاری کے وقت دایان کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔ رات کے اندھیرے میں چھوٹے صحرائی ٹیلوں کے عقب میں ایک جگہ ہماری جیپ آکر رک گئی۔

☆......☆......☆

میرے ساتھ شامی ڈائریکٹر انٹیلی جنس جواد فہمی تھا جو خود جیپ چلا کر مجھے ان صحرائی ٹیلوں تک لایا تھا۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہمارے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ ستاروں کی دھندلی دھندلی روشنی میں ٹیلوں کی چوٹیوں کے خاکے سے نظر آ رہے تھے۔ گہری خاموشی چھائی تھی۔ مجھے کسی قسم کا اسلحہ نہیں دیا گیا تھا۔ میری شیو بڑھی ہوئی تھی۔ ہم جیپ سے اتر آئے۔ ایک ٹیلے کی آڑ میں کھڑے ہو کر جواد فہمی نے دور ٹمٹمانے والی دو تین روشنیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اسرائیلی سرحد کی روشنیاں ہیں۔ آگے تمہیں سب کچھ اکیلے ہی کرنا ہوگا۔ ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم ہر لمحے تمہاری کامیابی اور تمہاری زندگی کے لئے دعا کرتے رہیں گے۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے تم اچھی طرح جان گئے ہو۔ خدا حافظ۔ اللہ تمہارا نگہبان ہو۔''

اتنا کہہ کر جواد فہمی نے میرے کندھے کو آہستہ سے تھپتھپایا اور تیزی سے مڑ کر جیپ میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے واپس چل دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا اور مجھے ایک گہری اور پراسرار خاموشی نے گھیر لیا۔ یہ بھی اللہ کی شان اور اسکی رحمت تھی کہ میرے دل

سے ہر قسم کا خوف دور ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی اصلی شخصیت کو یکسر بھلا دیا تھا اور اپنے آپ کو دایان ابراہام یعنی یہودی ماسٹر سپائی ہی سمجھنے لگا تھا۔ جو شامی جیل سے فرار ہو کر اب اپنے وطن اسرائیل میں داخل ہونے والا تھا۔

میں نے ایک نظر دور ٹمٹماتی روشنیوں پر ڈالی۔ اپنی کامیابی کے واسطے اللہ سے دعا مانگی اور بسم اللہ پڑھ کر ٹیلوں کی اوٹ سے نکل کر اسرائیل کی سرحد کی طرف چل پڑا۔ میرے پاؤں کے نیچے کہیں سخت زمین آجاتی اور کہیں ریت میں پاؤں دھنس نے لگتے۔ صحرائی ٹیلے پیچھے رہ گئے تھے۔ میں اب اس علاقے میں آ گیا تھا جو شامی اور اسرائیلی سرحد کے درمیان واقع تھا اور جسے نو مین لینڈ کہا جاتا ہے۔ گویا خطرناک علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ چونکہ اس علاقے کی سیاسی فضا بے حد کشیدہ تھی اس لئے خدشہ تھا کہ کسی طرف سے بھی کوئی گولی مجھ پر فائر ہو سکتی ہے۔ دشمن ملک کی سرحد کی روشنیاں اب قریب آ گئی تھیں۔ میں نے وہ روشنی بھی دیکھی جو سرحد باڑھ کی ایک اونچی مچان کی سرچ لائیٹ سے نکل کر دائرے کی شکل میں گھومتی ہوئی ایک طرف سے دوسری طرف کو جا رہی تھی۔ دور سے کسی جیپ کی آواز بھی آئی یقیناً یہ اسرائیلی سرحدی سیکورٹی فورس کی جیپ تھی جو رات کے وقت باڈر کا گشت لگا رہی تھی۔ رات بڑی تاریک تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے ابھی میں دور سے کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جونہی میں روشنی کے دائرے کے قریب آیا تو فوراً زمین پر لیٹ گیا اور تیزی سے باڈر لائن کی طرف رینگنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ میں روشنی کے دائرے میں آجاؤں تا کہ مجھے مچان سے دیکھ لیا جائے۔ میں باڈر کے بالکل قریب آ گیا تھا اور مجھے خاردار باڑھ صاف نظر آ رہی تھی۔ سرچ لائیٹ کی روشنی بائیں جانب سے آتی ہوئی جب مجھ پر پڑی تو میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لئے اور عبرانی زبان میں چلا کر کہا۔

''فائر مت کرنا۔ فائر مت کرنا۔''

مچان پر کھڑے یہودی گارڈز نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے مشین گن کا ایک برسٹ فائر کیا۔

گولیاں تڑتڑ کرتیں میرے سامنے آ کر ریت میں دھنس گئیں۔ میں نے ایک بار پھر زور زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"فائرنگ مت کرو۔ میں دوست ہوں۔ فائرنگ مت کرو۔"

اس کے ساتھ ہی خاردار تاروں والی دیوار کی جانب سے چار پانچ یہودی فوجی رائفلیں تانے بھاگتے ہوئے نکلے اور انہوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ ایک نے رائفل میری گردن کے ساتھ لگا دی۔ دوسرے نے مجھے پوری طاقت سے ڈنڈا مار کر عربی میں کہا۔

"فلسطینی دہشت گرد۔"

میں نے اپنی اداکاری اور یہودی جاسوس دایان کا کردار ادا کرنے کی ابتدا کرتے ہوئے بڑے غصے سے عبرانی زبان میں کہا۔

"تم احمق ہو۔ گدھے ہو۔ اپنے اور دشمن کے آدمی میں کوئی تمیز نہیں کر سکتے۔ چلو مجھے اپنے بارڈر سکیورٹی چیف کے پاس لے چلو۔ میرا نام دایان ابراہام ہے کیا تم احمقوں نے شامی جیل سے میرے فرار کی خبر نہیں پڑھی۔"

وہ کچھ گو مگو میں پڑ گئے۔ ان میں نے کسی نے اخبار میں کوئی خبر وغیرہ نہیں پڑھی تھی۔ لیکن میرے لہجے میں جو بھرپور اعتماد اور تحکمانہ انداز تھا اس سے وہ کسی حد تک ضرور متاثر ہوئے تھے۔ میری گردن سے لگی ہوئی رائفل کی نالی پیچھے ہٹ گئی۔ انہوں نے اسی وقت میرے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے رسی سے باندھ دیئے اور مجھے کھینچتے ہوئے خاردار دیوار کے پاس لے آئے جہاں ایک راستہ اندر جاتا تھا۔ مچان کے اوپر سے کسی یہودی گارڈ نے عبرانی زبان میں پکار کر کہا۔

"یہ فلسطینی دہشت گرد ہے۔ اسے شوٹ کیوں نہیں کرتے ہو؟"

فوجیوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے لکڑی کے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے کھوکھے کے پاس لے آئے جس کے باہر ایک فوجی جیپ کھڑی تھی۔ اندر سے فوراً ایک باوردی فوجی باہر نکل آیا اور اس نے چلا کر پوچھا۔

"کہاں سے پکڑا ہے اس فلسطینی کو؟ اسے زندہ میرے پاس کیوں لائے ہو۔ اس کے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟"

وہ عبرانی زبان میں گالیاں بکتا میرے پاس آیا اور آتے ہی میرے گال پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ مگر میں نے انتہائی تحمل سے کام لیا۔ اور پر اعتماد سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"تم نے جو حرکت کی ہے اس کا نتیجہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ دن نکلنے سے پہلے پہلے تمہاری وردی اتر چکی ہوگی۔ تم اپنے عہدے سے ڈس مس ہو چکے ہو گے؟"

فوراً ہی ایک فوجی نے کہا۔

"سر! یہ شخص کہتا ہے کہ میرا نام دایان ابراہام ہے اور میں شامی جیل توڑ کر بھاگا ہوں۔"

لیکن یہ سن کر بھی اس یہودی سکیورٹی آفیسر کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس نے مجھے گردن سے پکڑ کر پیچھے کو دھکیلا اور غضبناک ہو کر کہا۔

"مجھ پر تمہاری اس اداکاری کا کوئی اثر نہیں ہو گا میں نے تم جیسے کئی فلسطینی جاسوس اپنے ہاتھ سے شوٹ کئے ہیں۔ جو اسرائیلی بن کر ہمارے ملک میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔"

حقیقت یہ تھی کہ اس یہودی سکیورٹی افسر کو یہ علم نہیں تھا کہ میں ان کے ایک بہت بڑے جاسوس کا ہم شکل ہوں۔ اس نے دایان ابراہام کا نہ تو نام ہی سنا تھا اور نہ ہی اسے کبھی دیکھا تھا۔ چنانچہ وہ مجھ پر اعتبار نہ کرنے کے سلسلے میں حق بجانب تھا۔ میں نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اسے کہا۔

"جب تمہیں معلوم ہوگا کہ میں کون ہوں تو یقیناً تمہارے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے۔ پھر تمہیں اپنے اس سلوک پر افسوس ہوگا لیکن پھر میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔ تم صرف اتنا کرو کہ حیفہ کے سیکرٹ سروس چیف سے فون پر یا وائرلیس پر میری بات کرا دو۔ ہو سکتا ہے پھر

میں تمہیں معاف کر دوں۔"

میرے لہجے میں اسقدر اعتماد تھا اور اداکاری اتنی کامیاب تھی کہ اس پر کچھ اثر ہو گیا۔

پھر بھی اس نے مجھے وہیں کھڑے رہنے دیا۔ میرے ہاتھ بھی نہ کھلوائے۔ صرف اتنا پوچھا۔

"تم حیفہ سیکرٹ سروس چیف کو کیا کہنا چاہتے ہو؟ وہ بہت بڑا عہدے دار ہے تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

مجھے اسرائیل سیکرٹ سروس کا خفیہ ٹاپ کوڈ بتا دیا گیا تھا۔ یہ چار ہندسوں کی شکل میں تھا۔ میں نے اسے یہ چاروں ہندسے بتائے اور کہا۔

"سیکرٹ چیف کو فون پر یا وائرلیس پر یہ ہندسے بتا دو۔ یہ نیشنل سیکورٹی کا مسئلہ ہے۔"

وہ یہودی افسر میری طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا لکڑی کے کھوکھے کے اندر چلا گیا۔ اندر سے اس کی آواز آئی۔ وہ کسی کے ساتھ فون پر بات کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ کھوکھے سے باہر نکلا تو وہ گھبرایا ہوا تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا میرے پاس آتے ہی اس نے سب سے پہلے میرے ہاتھ خود کھولے اور پھر انتہائی معذرت کے انداز میں بولا۔

"میں معافی مانگتا ہوں سر۔ لیکن سر! آپ تو ہم سے زیادہ جانتے ہیں کہ ہمیں یہاں دشمن کے حربوں سے کتنا ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ میں مجبور تھا سر!"

میں نے بڑی شان بے نیازی سے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور اپنی جیکٹ کے کالر کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس وقت کافی کی ایک گرم پیالی کی ضرورت ہے۔"

"سر اندر تشریف لے آئیں۔"

☆......☆......☆

وہ مجھے لکڑی کے کھوکھے کے اندر لے گیا۔

اندر ایک میز کرسی لگی تھی۔ ایک طرف فون پڑا تھا۔ بجلی کا ایک بلب روشن تھا۔ اس نے مجھے کرسی پیش کی اور کافی کا حکم دے دیا۔ پھر بڑی عاجزی اور ادب سے بولا۔

"سر! حیفہ سے سیکورٹی چیف ابھی آپ سے بات کریں گے۔ میں نے حیفہ پولیس انٹیلی جنس چیف کو فون پر آپ کا کوڈ نمبر بتا دیا تھا۔"

وہ ایک بار پھر اپنے سخت رویے کی معافی مانگنے لگا۔ اس نے فوری طور پر حیفہ پولیس انٹیلی جنس سے رابطہ قائم کر کے میرے کوڈ کے ہندسے اسے بتائے تو وہ چونک پڑا۔ کیونکہ یہ ہندسے دشمن ملک کے انتہائی اونچی سطح کی سیکرٹ سروس کی نشان دہی کرتے تھے۔ اس نے اسی وقت مجھے عزت کے ساتھ بٹھانے کا حکم دیا اور خود حیفہ سیکرٹ سروس کے چیف سے رابطہ قائم کر کے مجھ سے بات کرانے کی کوشش میں لگا تھا۔ ابھی میں نے دشمن کی گرم کافی کا ایک گھونٹ ہی لیا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہودی فوجی افسر نے جلدی سے ریسیور اٹھا کر یس سر کہا۔ دوسری طرف سے حیفہ کی سیکرٹ سروس کا چیف بول رہا تھا۔ مجھے اسکا نام اور حلیہ دمشق میں ہی بتا دیا گیا تھا۔ یہودی افسر نے جلدی سے فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہی عبرانی زبان میں کہا۔

"میں دایان ابراہام بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

"اپنا کوڈ نمبر بتاؤ"

میں نے وہی خفیہ کوڈ کے ہندسے دہرائے اور کہا۔

"شامی جیل سے میرا فرار تقریباً ناممکن تھا۔ مگر قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ میں بڑی اہم خفیہ معلومات لے کر آرہا ہوں۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔

"میں نے شاملہ کی سرحدی پوسٹ کو ہدایت کردی ہے۔ وہاں سے ایک ہیلی کاپٹر تمہیں لینے پہنچ جائے گا۔ بہتر ہوگا۔ کہ تم اسی وقت میرے پاس چلے آؤ۔ میں اپنے گھر پر ہی ہوں اور تمہارا انتظار کررہا ہوں"

"ٹھیک ہے سر!"

یہ کہکر میں نے فون بند کیا اور یہودی فوجی افسر سے کہا۔

"مجھے لینے ہیلی کاپٹر آرہا ہے۔ میں نے تمہیں معاف کردیا ہے۔"

وہ تو میرے آگے بچھ گیا۔ اس نے میرے لئے کافی کی دوسری پیالی بنائی۔ مجھے سگار پیش کیا۔ میرا ذہن اس وقت صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ حیفہ سکریٹ سروس کے چیف کو مجھے دیکھکر کوئی شک تو نہیں پڑے گا! لیکن میری شکل یہ حقیقت ہے کہ یہودی جاسوس دایان سے اسقدر ملتی تھی کہ خود میں اس کی لاش کا چہرہ اور تصویر دیکھکر سناٹے میں آگیا تھا کہ کیا دنیا میں ایک شکل کے دو آدمی بھی ہوسکتے ہیں؟ پندرہ بیس منٹ گذرے ہوں گے کہ رات کی خاموشی میں ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ قریب ہی ایک جگہ اترا دو سرحدی پولیس کے نوجوان باوردی یہودی تیز تیز قدموں سے چلتے کھوکھے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے میرا نام پوچھا۔ پھر مجھے سلیوٹ کیا اور اپنے ساتھ لے کر ہیلی کاپٹر کی طرف چل پڑے۔ یہ کافی بڑا ہیلی کاپٹر تھا اور اس کی دونوں جانب مشین گنیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ کوئی فوجی ہیلی کاپٹر لگتا تھا جو پولیس کی تحویل میں تھا۔

ہیلی کاپٹر گڑگڑاتا ہوا فضا میں بلند ہوا رات کے پچھلے پہر کے دھند لکے میں ایک جانب روانہ ہوگیا۔ وہاں سے حیفہ کا شہر کافی دور تھا۔ لیکن ہیلی کاپٹر کی رفتار بھی کافی تیز تھی۔ چونکہ مجھے منزل مقصود تک فوری طور پر پہنچانے کے خفیہ آرڈر دیئے گئے تھے اس لئے ہیلی کاپٹر کی سپیڈ معمول سے کچھ زیادہ ہی کردی گئی۔ کوئی پون گھنٹے بعد دور سے حیفہ شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ اب صبح کا اجالا بھی آسمان پر پھیلنے لگا تھا۔ ہیلی کاپٹر شہر کی بائیں جانب سے ہوتا ہوا پہاڑی کے دامن میں ایک کافی بڑی جدید قسم کی کوٹھی کے احاطے میں اتر گیا۔ برآمدے میں ایک آدمی سلیپنگ گاؤن پہنے پہلے سے کھڑا تھا۔ یہ حیفہ سیکرٹ سروس کا چیف ڈیوڈ ہی ہوسکتا تھا۔ جب وہ میری طرف بڑھا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ اسکی تصویر مجھے دمشق میں ہی دکھادی گئی تھی۔ اس نے ایک گہری نگاہ مجھ پر ڈالی۔ جیسے یہ دیکھنے کی کوشش کررہا ہو کہ میں دایان ابراہام ہی ہوں یا اس کے بھیس میں کوئی دشمن کا ایجنٹ ہوں۔ لیکن دایان میرا اسقدر حیران کن حد تک ہم شکل تھا کہ ڈیوڈ کو ذرا سا بھی شک نہ ہوا۔ اس نے مجھے گلے لگالیا اور بولا۔

"ہم نے تمہارے فرار کی خبر سن لی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ تم بہت جلد ہمارے پاس آجاؤ گے۔ چلو اندر چلتے ہیں۔"

کوٹھی کا ڈرائنگ روم بڑی نفاست سے سجا ہوا تھا۔ دیوار پر اس زمانے کے اسرائیلی وزیراعظم کی تصویر لگی تھی۔ کارنس پر اسرائیلی پرچم کے قریب ہی ڈیوڈ کی فل وردی میں تصویر فریم میں لگی رکھی تھی۔ کھڑکیوں پر پڑے باریک ریشمی پردوں میں سے دن کی روشنی اندر آرہی تھی۔ صبح ہوچکی تھی۔ ڈیوڈ نے اسی وقت ملازم کو میرے لئے ناشتہ لانے کو کہا۔ اور پھر میرے سامنے صوفے پر بیٹھ کر فون گود میں رکھا اور کسی کا نمبر ملا کر عبرانی زبان میں بولا۔

"سر! دایان پہنچ گیا ہے۔ جی ہاں سر۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ بات کریجیے۔"

وہ میری طرف فون بڑھاتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"ڈیفنس سیکرٹری تم سے بات کریں گے۔"

اب یہ حقیقت مجھ پر کھل چکی تھی کہ دایان ابراہام واقعی کوئی بڑی زبردست چیز ہے ورنہ

ایک جاسوس کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی کہ ملک کا سکریٹری ڈیفنس صبح صبح بستر سے اٹھ کر اس سے بات کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس اسرائیلی سکریٹری ڈیفنس کے بارے میں مجھے کسی قسم کی بریفنگ نہیں کی گئی تھی۔ ظاہر ہے اسکی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ آخر مجھے کس کس کے بارے میں بتایا جاتا۔ چند ایک ضروری اور ان لوگوں کے بارے میں مجھے بریف کر دیا گیا تھا جن کی معلومات شامی انٹیلی جنس کو میسر تھیں باقی لوگوں سے مجھے خود حالات کے مطابق نمٹنا تھا۔

میں نے ریسیور کان کے ساتھ لگا کر عبرانی طرز کے مطابق صبح بخیر کہا۔ دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز نے جواب میں مجھے سب سے پہلے مبارک باد دی اور پھر کہا۔

''تم وہاں سے جو معلومات بھی اڑا کر لائے ہو وہ ہماری ریاست کے واسطے یقیناً بڑی مفید ہوں گی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں اپنے آفس میں ٹھیک وقت پر تمہارا بے تابی سے انتظار کروں گا۔ باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی۔''

میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ اب مجھے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ میں اسے کیا بتاؤں کہ میں کیا معلومات اڑا کر لایا ہوں؟ بہر حال میں نے یہی فیصلہ کیا کہ بعض شامی ڈیفنس مورچوں کے بارے میں جھوٹ موٹ رپورٹ پیش کر دوں گا۔ بلکہ اسرائیلی انٹیلی جنس کو جتنا گمراہ کر سکا گمراہ کر دوں گا۔

حیفہ سکریٹ چیف کے ہاں میں نے شیو بنا کر منہ ہاتھ دھویا۔ مزے سے ناشتہ کیا اور صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ سکریٹری ڈیفنس کے آفس پورے نو بجے پہنچنا تھا۔ کیونکہ وہی اس کے دفتر آنے کا وقت تھا۔ میں جب اس کے آفس کے بڑے آہنی گیٹ پر پہنچا تو مجھ سے شناختی کارڈ طلب کیا گیا میں نے اپنا نام بتایا تو پھر کسی نے کہیں بھی نہ روکا۔ ان سب کو میرے بارے میں پہلے سے بتا دیا گیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد میں اسرائیلی سکریٹری ڈیفنس کے عالی شان کمرے میں اس کے سامنے موجود تھا وہ مجھے بڑی تیز نظروں سے گھورنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اسے لگا جیسے میرا راز کھل گیا ہے۔

☆......☆......☆

لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

وہ مسکراتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھ کر میری طرف بڑھا۔ بڑی گرم جوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور مجھ سے میرے فرار کی کہانی سننے لگا۔ جب میں نے اسے اپنے فرار کی فرضی کہانی سنا دی تو وہ بولا۔

''جب یہ اطلاع ملی کہ تمہیں شامی پولیس نے پکڑ لیا ہے اور تم سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے تو ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اب تمہارا بچنا محال ہے۔ لیکن جب دمشق ریڈیو پر خبر سنی اور ہمارے دوسرے ایجنٹوں نے بھی اطلاع کر دی تم دشمن کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہو تو ہمیں اطمینان ہوا۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ نمبر 6 کے بارے میں تم کیا کیا اہم ترین معلومات لائے ہو؟''

میری جانے بلا کہ نمبر 6 کیا چیز تھی۔ مگر میں مطلق نہ گھبرایا۔ اتنا اندازہ میں نے لگا لیا کہ اگر اسرائیلی نمبر 2 نیوکلیائی میزائیلوں کا کوڈ ہے تو نمبر 6 کا تعلق بھی شام کے کسی نیوکلر پروگرام ہی سے ہوگا۔ میں نے بڑے تجربہ کار جاسوس کی طرح دروازے کی طرف گھور کر دیکھا اور سکریٹری سے پوچھا۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ اس وقت ہماری گفتگو کوئی تیسرا آدمی نہیں سن رہا؟"

سکریٹری ڈیفنس نے میری طرف تعجب سے دیکھا اور کہا۔

"پہلے تو تم نے کبھی اس قسم کے شک شبے کا اظہار نہیں کیا۔ تم تو جانتے ہو کہ میرے آفس کے دروازے کے آگے سے کسی کو گذرنے تک کی اجازت نہیں ہے۔"

مجھ سے ایک بھول ہو گئی تھی مگر میں اس سے نمٹنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کی بھول چوک آگے چل کر بھی مجھ سے کہیں نہ کہیں ہونے والی تھی۔ کیونکہ آخر میں اصلی دایان ابراہام نہیں تھا۔ اسکا ہم شکل تھا۔ اور یہ سارا ماحول، سب لوگ میرے لئے اجنبی

تھا نے

جلدی سے کہا۔

"سر! میں جو معلومات آپ کو بتانے والا ہوں اسکا تعلق بڑے حساس اداروں سے ہے۔ اس لئے میں ضرورت سے زیادہ محتاط ہوں۔"

اسرائیلی سکریٹری ڈیفنس نے سگار نکال کر پیش کیا۔ میں نے لے لیا اور اسے سلگا رہا تھا کہ وہ بولا۔

"دایان! کیا بات ہے۔ اس بار دمشق میں رہ کر تم سگار پینے لگے ہو؟ تم تو ہمیشہ سگریٹ پیا کرتے تھے۔"

میں نے تھوڑا سا کھانس کر کہا۔

"سر! میرے گلے میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے کہا کہ یہ ساری خرابی سگریٹ کے کاغذ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس نے میرے گلے کا ہلکا سا آپریشن بھی کیا۔ اور کہا کہ اگر تمبا کو پینا ہی ہے تو سگار پی لیا کرو۔"

"اوہ آئی سی!" سکریٹری نے بھوئیں تھوڑی سی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "جب ہی تمہاری آواز بھی کچھ کچھ بدلی ہوئی ہے خیر ٹھیک ہے۔ مجھے نمبر 6 کے بارے میں اپنی معلومات سے آگاہ کرو۔"

میں نے شامی نیوکلیائی ڈیفنس کے بارے میں بڑی نمک مرچ لگا کر دو چار جھوٹی معلومات اسے بتا دیں جنکا اصلیت کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ اور تعلق ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس واسطے کہ مجھے خود شامی نیوکلیائی ڈیفنس کے بارے میں ذرے برابر بھی معلومات نہیں تھیں۔ مگر چونکہ میں اسرائیلی انٹیلی جنس سروس کا کوئی بہت بڑا اور قابل اعتماد جاسوس تھا اور ابھی تک کسی نے مجھ پر شک بھی نہیں کیا تھا اس لئے اس یہودی سکریٹری نے بھی میری ایک ایک بات کو بڑے غور سے سنا اور ایک کاپی پر بعض پوائنٹ نوٹ بھی کرتا رہا۔ جب میں اپنی جھوٹی معلومات والی باتیں ختم کر چکا تو اس نے ٹیلی فون کا نمبر گھماتے ہوئے کہا۔

"دایان تم اتنی اہم معلومات لے کر آئے ہو کہ ہم دشمن کی ساری ڈیفنس پندرہ منٹ میں برباد کر سکتے ہیں۔"

میں دل میں ہنس رہا تھا کیونکہ میں نے اسے جن فرضی شامی زیر زمین نیوکلیائی میزائیلوں کے اڈوں کے بارے میں بتایا تھا اس جگہ سوائے سنگلاخ پہاڑیوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اوپر سے میں نے بڑی اہمیت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"یقیناً سر! ہمیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ شامی وہاں سے اپنے زیر زمین لگے ہوئے میزائیل اٹھا کر لے جائیں ہمیں انہیں تباہ کر دینا ہوگا۔"

"فکر نہ کرو تم دایان!" وہ بولا "ہم انہیں کل تک کی بھی مہلت نہیں دیں گے۔"

اس نے ٹیلی فون پر کسی بڑے اہم عہدے دار سے ان میزائیلوں کے بارے میں بات کی اور کہا کہ میں دوپہر کے وقت تمہارے پاس آرہا ہوں۔ ہمیں آج ہی پرائم منسٹر سے بات کر کے منظوری لینی ہوگی۔ میں سمجھ گیا کہ میری جھوٹی معلومات پر اسرائیلی بڑا زبردست قسم کا جارحانہ پروگرام طے کر رہے ہیں۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ مجھے صبح ہونے سے پہلے پہلے شامی سکریٹ سروس کو خفیہ کوڈ کے ذریعے وائرلیس پر پیغام پہنچانا ہوگا کہ صحرائی علاقے میں جو جگہیں میں نے یہودیوں کو بطور شامی نیوکلر ڈیفنس مورچوں کے بتائی ہیں وہاں وہاں گڑھے کھود

کر کچھ لوہے کا کاٹھ کباڑ اور بارود کے بکس رکھ دیے جائیں تاکہ جب اسرائیلی طیارے وہاں بمباری کریں تو بارود کے دھماکے بھی ہوں اور وہاں سے بعد میں تڑا مڑا لوہے کا سامان بھی بکھرا ہوا پایا جائے۔ کیونکہ بمباری کے بعد یقینی طور پر اسرائیلی ایجنٹوں نے وہاں پہنچنا تھا اور نیوکلر پوسٹوں کی تباہی کے اثرات کی اطلاعات بھی بھیجنی تھیں۔ میں نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا کہ میں ساری رات کا جاگا ہوا ہوں اب گھر جا کر سو جانا چاہتا ہوں۔ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''ضرور ضرور۔ تمہیں آج پورا دن سونا ہوگا۔ میں شام کو خود تمہارے ہاں آؤں گا۔ پھر کلب چلیں گے۔ وہاں سکریٹری انٹیلی جنس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ میں نے اسے تمہاری اطلاع کر دی ہے۔ اور اس دوران اس سے مل کر اچانک اٹیک کا پروگرام بھی طے کر لوں گا۔ پرائم منسٹر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میرا ڈرائیور تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آئے گا۔''

اصلی اسرائیلی جاسوس دایان کی جیب سے اس کی منگیتر کا جو پرانا خط برآمد ہوا تھا اس کے حیفہ والے گھر کا مکمل ایڈریس لکھا ہوا تھا جو مجھے ازبر کرا دیا گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سکریٹری ڈیفنس کے ڈرائیور کو بھی دایان کے گھر کا پتہ معلوم ہوگا۔ پھر بھی گاڑی میں سوار ہونے کے بعد میں نے عبرانی زبان میں ڈرائیور سے پوچھ لیا کہ اسے میرے گھر کا پتہ معلوم ہے ناں____ اس نے مجھے دایان کے سیکٹر اور مکان کا نمبر بتا دیا۔ یہ وہی تھا جو دایان کی منگیتر کے خط میں لکھا ہوا تھا۔ گاڑی دایان ابراہام کے مکان کی طرف روانہ ہو گئی۔ اتنا مجھے بھی یقین تھا کہ دایان ایک اونچی سطح کا جاسوس تھا۔ چنانچہ اس کے مکان میں جاسوسی کے آلات اور خاص طور پر کوئی نہ کوئی وائرلیس سیٹ ضرور ہوگا۔ اسی وائرلیس سیٹ پر مجھے پیچھے دمشق میں وہ ضروری پیغام پہنچانا تھا جس کا تعلق صحرا کے نیوکلر میزائیلوں والے فرضی ٹھکانوں سے تھا۔

☆......☆......☆

میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ اس یہودی جاسوس کے مکان کے تہہ خانے میں خفیہ پیغام رسانی کا جدید ترین وائرلیس سیٹ موجود تھا۔ مجھے الماری کے ایک دراز میں سے خفیہ کوڈ کی کاپی بھی مل گئی۔ مگر مجھے اس کوڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مجھے اپنے خفیہ کوڈ میں دمشق کو پیغام پہنچانا تھا۔ میں نے دایان کی الماری کی ساری فائلیں دیکھ ڈالیں مگر مجھے وہ فائل نہ ملی جسکی مجھے تلاش تھی اور جسے حاصل کرنے کے لئے مجھے دشمن کے علاقے میں بھیجا گیا تھا۔ یہ چیز سیکرٹ فائل نمبر 2 تھی۔ اس میں ان اسرائیلی میزائیلوں کے اڈوں کی تفصیل درج تھی جو انہوں نے مسلم عرب ممالک خاص طور پر شام پر گرانے کے لئے نصب کر رکھے تھے۔

مجھے سب سے پہلا کام یہ کرنا تھا کہ پیچھے دمشق کی خفیہ پولیس کو خبردار کر دوں کہ وہ صحرا میں ان جگہوں پر زمین کے اندر کچھ گولہ بارود اور لوہے کا سکریپ وغیرہ دبا دیں جن کے بارے میں میں نے اسرائیلی سکریٹری ڈیفنس کو یہ بتایا تھا کہ وہاں نیوکلیائی میزائل لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں نے الماری میں سے دایان کا وائرلیس سیٹ نکال کر سامنے رکھ لیا۔ اسے فون کر کے دمشق کی فریکوئنسی ملائی اور خفیہ کوڈ نمبر کو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دہرانے لگا۔ فوراً ہی دوسری طرف سے مجھے جواب مل گیا۔ میں نے دمشق کو اچھی طرح سے ساری بریفنگ کر دی۔ میں نے

وائرلیس سیٹ بند کر کے اسی طرح الماری میں رکھ دیا۔ اب میں مطمئن تھا کہ اسرائیلی حکومت مجھ پر شک نہیں کر سکے گی۔ دوسرے دن اسرائیلی طیاروں نے عین اسی جگہ صحرائی ٹھکانوں پر سینکڑوں بم گرائے جو میں نے بتائی تھی۔ اور لوہے کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے چھپا دیئے گئے تھے۔ بم گرنے کے بعد زمین میں دبایا ہوا بارود دھماکوں سے پھٹنے لگا اور لوہے کے بیکار ٹکڑے ادھر ادھر بکھرنے لگے۔

اسرائیلی پائلٹ بمباری کے بعد فضائی تصویریں اپنے ساتھ لائے تھے انہیں دیکھ کر سیکرٹری ڈیفنس اور اسرائیلی وزیر دفاع کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ سکریپ شامی میزائیلوں کے ٹکڑے ہیں۔ اور انہوں نے شامی میزائیلوں کے ٹھکانوں کو تباہ کر دیا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس واقعے کے بعد میری حیثیت مزید بڑھ گئی اور میرے عہدے میں بھی ترقی کر دی گئی۔

اب مجھے سیکرٹ فائل 2 کی تلاش تھی۔ میرے لئے اسرائیلی محکمہ ڈیفنس کے سیکرٹ ڈیپارٹمنٹ میں جانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ میں نے معلوم کر لیا تھا کہ جو میزائل اسرائیل نے مسلم عرب شہروں کو تباہ کرنے کے واسطے لگائے ہوئے ہیں ان کو چلانے والے نظام کے خفیہ کوڈ کی یہ مطلوبہ فائل ملٹری کے سیکرٹ ڈیپارٹمنٹ کے تہہ خانے میں ہے جہاں چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر گارڈ موجود ہوتا ہے۔ یعنی ہر چھ گھنٹے بعد ایک گارڈ چلا جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا گارڈ آ جاتا ہے۔ میں نے سکریٹری ڈیفنس سے کہا کہ میں کچھ سکریٹ فائلیں چیک کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ جس اسرائیلی ایجنٹ کا میں نے روپ بھرا ہوا تھا بلکہ جس کا میں ہم شکل تھا، وہ ان کی سیکرٹ سروس کا ٹاپ کا ایجنٹ تھا چنانچہ مجھے فوراً اجازت مل گئی۔ میرا آئی ڈی کارڈ اور خفیہ کمپیوٹر کارڈ نیا بنا دیا گیا تھا۔

چنانچہ بڑی آسانی سے سنٹرل انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے تہہ خانے میں پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو چاروں طرف سے بند تھا۔ اس میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی روشندان تھا۔

دیواروں کے ساتھ لوہے کی الماریاں لگی تھیں۔ یہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جس الماری میں خفیہ میزائیلوں کے نظام کی فائل نمبر 2 ہے اس کا رنگ نیلا ہے۔ یہاں صرف ایک یہودی گارڈ پہرہ دے رہا تھا۔ نیلے رنگ کی الماری بائیں جانب والی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ گارڈ نے مجھے سیلوٹ کیا۔ وہ میری شکل اور مرتبے سے واقف تھا۔ میرے پاس وہ کمپیوٹر کا کارڈ موجود تھا جس کو پنچ کرنے سے الماری کھل جاتی تھی۔ میں نے کارڈ کو الماری کے باہر لگے چھوٹے سے والٹ میں ڈال کر دبایا تو الماری

کے تالے کے کھلنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں نے الماری کھول دی۔ اس کے اندر اوپر سے نیچے تک تین خانے تھے جن میں کچھ وڈیو اور آیوڈیو کیسٹ اور فائلیں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی مطلوبہ فائل کی تلاش شروع کر دی۔

تھوڑی ہی دیر میں مجھے وہ فائل مل گئی۔ اس کے باہر سیاہ عبرانی الفاظ میں فائل نمبر 2 لکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ اکیلی فائل نکالنی مناسب نہ سمجھی۔ اس کے ساتھ دو چار مزید فائلیں نکال کر میز پر رکھ دیں اور سٹول پر بیٹھ کر ان کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس وقت میری جیب میں ایک مائیکروفلم والا بے حد حساس اور چھوٹا سا کیمرہ بھی تھا جو سگریٹ لائیٹر میں لگا ہوا تھا۔ گارڈ مجھ سے دو تین قدم کے فاصلے پر پتھر کے بت کی طرح پہرے پر کھڑا تھا۔ کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ میں نے فائل نمبر 2 کو کھولا تو میری روح خوش ہو گئی۔ اس کے اندر اسرائیلی نیوکلیائی میزائیلوں کے نظام کا سارے کا سارا نقشہ ایک پورے صفحے کی شکل میں موجود تھا۔ مجھے اسی صفحے کی فوٹو اتارنی تھی۔ فائل کا یہ صفحہ میرے سامنے کھلا تھا۔ میں نے ایک جیب میں سے سگار نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور دوسری جیب میں سے کیمرے والا لائیٹر نکال لیا۔ میں یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے میں اپنے کام میں اتنا مصروف ہوں کہ مجھے سگار سلگانا بھی یاد نہیں رہا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں نے اپنے لائیٹر میں لگے خفیہ بٹن کو دبا دیا تھا اور اس کے اندر چھپے ہوئے کیمرے کی آنکھ نے میزائیلوں کے نقشے کی چھ سات تصویریں کھینچ لی تھیں۔ تب میں نے سگار سلگا کر لائیٹر جیب میں رکھا اور فائل کو بند کر

دیا۔ پھر باقی کی فائلوں کو بھی جوڑ کر اٹھایا اور واپس الماری میں رکھ کر الماری کو بند کر کے لاک کر دیا۔

میں نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ جب میں تہہ خانے سے نکلنے لگا تو یہودی گارڈ نے ایک بار پھر پاؤں فرش پر مار کر مجھے سلیوٹ کیا۔ ایک بار تو میں ڈر گیا۔ مگر فوراً ہی سنبھلا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے کمرے میں سے ہوتا ہوا آفس کی عمارت کے برآمدے میں نکل آیا۔ میں جلدی سے جلدی اپنے مکان پر پہنچ کر کیمرے کی فلم کو ڈیولپ کر کے یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ فائل کے صفحے کی تصویریں اتری بھی ہیں کہ نہیں۔ میری گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔ جونہی میں گاڑی کی طرف بڑھا

سامنے سے ایک نوجوان یہودی عورت میری طرف مسکراتی ہوئی آئی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

"ڈیئر! اوہ ڈیئر____" میں حیرانی سے اسے تکنے لگا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن آخر انسان ہوں۔ بھول گیا کہ میں جس شخص کے بھیس میں ہوں یہ اس کی کوئی قریبی عزیزہ بھی ہو سکتی ہے۔ میری بدقسمتی کہ میرے منہ سے نکل گیا۔ "میڈم! میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔" اس عورت کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کہنے لگی۔ "دایان ڈیئر! تم اپنی منگیتر کو بھی نہیں پہچانتے؟" میرے پاؤں تلے سے ایک بار تو زمین نکل گئی۔

☆......☆......☆

میں جس کا ہم شکل تھا اس کی منگیتر میرے سامنے کھڑی تھی۔ اب وہ میری منگیتر بھی تھی۔ اور میں نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ لیکن مجھے اس کی تصویر دمشق کی خفیہ سروس والوں نے نہیں دکھائی تھی اور میں کوئی پیشہ ور جاسوس بھی نہیں تھا۔ میں تو اسلامی اخوت اور ایک برادر اسلامی ملک کی محبت کی وجہ سے یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ پھر بھی ذرا سی غلطی مجھے فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر سکتی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے اندر اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس کا نام اب مجھے یاد آ گیا تھا۔ میں نے سخت افسوس کے انداز میں اپنا ہاتھ ماتھے پر مارا اور اسکا نام لے کر کہا۔

"مائی ڈیئر! اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ دشمن نے مجھے جیل میں کیسی کیسی اذیت دی ہے انہوں نے میرے دماغ کو کچھ اس طرح سے بجلی کے جھٹکے دے کر برین واش کیا ہے کہ میں پہلی نظر میں کسی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ اسکا ثبوت تمہیں ابھی مل گیا ہے کہ میں اپنی جان سے زیادہ عزیز منگیتر کو بھی نہیں پہچان سکا۔"

میں نے اسے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا لیا اور اس کے ساتھ اپنی قید کے زمانے کی باتیں کرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اپنی منگیتر نادیا کے چہرے کی بھی سٹڈی کرتا جاتا تھا۔ کہ اسے

مجھ پر کہیں کوئی شک تو نہیں ہو گیا۔ میں تو اسی نتیجے پر پہنچا کہ اسے مجھ پر شک نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ مجھ سے کھل مل کر باتیں کرنے لگی تھی۔ وہ بتانے لگی کہ تمہاری یاد میں میں نے کتنی پریشانی سے یہ دن گذارے۔ پھر جب یہ خبر سنی کہ تم جیل سے فرار ہو گئے ہو تو روز دعائیں مانگتی کہ تم خیریت سے یہاں پہنچ جاؤ۔ گاڑی دایان کے بنگلے یعنی میرے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ ایک چوراہے میں پہنچ کر نادیا نے کہا۔

''ڈیئر! مجھے یہیں اتار دو۔ آنٹی کی خبر لینے ہسپتال جانا ہے مجھے۔ میں کل تمہارے پاس آؤں گی۔ دوپہر کا کھانا ہم اکٹھے ہی کھائیں گے۔''

میں نے گاڑی ایک طرف کر کے روک لی۔ وہ دروازہ کھول کر اتری اور مسکرا کر ہاتھ ہلاتی فٹ پاتھ پر چل پڑی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا لی۔ سوچنے لگا کہیں میرا راز فاش تو نہیں ہو گیا؟ مگر اب چاہے جو کچھ بھی ہو مجھے جتنی جلدی ہو سکے فائل نمبر 2 کی فلم ڈیویلپ کر کے حیفہ میں مقیم اپنے ایک سیکرٹ ایجنٹ تک پہنچانی تھی جس کا پورا پتہ مجھے دے دیا گیا تھا اور جس کی تصویر بھی مجھے دکھا دی گئی تھی۔

بنگلے میں آتے ہی میں نے نوکر سے کافی تیار کرنے کو کہا اور خود تہہ خانے میں اتر گیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا کیبن تھا جہاں اصلی جاسوس دایان فلمیں وغیرہ ڈیویلپ کیا کرتا تھا۔ ہر قسم کا سامان موجود تھا۔ میں نے کیبن بند کر کے بتی بجھائی اور بہت ہی دھیمی لال روشنی میں لائیٹر کے اندر سے فلم نکال کر اسکی ڈیویلپنگ شروع کر دی۔ تمام مرحلوں میں سے گذارنے کے بعد میں نے فلم کو کیمیاوی لیکوئیڈ میں سے نکال کر دیکھا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سیکرٹ فائل نمبر 2 کے خفیہ بلیو پرنٹ کی ساری کی ساری تصویریں موجود تھیں۔ میں نے ان تصویروں کو وہیں ضائع کر دیا اور فلم کے ننھے کیپسول کو سیاہ کاغذ میں لپیٹ کر جیکٹ کے کالر کے اندر والے خفیہ سوراخ میں چھپا دیا۔

اب مجھے شہر میں مقیم اپنے خفیہ ایجنٹ کے پاس پہنچ کر یہ فلم اس کے حوالے کرنی تھی۔

یہی میرا دشمن کے ملک میں سب سے اہم مشن تھا۔ میں تہہ خانہ بند کر کے اوپر ڈرائینگ روم میں آ گیا۔ ملازم نے کافی لگا دی ہوئی تھی۔ میں کافی بنا رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کئی اندیشے میرے دل میں جاگ پڑے۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف میری منگیتر بول رہی تھی۔ ''ہیلو دایان! آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کل مجھے ان کو دوسرے ہسپتال میں لے جانا ہو گا۔ کیوں نہ ہم آج ڈنر پر اکٹھے ہوں۔ کیا خیال ہے؟'' میں نے حامی بھر لی۔ نادیا کی آواز آئی۔ میں سات بجے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔ پھر ہم کسی اچھے سے ریستوران میں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور باتیں بھی کریں گے۔

اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ شام کے سات بجنے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے۔ میرے پاس اتنا وقت تھا کہ میں مائیکرو فلم اپنے ایجنٹ تک پہنچا دوں۔ میں نے جلدی سے کافی کا گھونٹ بھرا اور باہر نکل گیا۔ اپنے ایجنٹ کا ایڈریس خفیہ کوڈ میں میری ڈائری میں لکھا تھا۔ میری گاڑی تیزی سے شہر کی سڑکوں پر سے گذرتی ہوئی اس ڈیپارٹمینٹل سٹور کے چوراہے میں پہنچ گئی جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ وہاں سے دائیں جانب مڑنا ہے۔ میں نے گاڑی دائیں جانب موڑ دی۔ یہ سڑک شہر کی گنجان آبادی کی طرف جاتی تھی۔ میں نے جیب سے نوٹ بک نکال کر ایجنٹ کا پورا ایڈریس دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد میری گاڑی ایک چھوٹی سی گلی کے پاس آ گئی۔ گاڑی کو میں نے ایک طرف اندھیرے میں پارک کر دیا۔ گلی میں صرف ایک بتی جل رہی تھی۔ جسکی وجہ سے وہاں صرف کونے میں ہی تھوڑی سی روشنی تھی۔ باقی گلی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ہمارے ایجنٹ کی اسی گلی میں پرانی کتابوں کی دکان ہے۔ میں گلی میں پیدل چل پڑا۔ گلی خالی خالی تھی۔ صرف اوپر مکانوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی اور کسی وقت کسی عورت یا بچے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ گلی میں تقریباً ساری دکانیں بند تھیں۔ صرف ایک دکان کھلی تھی جس کے باہر عبرانی زبان میں پرانی کتابیں لکھا ہوا تھا۔ بڑی ہی

بوسیدہ دکان تھی۔ ایک طرف کو جھکی ہوئی الماریوں میں کتابیں زبردستی بھری ہوئی تھیں۔فرش پر بھی پرانی کتابوں کے ڈھیر لگے تھے۔ایک ادھیڑ عمر کا آدمی پرانی میز کے پیچھے بیٹھا ٹیبل لیمپ جلائے کسی خستہ حال کتاب کے اوراق بڑی احتیاط سے پلٹ رہا تھا۔ اس کا حلیہ یہودی پادریوں جیسا تھا۔ چھوٹی سی ڈاڑھی اور سر پر گول ٹوپی۔ آنکھوں پر نظر کی عینک ___ ایش ٹرے میں پاس ہی بجھا ہوا سگار اور چائے کی خالی پیالی پڑی تھی۔ میں دکان میں کتابیں دیکھنے لگا۔ اس نے بھی مجھے گاہک سمجھتے ہوئے کوئی توجہ نہ دی۔ یہ وہی شکل تھی جس کی تصویر مجھے دمشق میں دکھائی گئی تھی۔ یہی وہ اپنا ایجنٹ تھا جس کو مجھے سیکرٹ فائل کی مائیکروفلم دینی تھی۔

ابھی میں اپنے ایجنٹ سے بات کرنے کے لئے آگے بڑھا ہی تھا کہ گلی میں بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں پھر اچانک پولیس کے چار مسلح سپاہی دکان میں گھس آئے۔ایجنٹ نے چہرہ اٹھا کر بڑے سکون سے پولیس کے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ان کے ساتھ ایک خفیہ پولیس کا انسپکٹر بھی تھا۔ میں پریشان سا ہو گیا مگر بڑے اطمینان سے ایک طرف کھڑا رہا۔ یہودی خفیہ انسپکٹر نے اپنے ایجنٹ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ’’تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔‘‘

ایجنٹ نے بڑے اعتماد کے ساتھ پوچھا۔

’’کیا تمہارے پاس میرے وارنٹ ہیں؟ کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ مجھے کس لئے گرفتار کیا جا رہا ہے؟‘‘

.یہودی انسپکٹر نے جیب سے اس کی گرفتاری کا کاغذ نکال کر اسے دکھایا۔ ایجنٹ نے پوچھا۔ ’’میرا جرم کیا ہے؟‘‘ انسپکٹر بولا۔ ’’یہ تمہیں پولیس سٹیشن پہنچ کر معلوم ہو جائے گا۔‘‘ اپنے ایجنٹ کو سپاہی اپنے حصار میں لے کر دکان سے باہر نکلے تو یہودی انسپکٹر میری طرف متوجہ ہوا۔ ’’تم کون ہو؟‘‘

میں نے بے نیازی سے جواب دیا کہ میں پرانی کتابیں دیکھنے آیا تھا۔ یہودی

انسپکٹر نے مجھ سے میرا آئی ڈی کارڈ طلب کیا۔ میں اپنا آئی ڈی کارڈ اسے دکھانا نہیں چاہتا تھا مگر صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ مجھے اپنا کارڈ دکھانا ہی پڑ گیا۔ کارڈ پر میری تصویر تھی اور خفیہ سروس کی مہر لگی تھی۔ یہودی انسپکٹر نے بڑے ادب سے کارڈ مجھے واپس کیا اور سلام کر کے دکان سے نکل گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ڈنر کا وقت قریب آ رہا تھا۔ گلی سے باہر آیا تو دیکھا کہ یہودی پولیس اپنے ایجنٹ کو جیپ میں بٹھا کر لئے جا رہی تھی۔ یہ خطرے کا سگنل تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھا۔ انجن سٹارٹ کیا اور اپنے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

میری منگیتر نادیا سات بجے شام میرے بنگلے پر پہنچ گئی۔

میں نے رسمی طور پر اس کی آنٹی کی خیریت پوچھی اور پھر ہم گاڑی میں بیٹھ کر شہر کے ایک ریستوران کی طرف چل پڑے۔ یہ ریستوران نادیا کی پسند تھی اور مجھ سے پہلے وہ اپنے اصلی منگیتر دایان کے ساتھ اکثر وہاں کھانا کھانے آتی رہی تھی۔ میں نے ریستوران میں داخل ہونے کے بعد ایسی اداکاری کی جیسے میں پہلے کئی بار اس جگہ آتا رہا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں وہاں کے بیروں اور سیکورٹی والوں کی شکلیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ہم ایک میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ نادیا نے مینو میری طرف کر دیا جس پر اس رات کے کھانوں کے نام درج تھے۔ میں نے سارڈین مچھلی کا آڈر دیا تو نادیا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

"دایان! معلوم ہوتا ہے دمشق انٹیلی جینس نے تمہارا کھانے کا ذوق بھی تبدیل کر دیا ہے۔ تم تو سارڈین مچھلی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔"

ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا میں کہاں تک خیال رکھ سکتا تھا۔ مجھے اصلی دایان کی کئی ذاتی پسند ناپسند کی باتوں کا علم نہیں تھا۔ میں بالکل نہ گھبرایا۔ اور وہی برین واشنگ کا بہانہ بناتے ہوئے

نادیا سے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو ڈیئر۔ یہ برین واشنگ کا ہی اثر ہے۔ اب مجھے سارڈین مچھلی بری نہیں لگتی۔"

سیکرٹ فائل نمبر 2 کی مائیکروفلم میرے کوٹ کے کالر کے اندر اسی طرح حفاظت سے پڑی تھی۔ یہ فلم میں اپنے پرانی کتابوں والے ایجنٹ تک نہ پہنچا سکا تھا۔ میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال اٹھ رہا تھا کہ پولیس اسے پکڑ کر لے گئی ہے۔ ادھیڑ عمر کا کمزور سا آدمی ہے۔ کہیں اسرائیلی پولیس کے تشدد سے گھبرا کر اپنے سارے راز نہ اگل ڈالے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں اسرائیلی سی آئی اے کا سب سے ٹاپ کا جاسوس ہوں اور اس پوزیشن میں ہوں کہ اپنے ایجنٹ کی مدد کر سکوں۔ چونکہ میں اصلی جاسوس دایان نہیں تھا بلکہ ہم شکل ہونے کی وجہ سے اسکا کردار ادا کر رہا تھا اس لئے قدرتی طور پر یہ خیال پہلے میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ میں ریستوران سے جلدی اٹھ کھڑا ہوا۔ نادیا ابھی بیٹھنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے کہا کہ مجھے سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ وہ بادل نخواستہ میرے ساتھ چل پڑی۔ میں نے اسے اس کے بنگلے کے باہر اتارا اور خود اسرائیلی سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر کی طرف گاڑی ڈال دی۔

اس وقت رات کے نو بج چکے تھے۔ سڑکوں پر روشنی تھی اور بلند عمارتوں میں بھی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ سی آئی اے کا ہیڈ کوارٹر شہر کے شمالی کونے پر ایک پارک کے عقب میں واقع تھا۔ اسکا آہنی جنگلے والا بڑا گیٹ بند تھا۔ گارڈ ڈیوٹی پر کھڑا تھا مگر میرے لئے وہاں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اپنا آئی ڈی کارڈ ہی کافی تھا۔ اس وقت ڈپٹی ڈائریکٹر سی آئی اے مسٹر ساول اپنے کمرے میں موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ شام کو جو شامی جاسوس پکڑا گیا ہے اس سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ اسرائیلی ڈپٹی ڈائریکٹر نے میرے لئے کافی منگوائی اور مجھے سگار پیش کرتے ہوئے کہا۔

"کتابوں کی دکان میں تمہاری موجودگی سے کم از کم ہمیں حیرانی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا

کہ تم بھی اس شامی ایجنٹ کے پیچھے لگے ہوئے ہو۔"

اس نے خود میرے بچاؤ کا جواز پیدا کر دیا تھا۔ میں نے سگار سلگانے کے بعد اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنے خاص مخبروں کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ یہ شخص جو پرانی کتابوں کی دکان کرتا ہے دشمن کا جاسوس ہے مگر ابھی تک میں کوئی ثبوت حاصل نہ کر سکا تھا۔"

ساول نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ثبوت ہمارے پاس موجود ہے۔"

یہ کہکر اس نے میز کی دراز میں سے فائل نکالی۔ اسے ایک خاص جگہ سے کھول کر میرے آگے رکھ دی۔

"یہ دیکھو ثبوت۔ دمشق میں شاید تم نے ان میں سے کچھ چہروں کو دیکھا ہوگا۔"

فائل میں بڑے سائیز کی بلیک اینڈ وائٹ ایک فوٹو گراف تھی جس میں پرانی کتابوں کی دکان والا ہمارا ایجنٹ دمشق میں شامی خفیہ ایجنسی کے چیف کے آفس میں بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ ڈپٹی چیف بھی موجود تھے۔ میں ان سب کو جانتا تھا۔ گرفتار شدہ شامی مسلمان جاسوس کو موت کی سزا سنانے کے لئے اتنا ثبوت ہی بہت تھا۔ مگر کسی جاسوس کو ویسے ہی موت کی سزا نہیں دے دی جاتی۔ خوفناک اذیتیں دے کر اس کے اندر چھپے ہوئے سارے راز اگلوانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اذیت کے ایسے ہی انتہائی تکلیف دہ لمحوں میں کسی لمحے اس کی روح پرواز کر جاتی ہے۔ میرے سامنے اب سب سے پہلا کام یہ تھا کہ ان سنگدل یہودیوں کی قید سے اپنے ایجنٹ کو کسی طریقے سے فرار کرواؤں اور اگر ہو سکے تو فائل نمبر 2 کی فلم بھی اس کو دے کر باڈر پار کرا دوں۔ میرے تئے یہ کام آسان ضرور تھا مگر خطرناک بہت تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی اس کے ساتھ مجھے بھی موت کے منہ میں لے جا سکتی تھی۔ میں نے فائل واپس کر دی۔ پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے ڈپٹی چیف سے کہا۔

"یہ بڑا ناپ کا شامی جاسوس ہے۔"

"ماسٹر سپائی ہے۔ دایاں یہ ____ "ڈپٹی چیف نے کرسی کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میں اس قسم کا تاثر دینا چاہتا تھا جیسے میرا ذہن کوئی اہم گتھی سلجھانے میں مصروف ہے۔ میں نے رک کر ڈپٹی چیف کی طرف دیکھا اور کہا۔

اس آدمی کے پاس عربوں کی ڈیفنس کے بڑے اہم راز ہوں گے۔ ہمیں اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا کہ کہیں یہ خودکشی نہ کر لے۔

ڈپٹی چیف نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"اسکا ہم نے پورا بندوبست کر لیا ہے۔ اس کے آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں رہنے دی کہ جس سے وہ اپنی جان لے سکے۔ اب وہ صرف اپنا سانس روک کر ہی خودکشی کر سکتا ہے۔"

"وہ ایسا نہیں کرے گا۔" میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈپٹی چیف نے فائل دراز میں رکھ دی میں نے سگار ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔

"میں اس شامی جاسوس سے تنہائی میں کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں اس کے ملک کے بارے میں یہاں سب لوگوں سے زیادہ تجربہ رکھتا ہوں۔"

ڈپٹی چیف کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ شامی جاسوس اس بلڈنگ کے نیچے ایک تہہ خانے میں بند تھا۔ وہ مجھے تہہ خانے میں لے آیا۔ یہاں چھت کے ساتھ ایک کمزور روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ پرانی کتابوں کی دکان والا ہمارا ایجنٹ چٹائی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس پر تشدد نہیں کیا گیا۔ ایک یہودی پولیس انسپکٹر سٹول پر اس پر جھکا ہوا بیٹھا اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ ہمیں دیکھکر انسپکٹر اٹھ کر پرے ہو گیا۔ میں اس بات کی تسلی کر لینا چاہتا تھا کہ وہاں کوئی خفیہ مائیکروفون نہیں لگا دیا گیا ہے۔ میں نے ڈپٹی چیف کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ "ہمیں یہاں خفیہ مائیکروفون ضرور لگا دینا چاہیے تا کہ اس شامی جاسوس کے تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں کرنے کی آواز بھی ریکارڈ ہو جائے۔" ڈپٹی چیف بولا۔ "اس کا ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔ میں صبح

سب سے پہلے یہی کام کروں گا۔ تم فکر نہ کرو۔" جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں تنہائی میں شامی جاسوس سے جو باتیں کروں گا وہ ہمارے سوا دوسرا کوئی نہیں سن سکے گا تو میں نے یہ کہہ کر ڈپٹی چیف اور انسپکٹر کو باہر بھجوا دیا کہ میں اکیلے میں اس شخص سے کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔ جب دونوں چلے گئے اور تہہ خانے میں صرف میں اور اپنا شامی ایجنٹ ہی رہ گیا تو میں نے سٹول پر بیٹھے ہوئے اسکی طرف جھک کر اسکا اور اپنا مشترکہ کوڈ ورڈ دہرایا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کیا اور کان میں آہستہ سے عربی زبان میں کہا۔

"بالکل خاموش رہنا۔"

☆......☆......☆

شامی جاسوس کے لئے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ میں ان کا آدمی نکلا تھا۔ میں نے ابھی تک اسکا گریبان پکڑ رکھا تھا۔ پھر زور سے اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا اور مصنوعی سخت لہجے میں ہلکی سی گالی دے کر کہا۔

"شیطان کی اولاد تم اس تہہ خانے سے زندہ بچ کر نہیں جا سکتے۔ ہاں اگر تم ہمیں شامی حکومت اور عربوں کے ڈیفنس کے وہ راز بتا دو جو ہم تم سے پوچھنا چاہتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ ہم تمہیں آزاد کر دیں گے بلکہ تمہیں اتنی دولت دے کر فرانس کے کسی شہر میں پہنچا دیں گے جہاں تم ساری زندگی عیش و آرام سے گذار سکو گے۔"

پرانی کتابوں والا شامی جاسوس عجیب خالی خالی سی نظروں سے میری طرف تکنے لگا۔

میں نے جو کوڈ ورڈ بولا تھا وہ شامی انٹیلی جنس کا خاص ترین کوڈ ورڈ تھا۔ لیکن میرا رویہ اتنا سخت تھا کہ وہ تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ میں سٹول سے اٹھ کر جیسے انتہائی غصے کی حالت میں چھوٹے سے تہہ خانے میں ٹہلنے لگا پھر لپک کر شامی جاسوس کو گریبان سے پکڑا۔ اسے جھنجھوڑ کر اپنے قریب کیا اور عربی میں آہستہ سے کہا۔

"تم خوش قسمت ہو کہ میں یہاں موجود ہوں۔ خبردار اپنے کسی ردعمل سے یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ

تمہاری معصیت کم ہو گئی ہے۔ اب تم مجھے اپنا کوڈ ورڈ بتاؤ میں نے اپنا کوڈ تمہیں بتا دیا ہے۔"

اس نے دھیمی آواز میں اپنا وہ کوڈ ورڈ دہرایا جو مجھے دمشق سے آتے ہوئے بتا دیا گیا تھا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ یہی وہ اپنا خاص ایجنٹ ہے۔ جس کے ذریعے مجھے فائل نمبر 2 کی انتہائی اہم اور خفیہ مائیکرو فلم دمشق پہنچانی تھی۔ یہ فلم اس وقت بھی میرے کوٹ کے کالر میں محفوظ پڑی تھی۔ اس خیال سے کہ کسی خفیہ جگہ سے مجھے کوئی دیکھ نہ رہا ہو میں نے زور سے شامی ایجنٹ کے منہ پر ایک تھپڑ مار دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کو گرا اور ایک ہاتھ سے گال سہلاتے ہوئے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں بلند آواز میں چلایا۔

"ہم تم سے وہ سارے راز اگلوا لیں گے۔ جن کی ہمیں ضرورت ہے۔ تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟" ساتھ ہی میں نے زیر لب کہا۔ "یہ میرے ڈرامے کا بڑا ضروری حصہ ہے میں کل تمہیں یہاں سے تمہارے فرار کی سکیم بتا دوں گا۔" پھر میں اونچی آواز میں اسے برا بھلا کہتا تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔

اپنے بنگلے میں آ کر میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ شامی ایجنٹ کو اسرائیل کی قید سے کیسے نکالا جائے اور پھر کس جانب سے شام کی سرحد پار کرائی جائے؟ میں نے شام کی سرحدوں کے ساتھ ملے ہوئے اسرائیلی باڈر کا نقشہ نکال کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ پھر خیال آیا کہ اپنے ایجنٹ کو بھی باڈر کے بارے میں بہت کچھ پتہ ہوگا۔ یہ کام اس سے مل کر ہی طے ہو سکے گا۔" اب صرف یہ مسئلہ حل کرنا تھا کہ وہ تہہ خانے سے کس طرح باہر آئے گا۔ اسکا حل بھی نکل آیا۔ وعدے کے مطابق میں تیسرے پہر ضروری پوچھ گچھ کا بہانہ بنا کر اپنے ایجنٹ کے تہہ خانے میں پہنچ گیا۔ انٹیروگیشن کے دوران اس پر ٹارچر کیا گیا تھا جس کی وجہ سے اسکی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ میں نے کرخت لہجے میں بڑی سختی کے ساتھ اس سے باتیں شروع کر دیں۔ اسی دوران اس سے پوچھا۔ کیا تم اکیلے باڈر کراس کر جاؤ گے؟" ہاں" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ میں نے اونچی آواز میں اسے گالی دی اور ساتھ ہی دھیمی آواز میں کہا۔

"میرے پاس مائیکرو فلم ہے وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانی ہوگی۔"

اس نے اپنی سوجی ہوئی آنکھ کو ہاتھ سے دباتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اسے گردن سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ اور آہستہ سے اپنی مٹھی میں دبائی ہوئی پرچی اسکے ہاتھ میں تھما دی۔ پھر اسے دھکا دے کر گرا دیا اور بڑبڑاتا ہوا باہر چل دیا۔ جو پرچی میں نے اسے دی تھی اس پر میرے بنگلے کا ایڈریس بھی تھا اور ساتھ ہی لکھا تھا کہ آج رات ساڑھے دس بجے کے بعد تہہ خانے اور اوپر سیڑھیوں والے گیٹ کے دونوں سنتری بے ہوش ہوں گے۔ یہاں سے نکل کر سیدھے میرے ایڈریس پر پہنچ جانا۔

مجھے معلوم تھا کہ گارڈ اور گیٹ کے پہرے داروں کو رات کے ساڑھے دس بجے اس خیال سے گرم کافی دی جاتی ہے کہ ڈیوٹی کے دوران انہیں نیند نہ آئے۔ میرے لئے ان کی کافی میں بے ہوشی کی دوائی ملا دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ کافی اسرائیلی خفیہ کے ڈپٹی چیف کے سائیڈ والے کمرے میں تیار ہوتی تھی۔ اس رات میں کام کا بہانہ بنا کر دفتر میں ہی پرانی فائیلوں کی ورق گردانی کرنے بیٹھ گیا۔ دس بجے تو سائیڈ روم میں گیا جہاں بجلی کے چولہے پر رکھے کافی پاٹ میں کافی گرم ہو رہی تھی۔ بے ہوشی کا بڑا زود اثر اور بے ذائقہ سفوف کیپسول کی شکل میں میری مٹھی میں تھا۔ ملازم باتھ روم میں تھا۔ میں نے کیپسول کھول کر سفوف کافی پاٹ میں گرا دیا۔ اور دبے پاؤں کمرے سے باہر آ گیا۔ دوسری جانب سے برآمدے میں نکلا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس اپنے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

مجھے اپنے منصوبے کی کامیابی کا سو فیصد یقین تھا۔ میرا ملازم میرا کھانا پکانے کے بعد مین دروازے کو لاک کر کے جا چکا تھا۔ میں نے تھوڑا سا کھانا گرم کر کے کھایا۔ پھر سوائے برآمدے کے کوٹھی کے سارے کمروں کی بتیاں گل کر دیں اپنے بیڈ روم کی کھڑکی تھوڑی سی کھول کر اپنی نظریں گیٹ پر جما دیں۔ اپنے ایجنٹ کو اسی طرف سے آنا تھا۔ خطرہ بھی تھا کہ شامی ایجنٹ سے کہیں بھول چوک نہ ہو جائے۔ پھر سارے کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ سکتا تھا۔ یہی سوچ کر دل کو تسلی

دیتا رہا کہ اپنا ایجنٹ کوئی اناڑی نہیں ہے۔ تربیت یافتہ ہے۔ اس قسم کے حالات سے خوش اسلوبی کے ساتھ گذر جانے کی اسے باقاعدہ ٹریننگ ملی ہوئی ہے۔

میرا خیال درست نکلا۔ شامی ایجنٹ میرے بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہ گیٹ میں داخل ہونے کی بجائے دیوار پھاند کر باغیچے میں آیا تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کر دی تھی۔ کہ کچن والی کھڑکی کھلی ہوگی۔ چنانچہ وہ کچن کی طرف بڑھا۔ میں بھی کچن میں آ گیا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی اور بولا۔

''میں پیدل ہی آیا ہوں۔ مجھے ان سارے رستوں کا پتہ ہے۔''

''پیچھے کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟''

میں نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔ اس نے کہا۔ ''بالکل نہیں کافی پیتے ہی گارڈ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ میں تہہ خانے سے نکل کر اوپر آیا تو سیڑھیوں کے گیٹ والا سنتری اور اس کے ساتھ دوسرا سنتری بھی بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے دوڑ کر عقبی دیوار پھلانگی اور اندھیرے میں تمہارے بنگلے کی طرف چل پڑا۔ یہ سارے علاقے میرے دیکھے بھالے ہیں۔

میں اسے اپنے بیڈ روم میں لے گیا۔ جیکٹ میں سے مائیکرو فلم والا کیپسول نکال کر اس کے حوالے کیا۔ ''یہ فائل نمبر 2 کی مائیکرو فلم ہے۔ اسے تمہیں ہر حالت میں دمشق پہنچانا ہے۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں سے کیسے فرار ہو گے؟'' اپنے ایجنٹ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے پہلے تم مجھے کچھ کھانے کو دو۔ بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔''

میں کچن کی طرف جانے لگا تو پلنگ کے پاس رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں ایک پل کے لئے وہیں ساکت ہو گیا۔ پھر لپک کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے اسرائیلی انٹیلی جنس کے ڈپٹی چیف کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

''شامی جاسوس فرار ہو گیا ہے دایان۔ تم فوراً میرے بنگلے پر پہنچو''

☆......☆......☆

اپنے ایجنٹ کی نظریں مجھ پر لگی تھیں۔ میرے چہرے کے تاثرات سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں نے اسرائیلی ڈپٹی چیف سے کہا۔

''سر! میں ابھی آ رہا ہوں۔ آپ سارے شہر کی ناکہ بندی کا حکم دے دیں۔''

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اپنے ایجنٹ نے مسکرا کر کہا۔

''وہ لوگ اب میری گرد کو بھی نہیں چھو سکتے۔ چاہے وہ سارے ملک کی ناکہ بندی کر دیں۔''

میں نے جیکٹ صوفے پر سے اٹھا کر پہنتے ہوئے کہا۔

''تم نیچے تہہ خانے میں چلے جاؤ۔ مجھے ابھی ہیڈ آفس پہنچنا ہے۔ تمہارے فرار نے وہاں کھلبلی مچا دی ہے۔''

ایجنٹ کہنے لگا۔

''یہ وقت تہہ خانے میں چھپنے کا نہیں مجھے رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکل جانا ہوگا۔''

''مگر تم اس وقت کہاں جاؤ گے؟''

میرے اس سوال پر ایجنٹ نے بڑے اطمینان کے ساتھ صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں جانتا ہوں مجھے اس وقت کہاں جانا ہوگا۔ تم صرف مجھے ایک

پستول اور کچھ گولیاں دے دو۔"

میں نے اسے الماری میں سے پستول اور گولیاں نکال کر دے دیں اسے کہا کہ وہ چھپا رہے۔

ایجنٹ بولا۔

"شیر جہاں جاتا ہے اپنی خوراک پیدا کر لیتا ہے۔ میں اب پنجرے سے باہر ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ اگر میں مر بھی گیا جب بھی یہ مائیکرو فلم دمشق پہنچ جائے گی۔"

اس نے پستول اور گولیاں اپنی قمیض کے اندر چھپالیں اور کھڑکی میں سے بنگلے کے عقبی باغ میں کودا اور اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ میں اس مسلمان حریت پسند شامی کے اعتماد اور جذبے سے بڑا متاثر ہوا۔ جس قوم کے نوجوانوں میں ایسا جذبہ اور ناقابل شکست اعتماد ہو وہ ایک نہ ایک دن اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہو جاتی ہے۔

بہرحال اب مجھے اسرائیلی انٹیلی جنس کے ڈپٹی چیف کے پاس پہنچنا تھا۔ میں نے گاڑی نکالی اور اس کے بنگلے کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں ٹیلی فون گود میں رکھے پریشانی کی حالت میں بیٹھا خدا جانے کہاں کہاں ٹیلی فون کر رہا تھا اور سخت لہجے میں ہدایات دے رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے فون ایک طرف رکھ دیا اور پریشانی کے عالم میں بولا۔

"یہ سب گارڈز نااہل ہیں۔ گدھے ہیں۔ ان کی وجہ سے میری نوکری بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔"

"مگر وہ فرار کیسے ہوا؟"

ڈپٹی چیف غضبناک لہجے میں بولا۔

کسی نے کافی میں بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی۔ سب گارڈز بے ہوش ہو گئے۔ میں نے سب کو معطل کر دیا ہے۔ مگر دایان اس شامی ایجنٹ کا پکڑا جانا بہت ضروری ہے۔ تم کچھ کرو۔ مجھے اسرائیلی پولیس پر کوئی بھروسہ نہیں ہے۔"

میں بھی یونہی پریشانی دکھانے کے واسطے بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ پھر آہستہ سے میز پر مکا مارا اور وہیں کرسی پر بیٹھ گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہوں۔ دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ کونسی ایسی ترکیب

ہو کہ اسرائیلی پولیس اور سی آئی ڈی کے کمانڈوز کو کم از کم ایک دن کے لئے غلط راستے پر ڈال دیا جائے۔ اپنے ایجنٹ کی گفتگو سے مجھے ایک اشارہ ضرور ملا تھا کہ وہ لبنان کی طرف سے اسرائیل کی سرحد پار کرے گا۔ چنانچہ میں یہودی پولیس کو لبنان کی سرحد کی طرف جانے سے روکنا چاہتا تھا۔

میں نے ڈپٹی چیف کی طرف دیکھا اور فضا میں انگلی کھڑی کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے وہ عمان کی طرف سے سرحد پار کرے گا۔ دو روز پہلے اس باڈر پر مجھے فلسطینی جاسوسوں کی سرگرمیوں کی اطلاع ملی تھی۔"

ڈپٹی چیف نے اسی وقت پولیس کمانڈوز کے چیف کو فون پر ہدایت کی کہ عمان کی سرحد پر فورس روانہ کر دی جائے۔ اسی طرح میں نے اپنی حکمت عملی سے یہودی پولیس اور نیم فوجی دستوں کو لبنان کی سرحد سے دور کر دیا تاکہ اپنا ایجنٹ نسبتاً محفوظ حالات میں باڈر کراس کر جائے۔

اس کے بعد میں اپنے بنگلے پر واپس آگیا۔ راستے میں مجھے محسوس ہوا کہ ایک گاڑی میرا پیچھا کر رہی ہے۔ یہ چھوٹی گاڑی ڈپٹی چیف کے بنگلے سے میرے نکل آنے کے بعد ہی میرے پیچھے لگ گئی تھی۔ پہلے تو میں نے یہی خیال کیا کہ کوئی شخص رات کے وقت کسی کلب سے نکل کر اپنے گھر واپس جا رہا ہوگا۔ لیکن جب میں نے مسلسل اپنے پیچھے پیچھے آتے دیکھا تو سڑک پر ایک جگہ گاڑی روک دی۔ میرا خیال تھا کہ میرے تعاقب میں آنے والی گاڑی بھی رک جائے گی۔ مگر وہ رکی نہیں۔ بلکہ ایک چھوٹی سڑک کی طرف گھوم گئی۔ میں نے دو چار منٹ وہاں کھڑے رہ کر انتظار کیا پر وہ گاڑی پھر نمودار نہ ہوئی۔ میں اپنے بنگلے کی طرف چل پڑا۔ لیکن اب بہت محتاط ہو گیا تھا۔ اسرائیلی انٹیلی جنس نے اپنے کسی آدمی کو میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ اسکا مطلب صاف تھا کہ انہیں مجھ پر کچھ نہ کچھ شک ضرور پڑ گیا ہے۔ میں کوئی تربیت یافتہ جاسوس نہیں تھا۔ اس لئے مجھ سے کوئی نہ کوئی غلطی ہو سکتی تھی جو میرے لئے زندگی کی آخری غلطی ثابت ہوتی۔ بنگلے پر آتے ہی میں نے تمام بتیاں بجھا دیں اور صرف بیڈ روم کا نیلا لیمپ جلتے رہنے دیا اور کپڑے بدل کر سب سے پہلے نیچے تہہ خانے میں گیا۔ وہاں الماری میں رکھے ہوئے وائرلیس سیٹ کا جائزہ لیا۔ پھر تہہ خانہ بند کر کے اوپر

ڈرائینگ روم میں آ گیا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ باہر باغیچے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ گیٹ بند تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک طرف میری کار گیراج میں کھڑی تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے کوئی سایہ گیراج سے نکل کر کچن کی طرف تیزی سے بھاگا ہے۔ میں نے الماری میں سے اپنا دوسرا پستول نکالا اور کچن کی طرف آ گیا۔ کچن کا دروازہ بند تھا۔ میں ایک

طرف چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو گاڑی میں میرا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ پراسرار انسانی سایہ اس طرف آ کر درختوں جھاڑیوں کے اندھیرے میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے وہ بنگلے کے پیچھے باغ میں آ گیا ہو۔ برآمدے کی طرف سے جانے کی بجائے میں بیڈروم کے غسل خانے کے پچھلے دروازے سے نکل کر باغ میں آیا تو اچانک پستول کے فائر کا دھماکہ ہوا اور گولی میرے بالکل قریب دروازے کی چوکھٹ میں گھس گئی۔ میں جلدی سے نیچے ہو گیا اور جدھر سے گولی آئی تھی اس طرف اوپر تلے چار پانچ فائر کر دیئے۔ مجھے کسی کے دوڑنے کی آواز آئی۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔ ایک سایہ دیوار پھاند کر دوسری طرف جاتا دکھائی دیا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ دیوار پر چڑھ گیا مگر دوسری طرف سوائے اندھیرے کے اور کچھ نہیں تھا۔

☆......☆......☆

اب اس میں کسی شک شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ اسرائیلی انٹیلی جنس کو مجھ پر شک پڑ گیا ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس پراسرار شخص نے مجھ پر پستول کا فائر کیا تھا۔ اگر اسرائیلی مجھے ہلاک ہی کرنا چاہتے تھے تو وہ بڑی آسانی سے دن کے وقت ایسا کر سکتے تھے۔ وہ کسی بھی وقت مجھے کسی سے مروا سکتے تھے۔ میں ان کے ملک میں تھا اور دن کا بیشتر حصہ ان کے ساتھ گذارتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کوئی چور اٹھائی گیرا تھا۔ اور مجھے لوٹنے کے لئے میرے پیچھے لگا تھا۔

اگر ایسی بات ہوتی تو اسے مجھ پر فائر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے تو باغیچے میں اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔ نہ میں اسے پکڑنے کی غرض سے اس کی طرف دوڑا تھا۔ صورت حال کچھ عجیب سی شکل اختیار کر گئی تھی۔ ان تمام واقعات پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے اب وہاں سے بوریا بستر گول کر کے نکل جانا چاہئے۔ ویسے بھی میرا جو اہم ترین مشن تھا میں اس میں کامیاب ہو چکا تھا۔ یعنی اسرائیلی ڈیفنس اور آفینس کی مائیکروفلم میں نے دمشق کی طرف روانہ کر دی تھی۔ اگر دیکھا جائے تو اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ حالات بھی غیر موافق رخ اختیار کرنے لگے تھے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہاں سے نکل چلنا چاہئے۔

مگر واپس روانہ ہونے سے پہلے میں وائرلیس پر دمشق سے رابطہ قائم کر کے یہ ضرور

معلوم کر لینا چاہتا تھا کہ کیا ان کو میری بھجوائی ہوئی خفیہ مائیکرو فلم مل گئی ہے۔ اس کے لئے مجھے مزید ایک دن انتظار کی ضرورت تھی تا کہ اپنا ایجنٹ باڈر کراس کر کے دمشق پہنچ جائے۔

دوسرے دن میں اپنے دفتر آ گیا۔ ضروری کاغذات دیکھے۔ میں نے کسی کو نہ بتایا کہ رات میرے بنگلے پر آ کر کسی نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اچانک میری منگیتر کا ٹیلی فون آ گیا۔ کہنے لگی۔

''دایان! آج موسم بڑا خوبصورت ہے۔ چھوڑو دفتر کے کام کو۔ میں پالز کیفے میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ کچھ دیر بیٹھ کر کافی پئیں گے۔ باتیں کریں گے۔ پھر دفتر واپس چلے جانا۔''

میں اسے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس واسطے کہ کہیں میری بے اعتنائی اسے بھی کسی شک شبے میں نہ ڈال دے اور میں فرار ہونے سے پہلے ہی پکڑ لیا جاؤں۔ میں نے کہا۔

''میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔''

پالز کیفے ایک بڑے پر فضا مقام پر تھا۔ نادیا موسم بہار کا لباس پہنے باغ میں پام کے درختوں کے نیچے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کافی کا آڈر دیا اور موسم کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ پھر اچانک میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ اور چار سیکنڈ تک مجھے گھورتی رہی۔ پھر بولی۔

''دایان! کیا بات ہے تمہارے بارے میں ڈیپارٹمنٹ میں خفیہ انکوائری کیوں شروع ہو گئی ہے؟''

میں چونک سا گیا۔ مگر چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہ آنے دیا۔ یونہی بے نیازی سے سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''ایسی انکوائری محکمے کے ہر افسر کی ہر سال ہوا کرتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔''

میں نے یونہی کہہ دیا۔ نادیا نے ذرا قریب ہو کر کہا۔

''مجھے چیف کی طرف سے خاص طور پر ہدایات پہنچائی گئی ہیں کہ میں تمہاری نقل و حرکت پر اپنی نظر رکھوں اور پھر انہیں رپورٹ دوں یہ بات مجھے بتانی نہیں چاہئے تھی مگر تمہاری محبت سے مجبور ہو کر تمہیں کہہ دی آخر یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟''

یہ سن کر مجھے پکا یقین ہو گیا کہ میں اسرائیلی انٹیلی جنس کی نظروں میں آ گیا ہوں اور کسی نہ کسی وجہ سے انہیں مجھ پر شک پڑ چکا ہے۔ اب میری خیریت اسی میں تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے بھاگ نکلوں۔ میں نے نادیا کی یہ کہہ کر تسلی کر دی کہ یہ ایک معمول کی کاروائی ہوتی ہے اور ہر خفیہ افسر کی اسی طرح خفیہ انکوائری کی جاتی ہے۔ خاص طور پر ایسے لوگوں کی جو دشمن کے ملک میں قید کاٹ چکے ہوں۔ نادیا چپ ہو گئی۔ مگر لگتا تھا کہ اسے میری بات کا یقین نہیں آیا۔ اب مجھے اسے یقین دلانے کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ میں وہاں سے فرار کا پروگرام دل میں پکا کر چکا تھا۔ مجھے صرف رات ہونے کا انتظار تھا۔

باقی کا سارا دن میں نے اپنے دفتر میں ہی گذار دیا۔ شام کو بنگلے پر آ گیا۔ رات کے کھانے پر ڈپٹی چیف مجھ سے ملاقات کرنے آ گیا۔ وہ مجھ سے مفرور شامی ایجنٹ کی تلاش کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کی نظریں بھی کچھ کچھ بدلی ہوئی تھیں۔ میں اس بات پر بڑا حیران تھا کہ اگر انہیں مجھ پر شک پڑ گیا ہے تو مجھے گرفتار کیوں نہیں کرتے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جس یہودی جاسوس یعنی دایان کا میں نے بھیس بھرا ہوا تھا اسے اسرائیلی وزیر دفاع کی خاص مراعات حاصل تھیں اور وہ اس کے رشتے داروں میں سے تھا۔ اسی لئے بغیر کسی ثبوت کے مجھ پر کوئی بھی ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

اور ثبوت انہیں اسی رات مل گیا۔

ایسا ہوا کہ رات کو وہاں سے فرار ہونے سے پہلے میں نے سوچا کہ وائرلیس سیٹ میرے پاس ہے اور دمشق سیکرٹ سروس کا کوڈ بھی مجھے معلوم ہے تو کیوں نہ جانے سے پہلے ان سے بات کر کے فائل نمبر 2 کی مائیکرو فلم کے بارے میں پوچھ لوں؟ اس طرح مجھے اطمینان حاصل

ہو جائے گا۔ کہ ہمارا شامی ایجنٹ بھی خیریت سے دمشق پہنچ گیا ہے اور خفیہ فلم بھی دمشق والوں کو مل گئی ہے۔

میں نے وہاں سے فرار ہونے کا پورا پروگرام بنالیا ہوا تھا۔ اس مقصد کے واسطے میں نے اپنی گاڑی گیراج سے نکال کر بنگلے کی پچھلی دیوار کے ساتھ کھڑی کر رکھی تھی۔ ضرورت کی کرنسی، ریوالور، گولیاں اور پانی سے بھری ہوئی پلاسٹک کی بوتل بھی ساتھ رکھ لی تھی۔ جب رات کے ٹھیک بارہ بجے تو میں نے سیاہ رنگ کی جیکٹ پہنی۔ کمر کے ساتھ ریوالور اور پانی کی بوتل والی بیلٹ باندھی اور تہہ خانے میں اتر گیا تاکہ دمشق والوں سے وائرلیس پر بات کر سکوں۔ میں نے وائرلیس سیٹ کھول کر خاص فریکوئنسی ملائی اور کوڈ لفظ دہرانے لگا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میرے بنگلے کے آس پاس ایک فرلانگ کے گھیرے میں اسرائیلی پولیس کی دو مائیکرو ویگنیں کھڑی ہیں جس کے اندر بیٹھے پولیس افسر اپنے اپنے سیٹوں پر میرے وائرلیس سگنل سن رہے ہیں۔ اور ان کے لئے یہ معلوم کرنا کہ یہ سگنل میرے بنگلے سے آ رہے ہیں کوئی مشکل بات نہیں تھی۔

☆......☆......☆